[illegible]

تصوف کا پہلا درس

ذکر الٰہی سے

تسکین احساس

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
محبوب الٰہی رضہ کے چھ سو چودھویں سالانہ عرس کے موقع
پر حاضرین عرس کے مجمع عام کو سنانے کیلیے

خواجہ حسن نظامی نے

۱۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۰ عیسوی میں قلمبند کیا

اور

کارکن خواجہ ڈپو دہلی نے

پہلی بار (مسیرزا محبوب بیگ کے محبوب المطابع دہلی میں چھپوا کر شائع کیا) قیمت ۸ر

ذکرِ الٰہی سے تسکینِ احساس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اللہ تو اس جہان کے کسی زمانہ میں اتنا کھلم کھلا اپنے بندوں کے سامنے نہیں آیا جتنا آج کل ہر شے میں ہر آنکھ کو نظر آنا چاہتا ہے۔ میں تیری حمد اور تیری تعریف کس کس موقع پر کروں۔ جدھر نظر اٹھاتا ہوں تجھ ہی کو پاتا ہوں ؛

جب تو نے قرآن نازل فرمایا تھا تو شروع کی بسم اللہ ہی میں تجھ کو اس قدر پردہ داری منظور تھی کہ اپنی ذات کی نشانی حرف الف کو حرف بے اور حرف سین کے درمیان بالکل چھپا دیا تھا۔ پڑھنے والے مجبور تھے کہ باسم اللہ نہ پڑھیں بلکہ الف کو مخفی رکھ کر صرف بسم اللہ ہی زبان سے ادا ہو ؛

میرے وجد کے سجدے کو میرے جسم کے تمام اعضا نے دیکھا تھا جبکہ میں اگست ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جرمن کے قیصر ولیم کی نسبت غور کرتا رہا کہ وہ کیا چیز ہے۔ یکایک میں نے تجھ کو تبسم کناں اپنے اسمائے صفاتی کے حجاب میں وہاں دیکھا۔ ایک طرف اسم قہار و جبار کی چادر تھی۔ دوسری طرف اسم انتقام و انقلاب کی نقاب تھی بیچ میں بیچارہ خاک کا پتلا

خماری شاہ کو ہدیہ

برادرِ طریقت مہاراجہ سر کشن پرشاد
چشتی نظامی خماری شاہ سابق
وزیر اعظم حیدر آباد دکن کو تصوّف
کے پہلے درس کی یہ چھوٹی سی
کتاب ہدیہ دی جاتی ہے۔ اور
اجازت تلقین بھی۔ محرمِ راز خماری

حسن نظامی
۱۷ ربیع الثانی
۱۳۳۹ھ

کی گرانی سے دم توڑنا شروع کیا اور زندگی آدمی کو وبال معلوم ہونے لگی تو میرے حواس رزق طلب نے یا رزاق یا فتاح کی صدائیں لگانی شروع کیں۔ مگر میری پکار نے تیری عطا کے کسی دروازہ کو کھلتا ہوا نہ دیکھا اور مجھ پر یاس نے ایک ہراس طاری کر دی۔ یکایک قرآن کی زبان میں تیری آواز مجھکو سنائی دی کہ ہم بھوک اور نقصان جان و مال سے اپنے بندوں کو آزمایا کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آخر آزمائش کی کوئی حد بھی ہونی چاہئے۔ تو نے کسی سے کہوایا۔ ہاں یہی حد ہے کہ تجکو اس کا حس دیا۔ جب بندے اس حس کے ذریعے خدا کے اقتدار رزاقی کو پہچان جائیں گے تو ان کو بھوک پیاس اور ضروریات معیشت کی بے قراری سے آزاد کر کے تسکین احساس کی نعمت دیدی جائے گی یہ سنتے ہی میں نے اللہ ربنا اللہ ربنا وھو حسبنا اللہ کا نعرہ لگایا جس کو سن کر دل بولا یہی ہے سچی و اصلی حمد و ثنا۔

ہندوستان میں حاکم و محکوم ایک دوسرے پر بگڑتے تھے نفرتوں پر غیظ و غضب کے ہتھیار برستے تھے۔ ڈائر واوڈوائر کی مورتیں پنجاب کے چہرے پر رقص کرتی تھیں گاندھی اس رقص بے جا پر ملامت کرتے تھے گھر گھر اضطراب حواس کی قیامت آئی تھی۔ میں نے دل کا دروازہ کھول کر جور و جبر کے مناظر دیکھے اور صبر و ضبطی کی آہ و زاری سنی تو بیتاب ہو گیا اور کہا کہ الٰہی یہ آفت کہاں سے آگئی اور کیونکر جائے گی۔ مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا سوائے اسکے کہ فرش سے عرش تک اضطراب و انقلاب کی ایک تیز و تاریک آندھی نظر آتی رہی میرا سانس رکنے لگا اور زیست سے بیزار ہو کر میں نے پھر ایک بار یا اللہ کہا اس وقت ایک شعاع حس انجام بینی میں پیدا ہوئی اور اس کے نور میں میں نے دیکھا کہ وہی جناب عالی اپنی صفات کے گوناگوں جلووں کو بندوں پر برسا رہے ہیں اور برسا رہے ہیں یہ جبری یا کا زینہ ہے دیکھے جس کا جی چاہے۔ اتنا سنتے ہی میں نے ماتھا زمین پر رکھ دیا اور رحم یا اللہ فضل یا اللہ کہنے لگا۔ کہتے کہتے میں نے ایک تسکین اپنے حس اضطراب میں محسوس کی اور میں سمجھا کہ میری حمد و ثنا قبول ہوئی اور یہی علاج اس اضطراب عالمگیر کی تسکین کا ہے

رسوائی کا خود ساختہ کھلونا قیصر ولیم بیٹھا تھا جب میں نے تجھ کو اچھی طرح پہچان لیا تو میرے اعضا بے اختیارانہ حالت میں رقص کرتے ہوئے تیرے سامنے سجدے میں گر پڑے اور یہ تیرے عرفان کی فہمیدہ حمد و ثنا تھی۔

میں سفید و سیاہ و سرخ و زرد اقوام کی باہمی جنگ و نبرد اور عداوت و کینہ توزی کو گلا گھونٹنے والی تکلیف سے دیکھ رہا تھا کہ ایکا ایکی تیری انگشت متحرک صفت جلال کی شعاعیں چمکاتی ان کے اندر مجھ کو دکھائی دی اور میں پیلا اور اک خوف و بیم سے حواس باختہ ہو کر تیری پناہ مانگتے تیرے آگے سر بسجود گر پڑا۔ اور میں نے سمجھا کہ آج کل مجھ کو اسی قسم کی حمد و ثنا عطا ہوگئی ہے۔

مجھے لائڈ جارج کی خود سری انتہائی نظر آئی۔ میں نے لینن کے خیالات انقلاب کو گھبرا گھبرا کر سوچا۔ مجھ کو مسلمانوں کے زوال اور ترکوں کے خاتمہ کا اندیشہ ستانے لگا تو پھر تیری ایک جھلک جلووں کی بجلیاں تڑپاتی نگاہ کے اندر آتی معلوم ہوئی اور میں نے بغیر کسی وہم و تامل کے تجھ کو شناخت کر لیا اور یہ وہی وقت تھا جبکہ میری بصیرت کے ہاتھ تیرے عرفان کے قدموں کو پکڑے ہوئے تھے اور میری بندگی کے ہونٹ بے تابانہ ان کو چوم چوم کر مست ہو رہے تھے اور یہی عہد حمد و ثنا تھا۔

میں جنگ یورپ کے زخمیوں کی چیخ و پکار میں تیری جباری کو پہچانتا تھا۔ میں لڑائی کے کشتوں میں تیرے اسم فنا کن کا جلوہ پاتا تھا۔ میں ہتھیاروں کی ہر ضرب اور ضروب کی ہر چوٹ کو گنتا تھا۔ اور ان کے احساس اذیت کو اپنے اوپر طاری کرتا تھا۔ مگر آخر میں ہیبت و حجاب کا سرا سرکا کر اور مجھ کو اپنا تھوڑا سا جلوہ دکھا کر احساس کی اذیت کو نابود کر دیتا تھا اور میں اپنے اندر تسکین احساس کی کیفیت محسوس کر کے هٰذا من ربّی هٰذا اکبر کا نعرہ لگا کر جھوم جھوم اٹھا۔

لڑائی کے ایام میں اور اس کے بعد نوع انسان نے بھوک اور ضروریات زندگی

پیا اور حضرت زکریا کی دعا یاد آئی۔ کہ قرآن میں جہاں ان کی دعا مذکور ہوتی ہے اس کے سرے پر
پانچ حروف لکھے گئے ہیں ک۔ ھ۔ ی۔ ع۔ ص میرا سراں حروف کی جانب بھی مراقب
ہوا تو زبان القا نے یہ مکاشفہ طاری کیا کہ اگر تو اضطراب احوال میں تسکین حواس چاہتا ہے
تو ذکریا نبی کی طرح دعا مانگ مگر اس طرح کہ ذات اللہ کو کافی اور کارساز کل یقین کر کہ ک
میں اسی کا اشارہ ہے اور اپنے سب ارادوں کا اسی کو ہادی جان کہ حرف ھ بھی ظاہر
کرنے کو نمودار ہے یقین کو علم و عقل کی طاقت سے بڑھا اور کافی و ہادی تک جا کہ ی اور
ع اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور مظہر صدق و صفا محمد مصطفےٰؐ کو ہر وقت نظر تعلق کے
سامنے رکھ کہ وہ وجود آخری ظہور ذات کا اس کائنات میں ہے اور اسی کے تعلق سے تمام
مقاصد جسمانی و معنوی مکمل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ص کو آخر میں لگایا گیا۔ زکریا نبی بھی
ص کے صدقہ میں کامیاب ہوئے تھے۔

صاد کا یہ بیان سنکر قرآن کی سورۃ ص یاد آگئی اور میں نے اس کو محمدی صورت
کا پورا سراپا پایا اور زبان سے سلام و صلوٰۃ کا نعرہ لگایا۔ میری یہ نعت مقبول ہوئی اور مجھ
ق والقرآن المجید تک پہنچا دیا اس وقت قاف کر اندر میں نے قلب محمدی کو دیکھا جو عرش الٰہی
تھا اور کل کائنات اس میں محیط تھی وہاں میں نے حمعسق کا راز پوچھا جواب ملا ان حروف
میں اشارہ ہے حق ظاہر ہوا محمدؐ کے علم کی سلامت قلبی سے بس حق وجود محمدی ہے
ظاہراً و باطناً اور علم ان کے قلب کی سلامتی ہے ہر نقص اور آفت سے یعنی وہ علم تمام نقائص
سے پاک کامل اور اکمل ہے۔

حروف مقطعات کے ان اسرار و رموز کو مشاہدہ کرنے کے بعد کمال یکسوئی
اور طمانیت خاطر مجھ کو نصیب ہوئی اور میں نے ذوق خالص سے یہ درود پڑھا اللھم
صل علی محمد و بارک وسلم علیہ جس وقت یہ درود میری زبان سے نکلا جسم و روح کہ
تمام مضطرب حواس ساکن اور مطمئن ہو گئے اور میں نے سمجھا کہ نعت محمدی کا حق پورا ہوا اور

کا تھا۔

تسکین احساس کی نعمت عظمیٰ حاصل کرنے کے بعد پھر ایک قسم کا اضطراب قلب کی سطح باطن میں نمودار ہوا اس میں محبت کا ذوق لبالب بھرا ہوا تھا اس سے میں نے سمجھا کہ وہ اضطراب تسکین طلب نہیں ہے بلکہ ترقی حیات ظاہر و باطن کے لئے ایک فطرتی جذبۂ بیقراری ہے اور اس کا بھڑکنا موجب صد تسلی و اطمینان ہے۔

قرآن کی ہیکل لفظی کے دروازہ پر الف لام میم تین حرف جلی قلم سے لکھے نظر آتے ان حروف کا مطلب پوچھا تو کسی نے نہ بتایا اور کہا یہ حروف مقطعات ہیں ان کے معانی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ قرآن میں اور بھی بہت سے حروف اسی قسم کے ہیں۔

عشق کے تلاطم قلبی نے حروف کو مخاطب کر کے اس بیان کی تصدیق چاہی تو وہ مسکرائے اور بولے۔ یہ ہیکل الٰہی کلام کی ہے یہاں بے معنی و بے حقیقت کوئی چیز نہیں ہے سن! میں الف اس ذات کا اشارہ ہوں جو اوّل الوجود ہے اور جس کے سہارے یہ سب ہست و بود ہے۔ لام بولا میں عقل اوّل ہوں میرا مذہبی نام جبرئیل ہے۔ میم خاموش رہا مگر لام نے اس کی نیابت کی اور کہا اس حرف میں ذات محمدی کا اشارہ ہے کہ وہ آخر الوجود ہے اور ذات اوّل الوجود کے ظہور کی نشانی ہے اس کے وجود کی نمود سے اپنے اظہار کے دعوے کو مکمل کرتی ہے میں اس اوّل اور آخر کے وسط میں ایک حجاب ادب ہوں برزخ ناز و ادا ہوں۔

میں نے محمد کا نام سنا تو دل میں شوق نعت کی آگ بھڑک اٹھی اور سورۂ اعراف کے المص کو زبان حال سے پڑھنے لگا اور کہا میں محمد کی نعت کیونکر ادا کروں حروف بولے الف سے اللہ کا یقین کر باعتبار ذات احدیت کے اور لام سے ذات احدیت کو پہچان صفت تکلم کے ساتھ اور میم کو ذات محمدی کی معنویت اور حقیقت جان اور صاد کو اس محمدی حقیقت کی صورت اتم جسم ظاہر مان۔

حروف کہا یہ دوسرا درس سنکر مجھ کو پھر عالم مادیات کی تکلیف اور بیقراری نے مضطرب

ایام ہم کو غرقاب کئے ڈالتا ہے۔ ہمارے پاس عزت نہیں رہی دولت نہیں رہی اور جو
ردی بھی ہاتھوں سے نکلی جاتی ہے۔ ہم کو لاوارث سمجھ کر اغیار نے کھا [illegible]
آج کی اس نعمت کو قبول فرمایا۔ جمال جہان آرا دکھایا۔ حسن اللہ [illegible] دم
آیا۔ بے شک ایمان ہے کہ آپ ہر آن ہی کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ ہم آپ کے ساتھ [illegible]
بے کس کے مونس ہیں اگر وہ آپ کی مونسی معیت کو بھول نہ جاتے۔

آپ نے امت کے احساس مضطرب کے تاروں کو بھی مضراب تسکین سے نوازتے تو کیا
اپنے نغمۂ قدیم کو سنکر موجودہ وقت کے افسردہ کن بے وقتی راگ کو بھول جاتے۔ اور محمدنا ہو
سیدنا۔ ہو سیدنا۔ کا گیت مستانہ وار جھوم جھوم کر گا اور کچھ پیام تمام کرتا کہ
جس سے اس کے غم و آلام دور ہوں اور اس کے ادراک و احساس میں جمعیت تامہ اور تسکین کاملہ
نازل ہو۔ آمین۔

اضطراب کی قیامت

آج ہجرت کی چودھویں صدی کا انتالیسواں سال ہے اور عیسویت کی بیسویں صدی
کا بیسواں سال گزر رہا ہے اور جس طرف نظر اٹھاؤ اضطراب و بے چینی کے سوا امن و اطمینان
کی صورت کہیں نظر نہیں آتی۔ درحقیقت ان دنوں دنیا میں اضطراب کی قیامت آئی ہوئی ہے
جس میں ہر اقلیم ہر ملک ہر صوبہ ہر شہر ہر بستی اور ہر آدمی بلکہ ہر موجود مبتلا اور آلودہ ہے۔

یہ دنیا اگرچہ کبھی اضطراب سے خالی نہیں رہی اور ہر زمانہ میں طرح طرح کے اضطراب
قوموں اور انسانوں میں پائے جاتے تھے مگر آج کل کے زمانہ میں ساری دنیا پر ایک
ہی قسم کا اضطراب مسلط ہے۔ ہر قوم حاکم ہو یا محکوم اور ہر انسان ادنیٰ ہو یا اعلیٰ
ایک خاص قسم کے اضطراب میں اسیر اور مقید نظر آتا ہے اور باوجود ہاتھ پاؤں مارنے
اور بے انتہا کوشش کرنے کے اس اضطراب کے جال سے کسی کو چھٹکارا نہیں ملتا۔

تسکین احساس کا اجر مجھ کو مل گیا اور وہ یہی تھا کہ میرے جسم کے تار ہائے عصبی حقیقت محمدیہ کے مضراب دیدار سے بجنے لگے۔ اور میں نے اپنے اندر ہاہوت کی ہر ہیئت دیکھی اور لاہوت و جبروت و ملکوت و ناسوت کے تمام نغمے صوت سرمدی میں سنے اور میری وہ قوت متفکرہ جو ایشیا و افریقہ عرب و عجم کے انقلابات غم افزا پر شب و روز ماتم کیا کرتی تھی اور جس کے نوحہ بکانے میرے وجود کی تمام کیفیات راحت طلب کو بے کل کر رکھا تھا ان نغمہ ہائے روح افزا سے یکسو و مطمئن ہو گئیں اور میں نے صاف صاف زبان ناسوتی میں اپنے ذہن کی یہ مستانہ باتیں سنیں ٭

محمد بگویم و مستی کنم۔ دیکھو دیکھو اعصاب امت میں برق محمدی کی جولانی دیکھو۔ امت تو کہتی تھی سرکار ہم کو بھول گئے باپ نے بیٹی کو اکیلا چھوڑ دیا۔ مگر یہاں تو وہ ہر اگ میں اور خون کے ہر قطرے میں اور پٹھے کے ہر تار میں اور ہڈی کے ہر جوف میں امتی امتی کے صدا لگا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں:۔

بچے نہ گھبرائیں ہم ان کے پاس موجود ہیں ہاں ہاں آپ تو آج مجھکو بھی نظر آتے ہیں مجھے اپنا طواف کرنے دیجیے میں آپ پر قربان ہونا چاہتا ہوں۔ آپ کی کملی چادر کا دامن اپنے سر پر لپیٹنا چاہتا ہوں۔ اپنی فریادوں کو آئینہ ذات احدیت کے آئینہ صفاتی آپ کے قدموں میں ڈالنا چاہتا ہوں ٭

ایک فریاد تاج و تخت کے برباد ہونے کی ہے۔ ایک ناشاد و نامراد بن جانے کی ہے ایک اس کی ہے کہ برکات توحید پرستی ہم سے چھن رہی ہیں قوائے ایمانیہ ہم سے سلب ہوتے جاتے ہیں۔ رہبروں اور پیشواؤں سے آپکی تجلی معنویت اور کیفیت نابود ہوتی جاتی ہے۔ ایک یہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشہ پر اقوام غیر میں ہم ذلیل و رسوا اور بدنام ہو رہے ہیں عمامہ والے محمد۔ گیسو لٹکانے والے محمد۔ چشم مخمور کے دست نگاہ سے جام سرشار پلانے والے محمد۔ زیر لب شکرانے والے محمد۔ اپنے شگفتہ گو سخن دلنواز سے سنبھالنے والے محمد۔ بے سہاروں کا سہارا لیجیے۔ دیکھئے ہم ڈوبے جاتے ہیں طوفان حوادث

معراج المومنین خطاب رکھتی تھی معراج تفکرات دنیا ہو گئی ہے کہ جب وہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو تمام امورات دنیا کے تصفیہ و فیصلہ کو نظر تخیل کے سامنے لے آتے ہیں اور اس کو بھول جاتے ہیں کہ ہم ایک بڑے شہنشاہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور دربار کے آداب و وقار کے خلاف ہم سے یہ حرکتیں ہو رہی ہیں۔

ان سے اگر کہو کہ حدیث صحیح ہے لا صلوٰۃ الا بحضور القلب (نماز نہیں ہوتی مگر حضور قلب سے) تو وہ کہتے ہیں کیا کریں دل حاضر نہیں ہوتا۔ اس پر افکار دنیا اور تعلقات دنیا داری کا اس قدر ہجوم ہے کہ باوجود خیالات کو جمانے اور یکسو کرنے کے وہ یکسو نہیں ہوتے اور جب نماز شروع کرتے ہیں اس وقت خبر نہیں کہاں کہاں کے جھگڑے تصفیہ میں اُمنڈ کر چلے آتے ہیں۔

پس جب تک ذکر الٰہی خاص ذکر و فکر کی شان سے نہ ہو قرآن شریف کے اعلان کا اثر کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ خدا کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے مگر جب فرض نماز کی ادائیگی جو ذکر خدا کا ایک مقررہ طریقہ ہے ذکر و فکر کی اصلی شان سے نہ ہو تو اطمینان قلب کیونکر میسر آئے۔

درویشی کا منتہا تسکین احساس تھا

خطرات قلب کا مذکورہ متوج کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں انسانوں کے دل ایسے ہی ہوتے آئے ہیں اور ان کو ذکر الٰہی کے صحیح راستہ پر لگانے اور اطمینان کی اصلی شان ان میں پیدا کرنے ہی کے لئے تصوف اور درویشی کا مشرب عالم وجود میں آیا ہے جس کا منتہائے مقصود تسلی قلوب و تسکین احساس تھا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر الٰہی کے یہ طریقے نہیں بتائے نہ قرآن میں ان کا کہیں ذکر ہے جو درویشوں نے ایجاد کئے ہیں۔

انسانوں ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اضطراب کی اس قیامت نے عناصر کو بھی متاثر کیا ہے آگ پانی۔ ہوا۔ بجلی بھی قیامت اضطراب میں مبتلا ہیں۔ بجلی سے گاڑیاں کھنچوائی جاتی ہیں پنکھے جھلوائے جاتے ہیں۔ کارخانے چلوائے جاتے ہیں۔ اندھیرے سے مقابلہ کرنیکو بدنصیب رات بھر اسیر مزاحمت رہتی ہے۔ پانی کا بھی یہی حال ہے۔ دن رات آگ میں جلتا ہے بھاپ بن کر ریلوں اور جہازوں کو کھینچتا ہے جہاز اس کے سر پر آرے چلاتی ہوتے دوڑتے ہیں۔ آگ سے بھی اسی قسم کی خدمات لی جاتی ہیں۔ ہوا کے سکون کو بھی ہوائی جہاز پراگندہ اور مضطرب کرتے ہیں۔ غرض ایک اندوہناک اضطراب جدھر دیکھو اوپر نیچے دائیں بائیں پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور ہر وجود کو اس اضطراب سے تسکین ورہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے +

احساس ایک عام فہم چیز ہے۔ ناسمجھ بچہ ماں باپ کو دیکھ کر جب شگفتہ ہوتا ہے تو احساس کے ذریعہ بھوک سے روتا ہے تو احساس کے طفیل جوان عشق بازی کرتا ہے نیک و بد کو سمجھتا ہے رنج وراحت سے متاثر ہوتا ہے۔ صرف احساس کی وجہ سے جب اس احساس یا حس کے اوپر کوئی ایسی مضطرب کنندہ کیفیت طاری ہوتی ہے جو احساس کو کسی وقت چین نہ لینے دے تو انسان کے جسم و روح کو اس تکلیف احساس کے سبب کسی آن چین نہیں آتا اور وہ دونوں مل کر تسکین احساس کی تلاش کرنے لگتے ہیں +

قرآن شریف میں اس تسکین احساس کا ایک عام فہم نسخہ خدا تعالیٰ نے علی الاعلان شائع فرمایا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ آگاہ ہو جاؤ خدا کے ذکر کرنے سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس نسخہ کو خدا کے یقینی اور سچے کلام میں پڑھنے کے بعد ہر شخص سوال کرسکتا ہے کہ مسلمان تو خدا کا ذکر کرتے رہتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اضطراب قلوب اور بےچینی حواس میں مبتلا ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ذکر الٰہی کا حق اب مسلمانوں کے حافظہ سے اتر گیا ہے وہ خدا کا یاد کرنا بھول گئے ہیں۔ ان کی نماز جو

اسلام نے مٹا دیا اور دین کی ایک اصلاح شدہ صورت مسلمانوں کو دیدی ۔

پس اگر ذکر الٰہی کے بعض طریقے غیر مسلم اقوام سے لئے گئے ہوں یا غیر مسلم اقوام سے مشابہ ہوں اور ان میں کوئی بات شریعت اسلامیہ کے خلاف نہ ہو یا ان میں توحید کا شرک کی مخالفت نہ پائی جاتی ہو یا اسلامی اخلاق کی برگشتی ان میں موجود نہ ہو تو ان کو اپنے اندر لے لینے میں کچھ حرج نہیں ہے اور شریعت نے اس کے خلاف کوئی حکم ممانعت کا نہیں دیا ۔

اب پھر اوپر کے سوال پر بحث کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر درویشوں کے طریقوں پر ذکر الٰہی کرنے سے قلوب کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور احساس کو اصلی تسکین مل جاتی ہے تو پھر کیا سبب ہے کہ باوجود اس کے کہ آج کل درویش حشرات الارض کی طرح جگہ جگہ پھیل گئے ہیں اور کوئی آبادی ان کے وجود سے خالی نہیں ہے مگر مسلمانوں کے اضطراب عام میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی بلکہ دن بدن زیادتی ہو رہی ہے۔ لہٰذا یا تو خدا کا وعدہ قابل شک ہے کہ ذکر الٰہی سے دلوں کو اطمینان میسر آتا ہے یا یہ سب درویش جھوٹے بناوٹی اور پیٹ کے کتے ہیں ۔

یہ الجھا ہوا مسئلہ معمولی سی تشریح سے سلجھ سکتا ہے اور ذرا سی غور میں اس مشکل کا حل ہو جاتا ہے کہ قرآن کا وعدہ سچا ہے اور درویش بھی سب کے سب جھوٹے اور بناوٹی نہیں ہیں۔ خرابی طریقہ طلب نے پیدا کی ہے یعنی اطمینان قلب اور تسکین احساس کی طلب صحیح طریقہ سے نہیں کی جاتی۔ بلکہ ایسے طریقوں سے تسکین احساس اور طمانیت قلب کی تلاش کی جاتی ہے جو بجائے مطمئن کرنے کے اور پراگندہ خاطر بنا دیتے ہیں ۔

مثلاً ایک شخص بے اولاد ہے اور خواہش اولاد میں اس کا دل ہر وقت بے قرار رہتا ہے اور اس کے احساس کو کسی صورت تسکین نہیں ملتی تو وہ ایک درویش کے پاس جاتا ہے اور صرف اولاد چاہتا ہے اس کے دل میں خدا کی یاد سے اپنا کی یا

ان کو جواب دینا چاہیے کہ قرآن نے تو اصولی احکام دیتے ہیں فروعات کی تفصیل زمانہ کی بھی اس میں نہیں ہے جو اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے اور حدیثوں میں ان طریقوں کے ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ احادیث کے وقت ذات محمدیہ کی تجلیات ہر قلب مومن پر جلوہ فگن تھیں اور کسی وجود کو ان طریقوں سے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی اس واسطے ان احادیث میں جو تدوین شریعت کے لئے کتابوں میں جمع کی گئیں ان کا تفصیلی ذکر نہیں کیا گیا بلکہ یہ علم سینہ بسینہ کی تعلیم میں بذریعہ سیدنا حضرت علیؓ امت کے حوالے ہوا اور اس کو درس تحریری کی صورت اس وقت تک نہ دی گئی جب تک کہ قلوب میں تحریر و اظہار کے بغیر ذکر الٰہی کا اثر اصلی برقرار رہا۔ اور جب اس اثر میں کمی آنے لگی تو مریدان سیدنا علیؓ نے اس تعلیم و تلقین کو کتابوں میں لکھنا اور خانقاہوں میں بطور درس عام جاری کرنا ضروری سمجھا۔

درویشوں نے ذکر الٰہی کے طریقے انسان کی جسمانی حالت کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد قائم کئے تھے تاکہ حواس طبعی و دماغی کو ایک قرینۂ خاص سے ترتیب دیکر ان میں ذکر الٰہی سے اثر فیض حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

اقوام غیر مسلم سے اخذ درویشی :- یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ صوفیوں کے بعض اشغال و اذکار غیر مسلم اقوام سے لئے گئے ہیں یا ان کے اشغال کے طریقوں سے مشابہ ہیں۔ اس واسطے جائز نہیں ہیں۔ لیکن اس میں معترضین کی بڑی غلطی ہے ان کو اپنے مذہب اسلام کی حقیقت سے بھی زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کوئی نوایجاد مذہب نہیں ہے بلکہ مذاہب قدیم کی اصلاح یافتہ ایک صورت ہے اور قرآن نے خود صفائی سے اس کا اقرار کیا ہے کہ یہ دین ادیان سابقہ کا پاک شدہ خلاصہ ہے۔ جو دین ابراہیمؑ کا تھا۔ موسےٰؑ کا تھا۔ عیسیٰؑ کا تھا۔ وہی دین یہ اسلام ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ادیان گذشتہ میں جو حاشیے اور تحریفات خود غرض لوگوں کی طرف سے ہو گئی تھیں ان کو

میں بھی دردسری درکار ہے جب تم پر کر سکتے ہو تو ذکر خدا کیوں نہیں کرتے وہ تو اتنا ذرا سا
بھی نہیں ہے۔ اس سے تم کو سب کچھ حاصل ہو جائیگا تو وہ جواب دیتا ہے کہ جناب ذکر خدا
بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ میرا سیاہ دل اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔ مجھ کو تو صرف عمل یا نسخہ دیکا
ہے مگر آپ بخل کرتے ہیں تو خیر میں جاتا ہوں کسی اور دروازہ کو کھٹکھٹاؤنگا +

یا مثلاً ایک شخص روزگار کا طالب ہے یا تجارت کی ترقی چاہتا ہے۔ یا بیماری سے
تندرست ہونے کا خواستگار ہے یا مقدمہ کی فتح یابی درکار ہے یا دشمن سے محفوظ رہنے
کی غرض رکھتا ہے یا اعزاز کی ترقی و برتری چاہتا ہے۔ یا محبوب تک رسائی حاصل کرنے کی تمنا
اس کو ہے۔ تو وہ اپنے ایک ہی مقصد کو درویش کے سامنے پیش کر کے اس کی ہمت باطنی اور
قوت روحانی کی مدد مانگتا ہے۔ اس کو خدا کی محبت مطلق نہیں ہوتی وہ ذکر خدا کی طاقت کو جانتا
بھی نہیں اور اگر جانتا ہے تو پکی پکائی روٹی چاہتا ہے اور خود ذکر خدا کی محنت نہیں کرنی چاہتا۔
آپ یقین کیجئے کہ آج کل تمام آدمی ایسے ہی ہو گئے ہیں اور لاکھ آدمیوں میں شاید ایک
آدمی بھی طالب خدا مشکل نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ گو وہ نماز پڑھتے ہیں۔ گو وہ ظاہرداری
کے لئے ذکر خدا بھی کرتے ہیں۔ مگر ان کے دل کو طمانیت حاصل نہیں ہوتی۔ اور ان کے احساس
مضطرب اور ان کے ارادے متزلزل رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل میں حب خدا کی مرکزی حد
قایم نہیں ہوتی اور وہ صرف دنیا کی کسی غرض سے خدا کو یاد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے
دل ایک غرض کی طلب میں بھی پوری یکسوئی سے خدا ان کے سامنے نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت
یہی غرض تصور میں رہتی ہے +

اس کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ اضطراب حواس کی وبا عالمگیر ہوتی جاتی ہے اور دوسرا
یہ ہے کہ خود درویش برباد ہو رہے ہیں۔ کیونکہ طالب خدا نہ ملنے کے سبب ان کو ذکر خدا
کے طریقے سیکھنے اور حاصل کرنے کا شوق نہیں رہتا اور وہ صرف تعویذ گنڈے اور عملیات
سیکھتے ہیں۔ اور اسی جنجال میں ان کی عمریں تمام ہو جاتی ہیں +

زیادہ ہوتی ہے۔ وہ خدا کو صرف ایک بچہ حاصل کرنے کے لئے یاد کرتا ہے اور کوئی غرض سوائے
اس کے خدا سے اس کو نہیں ہوتی۔ درویش اگر اس سے کہتا ہے کہ خدا کی یاد میرے
طریقوں کے موافق کرو تم کو قرب خدا حاصل ہوگا اور تم ہر قسم کی راحتیں اسی ذکر الٰہی سے
حاصل کر لوگے اور اولاد کا حصول بھی ایک راحت ہے وہ بھی تم کو حاصل ہو جائیگی
مگر وہ شخص جواب دیتا ہے کہ حضرت میں تو بہت گنہگار ہوں مجھ میں خدا کے قرب کی لیاقت
نہیں ہے نہ میں دنیا کے جھگڑوں کے سبب اتنی فرصت رکھتا ہوں کہ ذکر خدا کروں۔
آپ ہی کوئی موثر و مجرب تعویذ دیدیجئے یا دعا فرمائیے جس سے مجکو اولاد نصیب ہو جائے
یا مثلاً ایک آدمی پر قرضہ کا بار ہوتا ہے اور وہ اس کو دن بدن اس امید میں بڑھاتا
جاتا ہے کہ ایک دن کسی درویش کے تعویذ سے یا عمل دست غیب سے یا دعا سے چھپر پھاڑ
کر دولت میرے گھر میں آن پڑیگی یا کہیں سے دفینہ مل جائیگا یا کیمیا کا نسخہ بن جائیگا۔ اس
واسطے وہ رات دن فقیروں کو تلاش کرتا ہے اور روزی بڑھانے کے لئے محنت کی
تلاش نہیں کرتا۔ اور جب کسی درویش کے پاس جاتا ہے تو سوائے ادائگی قرض اور حصول
دولت کی خواہش کے اور کوئی درخواست اس کی زبان سے نہیں ہوتی۔ اگر اس سے
درویش یہ کہتا ہے کہ میرے بتائے ہوئے طریقے کے موافق ذکر خدا کرو اس سے
تم کو تسکین احساس ہوگی اور تمہارے قلب میں مستعدی پیدا ہو جائیگی جس سے تم
خوب محنت کر کے روپیہ کماؤ گے اور قرضہ ادا کر دوگے۔ تو وہ جواب دیتا ہے کہ جناب
میں کچھ کر سکتا تو آپ کے پاس کیوں آتا میرے دل کو تو ہر وقت قرضہ کا فکر پراگندہ
رکھتا ہے مجھ سے یہ جھگڑا نہیں ہو سکتا کہ خود کچھ کروں۔ آپ کا نام سنکر آیا ہوں۔
ہزاروں کو آپ سے فیض پہنچا ہے۔ آپ کی بخشش ہے۔ میرے سب کچھ طاقت ہی۔ دست
غیب کا ایسا عمل بتا دیجئے۔ یا کیمیا کا کوئی نسخہ اگر آپ جانتے ہوں تو دیدیجئے۔ درویش
کہتا ہے کہ دست غیب کا عمل کرنے میں بھی محنت کرنی پڑیگی اور کیمیا کا نسخہ آزمانی

ہو جائے اور تصوف اور اہل تصوف کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ یہ جو کچھ نظر آتا ہے بُرا ہے یا بھلا موجود تو ہے۔ ایک عمارت بنی ہوئی تو کھڑی ہے۔

حضرت اکبر کا ارشاد:- جب میرا دل اپنے وقت کے مشائخوں اور ان کی شرمناک حالتوں سے پک گیا اور اس میں ان کی طرف سے ایک مکروہ نفرت پیدا ہو گئی۔ اور میں ان کو اعلیٰ درجہ کا ڈاکو اور دغاباز تصور کرنے لگا تو حضرت مولانا سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی نے مجھ کو ایک نکتہ سے سنبھال لیا اور میرے عقیدے میں درستی پیدا ہو گئی۔

انہوں نے فرمایا اگر چراغ دکھانے والا کوئی بُرا آدمی ہے تو تم اُس کو دیکھتے کیوں ہو روشنی کو دیکھو اور راستہ چلو۔ کہ جو چراغ اور چراغ دکھانے والے کو دیکھتا رہتا ہے وہ راستہ نہیں چل سکتا۔ بلکہ ٹھوکر کھاتا ہے۔

بیشک ہم طالبوں کا مقصود خدا کا راستہ ہونا چاہیئے۔ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے رہبر ہم کو خدا کا راستہ بتاتے ہیں یا نہیں۔ بس اس کے سوا ہم کو مناسب نہیں ہے کہ ہادیوں کے ذاتی چال چلن اور عیب و صواب تلاش کرنے میں عمر برباد کریں۔

حاصل مقصد یہ ہے کہ اگر مریدوں میں خدا کی سچی طلب پیدا ہو جائے اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ہم سب کا اصلی مقصود مرید ہونے سے یہ ہے کہ خدا کی محبت و الفت دل میں پیدا ہو اور پیر کے ذریعے سے ہم اطاعت خدا کے ایک مرکز پر آ جائیں اور پیروں سے ذکر خدا کا طریقہ پوچھا جائے اور ذکر خدا کو ہی تمام مقاصد دنیا کا کفیل سمجھا جائے۔ کیونکہ درحقیقت ذکر خدا صحیح طریقہ سے کیا جائے تو قلب و احساس میں تسکین و اطمینان پیدا ہوتا ہے اور انسان کے عزم و ارادہ میں قوت بڑھتی ہے جس سے وہ دنیا کی ہر مشکل کو حل کر لیتا ہے اور تائید الٰہی اس کے ہر مقصد دنیاوی میں پُرزور رکفالت کرتی ہے اور وہ کسی مراد سے محروم نہیں رہتا۔ تو چند روز میں اچھے اور کامل روحانی مقتدا پیدا ہو جائیں گے جن کو مرید ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اور جو پیرزادے ہیں وہ بھی سدھر جائیں گے۔

میں ذاتی مشاہدات اور بزرگوں کی تعلیمات کی بناء پر بالیقین کہتا ہوں کہ ذکر خدا میں

میں نے ہندوستان کی ہر مشہور خانقاہ اور ہر مشہور درویش کو دیکھا۔ میں ممالک مصر و شام و حجاز میں گیا اور وہاں کے مشائخ کو بھی نظر غور سے دیکھا۔ ہر جگہ ایک ہی حالت پائی ان میں اکثر دنیا کے سکرات میں اور دنیا داری کی نزع میں مبتلا پائے گئے۔ الا ماشاء اللہ۔ اور اس کا سبب میرے ذہن میں یہی آیا کہ خرابیاں مریدوں اور طالبوں نے پیدا کی ہیں۔ کہ ان کی طلب صحیح نہیں ہے ✤

میں اجمیر شریف اور کلیر شریف کے مشہور عرسوں میں مشائخ کو دیکھتا ہوں کہ وہ عملیات کی تجارت کرنے وہاں جاتے ہیں اور ان کو باقاعدہ دکانداری وہاں کرنی پڑتی ہے۔ وہ مریدوں کے غول کے ساتھ لیکر مزار یا مجالس سماع میں جاتے ہیں تاکہ دوسرے دیکھنے والے ان کی طرف متوجہ ہوں۔ وہ مجمع عام میں ذکر و شغل کے حلقے کرتے ہیں تاکہ ان کو خدا رسیدہ سمجھا جائے۔ وہ سماع خانہ میں منتظمین کو رشوتیں دیکر ایسی ممتاز جگہیں حاصل کرتے ہیں جہاں ان پر حاضرین کی نظریں پڑیں اور ان کی جنس درویشی کا اشتہار ہو سکے۔ وہ اپنی مجلسوں میں دوسرے درویشوں کی غیبتیں کرتے ہیں تاکہ اُن کے مرید سوائے ان کے اور کسی پیر کے اثر میں نہ چلے جائیں۔ وہ اپنے کمالات اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں۔ مصنوعی بیماروں کو تیار کراتے ہیں جو ان کے سامنے تڑپتے ہیں ایک چھو سے اچھے ہو جاتے ہیں۔ وہ لالو کے ذریعے سے اپنی کراماتیں مشہور کراتے ہیں وہ اپنے خلفا کو خفیہ تلقین کرتے ہیں۔ کہ لوگوں میں میرے تصرفات و کرامات کا ذکر کیا کریں ✤

یہ سب کیوں ہے؟ اس واسطے کہ طالبوں کی طلب گمراہ ہو گئی ہے اور خدا کی طلب لوگوں میں صحیح طور پر باقی نہیں رہی۔ جیسی روحیں ہیں ویسے ہی فرشتے ہیں۔ جیسے مرید ہیں ویسے ہی پیر ہیں۔ جیسے مقاصد ہیں ویسے ہی ان کے حل ہیں ✤

اگر یہ درویش اور پیر ایسا نہ کریں تو اول تو خود ان کی روزی جاتی رہی اور کوئی ان کو ایک کوڑی کو بھی نہ پوچھے۔ دوسرے اولیاء اللہ کا رہا سہا عقیدہ بھی لوگوں سے گم

کوئی کہتا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے اجتماع سے یہ اضطراب دور ہوگا۔ کوئی کہتا ہے ہندوستان کی اقوام کے متحد ہونے سے اس پریشانی کا سدباب ہو سکتا ہے۔ کسی کی صلاح ہے اہل جبر و جور سے ترک تعلقات اس مرض کی دوا ہے کسی کی زبان پر دبے ہوئے الفاظ میں یہ بھی آتا ہے کہ مذہبی پابندی سے ان مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ سب باتیں فروعات ہیں اور ان سب میں جزوی فائدے ہیں۔ اصلی فائدہ ذکر خدا میں ہے۔ اگر وہ صحیح طریقہ سے کیا جائے اور دل میں خدا کی معیت اور خدا کی موجودگی کا یقین ہو جائے۔

جو لوگ صرف زبان سے مذہبی پابندی کا راگ گاتے ہیں ان کو یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ وہ پابندی کیونکر ہو۔ دہلی کے جلسہ جمعیت علما نے فیصلہ کیا کہ داڑھیاں رکھی جائیں اور اس پر لوگوں نے عمل بھی شروع کر دیا۔ لوگ خوش ہوئے کہ مذہبی پابندی کا وقت شروع ہو گیا۔ داڑھی بیشک مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ مگر مسلمان ہونا نہیں ہے دل کی داڑھیاں تو شیطان روز مونڈتا ہے۔ چہرے کی داڑھیاں بڑھ گئیں تو کیا حاصل۔ ضرورت اس کی ہے کہ دل میں خدا کی عظمت جمے اور یہ یقین حاصل ہو کہ خدا ہمارے ساتھ ہے اور ایک سکنڈ کو بھی ہم سے جدا نہیں ہوتا اور ہم ایک لحظہ کو بھی اس سے جدا نہیں ہو سکتے ہمارا ریزولیشن خدا کے پاس جانا چاہیے۔ کوئی دنیا کی سلطنت اس قابل نہیں ہے جس کو ہم مخاطب کریں۔

میں مانتا ہوں کہ دنیا طلبی کی جسقدر مثالیں اوپر بیان کی گئی ہیں وہ نئی نہیں ہیں ہر زمانہ میں درویشوں کے پاس اکثر طالبین دنیا بھی آتے تھے اور مقاصد بھی عموماً اسی قسم کے ہوتے تھے جو آج کل ہوتے ہیں۔ اور بزرگان دین حسرت سے فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص طلب خدا کے لئے نہیں آتا۔

مجھ کو اس کا بھی اقرار ہے کہ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنے

طاقت ہے کہ اگر اس کو صحیح طریقہ پر کیا جائے تو اولاد کی نعمت بھی مل جاتی ہے اور مقدمات بھی فتح ہو جاتے ہیں۔ بیماروں کو تندرستی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ قرضے بھی ادا ہو جاتے ہیں روزگار اور معاش میں بھی کشائش ہوتی ہے۔ اعزاز بھی ترقی کرتا ہے۔ محبوب مطلوب مجازی بھی حاصل ہو جاتے ہیں ❖

جب تمہارے دلوں میں ذکر خدا اپنا گھر بنا لیتا ہے تو تمہارے ہر کام اور ہر کوشش میں تائید ربانی ہوتی ہے۔ تمہاری ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ تمہارا ہر عمل اور ہر وظیفہ مؤثر ہوتا ہے اور سب سے بڑی نعمت تو تسکین احساس کی نصیب ہو جاتی ہے یعنی ذکر خدا کرنے سے تمہارا دل اتنا قوی ہو جاتا ہے اور تمہارے حواس باطنی اور ظاہری میں اتنی توانائی آجاتی ہے کہ تم دنیا کے افکار کو ہیچ سمجھنے لگتے ہو۔ اگر تمہارے اولاد نہ ہو تو تم سراسیمہ اور مضطرب نہیں ہوتے اور دل میں توکل اور خدا کی مرضی پر رضامند رہنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اگر تم مقروض ہو تو ذکر خدا کی قوت تم میں ہمت دیتی ہے اور تم سعی اور رزق حلال کی طلب میں آگے بڑھتے ہو اور کفایت شعاری اختیار کر کے ادائیگی قرض کا استعداد اور تم میں پیدا ہو جاتا ہے ❖

تسکین احساس ایسی دولت ہے جس سے تم ہر مشکل مقدمہ اور ہر ظالم دشمن کی پروا نہیں کرتے اور جب دل میں اطمینان کا استقلال ہوتا ہے وہ ہر دشواری کو فتح کر لیتا ہے اور وہ فتح یہ ہے کہ یا تو وہ مقصود اس کو حاصل ہو جاتا ہے اور یا ناکامی پر اس کو کچھ صدمہ نہیں ہوتا اور وہ شکست کی حالت میں بھی مطمئن رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ آج خدا کی یہی مرضی تھی جو میں ناکامیاب رہا۔ مگر کل ضرور کامیاب ہوں گا کیونکہ خدا میرے ساتھ ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں اور جس کے ساتھ خدا کی قوت ہو وہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہوتا ہے ❖

مسلمانوں کے موجودہ زمانہ اضطراب میں ہر شخص نئی نئی طرح کا طریقہ تسکین تجویز کرتا ہے

وہ تمہارے ہر کام میں پوری کارسازی فرمائیگا۔ مگر شرط یہ ہی کہ تم بھی اس دنیا کے ظرفیوں
کی موافق جائز طور پر سعی و جستجو کرو اور خدا کے دیئے ہوئے دل و دماغ اور ہاتھ پاؤں سے
کام لو اور سعی و محنت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرو اور اس کی یاد و ذکر سے اپنے حواس
و قوائے ارادی کو مضبوط رکھو۔ اگر تم ایسا کروگے تو تم کو تسکین احساس کی قوت بھی ملیگی
اور تمہاری سب مرادیں بھی پوری ہوں گی ؂

تسکینِ احساس اطاعت سے

اب میں ذکر الٰہی کے ایک دوسرے پہلو کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو تسکین احساس
کے لئے بہت ضروری ہے۔ اور اس کا نام اطاعت ہے ؂

اطاعت کو بظاہر ذکر الٰہی سے کچھ تعلق معلوم نہ ہوگا مگر حقیقت یہ ہی کہ ذکر کی بہت سی
قسمیں ہیں۔ اور ذکر الٰہی کی عملی صورت ہے جو اذکار و اشغال آگے جا کر بیان کیے جائیں گے
وہ کبھی استقلال سے عمل پذیر نہیں ہو سکتے جب تک کہ ذاکر کے دل میں مرکز اطاعت
قایم نہ ہو۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم
اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور تم میں سے جو روحانیت
والے ہوں ان کی اطاعت کرو۔ جس کا مطلب یہ ہی کہ اطاعت خدا اطاعت رسول
پر منحصر ہے۔ اور اطاعت رسولؐ اطاعت اولالامر پر انحصار رکھتی ہے ؂

یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے اولالامر کا ترجمہ روحانیت والے کیا
ہے۔ حالانکہ قرآن شریف کے اکثر ترجموں میں اس کے معنی حکومت والے امارت
والے اور اصحاب اقتدار کئے گئے ہیں۔ اور اسی آیت سے بعض لوگ بادشاہ کی اطاعت
کا واجب ہونا نکالا کرتے ہیں۔ مجھے اس پر اصرار نہیں ہی کہ اولالامر کے یہی معنی ٹھیک
ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اس لفظ کے معنی روحانیت

گرد و پیش کے ذاتی حالات سے متاثر ہوا کرتا ہے اور خدا کی ضرورت اس کو اکثر ذاتی اغراض دنیا کے لئے عموماً ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بات بالکل ان نیچرل ہے کہ انسان خدا کو محض اس لئے یاد کرے کہ وہ خدا ہے۔ کیونکہ خدا نے ضروریات دنیا کو پیدا صرف اس لئے کیا ہے اور ان کو انسان کے ساتھ لگایا اس واسطے ہے کہ وہ ان کے ذریعے سے مجھ تک آئے۔ اور اس کی حس تمیز کا امتحان ہو۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود میرا کہنا یہ ہے کہ راستہ سیدھا اختیار کیا جائے یعنی ہر خدا پرست اپنی اغراض دنیا کے لئے بھی صحیح طریقہ سے خدا کو پکارے اور اپنے دل کو اس کی یاد اور اس کے یقین وجود سے مطمئن اور مستقل بنائے۔

یہ کام مشائخ کا ہے کہ وہ اپنی ڈگمگانے والی حیثیت کو شناخت کریں کہ زمانہ ان کی بربادی کو درپے ہے اور ان کی مذکورہ بدنامیاں رفتہ رفتہ ان کو بے اثر کر رہی ہیں جن سے اندیشہ ہے کہ چند روز کے بعد وہ بالکل بدنام ہو جائیں گے اور بہت کم دلوں میں ان کی وقعت باقی رہے گی۔ اس لئے اُن کو چاہیے کہ خود بھی خدا اور ذکر خدا کا راستہ سیکھیں اور اپنے پاس آنے والے لوگوں کو بھی بتائیں کہ دنیاوی حاجات کی تکمیل کا صحیح راستہ یہ ہے کہ خدا اور ذکر خدا کو دل میں جگہ دو۔

زمانہ گزشتہ میں بھی اغراض دنیا کی طلب کا یہی حال تھا مگر مشائخ انہی اغراض کی تکمیل کے ذریعے طالبین کو خدا کے راستہ پر لگا لیتے تھے اور یہ اندھیر نہ تھا جو آج کل ہے۔ جن مشائخ نے یہ کہا ہے کہ ہم کو خدا کا طالب نہیں ملتا ان کا مطلب یہ ہے کہ خالص طلب خدا کے لئے بہت کم لوگ آتے ہیں۔ یہ مطلب نہ تھا کہ اگر ہم ان کو اغراض دنیا کے حصول کی لئے ذکر خدا تعلیم کرتے ہیں تو وہ ان کی تعمیل سے کانوں پر ہاتھ دھر کر پیچھے بھاگ جاتے ہیں۔

اے لوگو! خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تم کو رزق دے گا۔ وہ تم کو اولاد دیگا۔ وہ تم کو عزت دار بنائیگا۔ وہ تمہاری مشکلات کو حل کریگا۔ وہ تم کو دشمنوں کے حملہ سے محفوظ رکھے گا۔

یورپ نے سمجھا ہوگا کہ ہم نے یہ طریقہ جاری کرکے ہندوستان کی قدیمی اور خراب تہذیب کو برباد کردیا۔ اور اس کی جگہ ہماری تہذیب لوگوں کے خیالات میں سرایت کرگئی۔ لیکن اس کا نتیجہ وہی نکلا جو دوسروں کے لئے کنواں کھودنے والے کو ملا تھا۔ کہ وہ خود اس میں گر پڑا تھا یعنی ہندوستانی طلبہ ایسے بے اطاعت ہوئے کہ اپنی حاکم کی اطاعت کو بھی خیرباد کہدیا۔ اور آج کل بے اطاعتی نے جو کچھ خرابیاں ڈال رکھی ہیں وہ کسی کی نظر سے مخفی نہیں ہیں کہ ہر شخص اطاعت سے آزاد ہونے کے لئے مضطرب نظر آتا ہے ؛

دنیا کے ہر ملک میں یہی حال پیش آرہا ہے۔ یہ جو جگہ جگہ ہڑتالیں ہورہی ہیں نوکروں کی بے اطاعتی ہے اور عورتیں اپنے شوہروں پر طلاق کے مقدمات دائر کررہی ہیں۔ یہ بھی بے اطاعتی کا بُرا نمونہ ہے۔ رعایا حکومتوں کے خلاف سرکشی کررہی ہے اس میں بھی اسی بے اطاعتی کا دخل ہے ؛

پس اس اضطراب عام سے اگر کسی کی تسکین مطلوب ہے تو فوراً ایک جائز مرکز اطاعت اختیار کرلینا چاہئے اور قرآن کے حکم کے بموجب خدا اور رسولؐ اور روحانیت والوں کی اطاعت کا مرکز تو بہت جلد تیار کرنیکی ضرورت ہے ؛

میرا خیال ہے کہ جو لوگ اصلی تصوف پر حقیقی معنوں میں عمل کرتے ہیں وہی سچے معنوں میں روح والے ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت حکم خدا کے بموجب ہر مسلمان پر واجب ہے۔ خصوصاً جو مسلمان کسی شیخ کے مرید ہیں ان کو تو لازمی طور سے اپنے پیر کی اطاعت درجہ کمال پر کرنی ضروری ہے تاکہ وہ پیر کی اطاعت کے ذریعہ سے رسولؐ کی اطاعت کا حق ادا کرسکیں اور رسولؐ کی اطاعت ان کو اطاعت خدا کے مرکز تک پہنچا دے۔ کیونکہ پیر خدا و رسول کے احکام کی تعمیل کرانے کو عہد و بیعت لیا کرتا ہے۔ اگر اس کی اطاعت پوری طرح سے کی جائیگی تو خدا رسولؐ کی اطاعت

والے یا روح والے بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ خود قرآن کی ایک آیت اس کی تائید کرتی ہے جو قل الروح من امر ربی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ روح خدا کا امر ہے۔ پس جبکہ روح امر ہے اور امر روح ہے تو اولا امر کے معنے اولا ارواح کئے جائیں تو ناجائز نہ ہوں گے۔

عدم اطاعت سے اضطراب:۔ آج کل دنیا میں اطاعت ہی کے انکار نے اضطراب عام پیدا کر دیا ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم سے اطاعت کا مادہ سلب ہو رہا ہے بیٹا باپ کی اطاعت سے نکلنا چاہتا ہے۔ بیوی شوہر کی اطاعت سے بیزار نظر آتی ہے شاگرد استاد کی اطاعت کو احمق پن تصور کرتے ہیں۔ نوکر آقا کی اطاعت سے نکلتے جاتے ہیں اور سب سے بڑی خرابی اس نے یہ ڈالی ہے کہ رعایا بادشاہوں کی اطاعت سے نکل جانیکو آزادی سمجھتی ہے۔

آزادی بہت اچھی چیز ہے بلکہ دنیا میں کوئی نعمت آزادی سے بڑھ کر نہیں ہے مگر جس آزادی کی ہوا آج کل چل رہی ہے وہ درحقیقت آزادی نہیں ہے بلکہ نفس اور خواہشات ذاتی کی ناجائز غلامی ہے۔

بے اطاعتی کا یہ وبال یورپ سے یہاں آیا ہے خصوصاً ہندوستان میں تو انگریزوں کی قوم اس کو لائی ہے۔ پہلے ہم لوگ ماں باپ کی اطاعت بہت زیادہ کرتے تھے۔ اور استاد کو تو باپ اور پیر کی برابر سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں اپنے خاوند کو مجازی خدا تصور کرتی تھیں۔ انگریزوں نے اسکول جاری کئے اور ان کے ایسے قواعد بنائے جس سے استاد کی حرمت بالکل مٹ گئی۔ اور شاگردوں نے استاد کو اپنا نوکر اور غلام سمجھنا شروع کر دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے پہلے تو استاد سے گستاخ ہوئے پھر ماں باپ کی اطاعت کو انہوں نے اسی تعلیم کے طفیل خیرباد کہا۔ اس کے بعد پیر اور دیگر بزرگوں کی اطاعت ان کے دلوں سے نکل گئی۔

غلط تقلید ہے یعنی یہ انجمنیں انگریزوں کی تقلید اچھی باتوں میں تو نہیں کرسکتیں اور بُرائیاں اختیار کرلیتی ہیں اس کے علاوہ ان کا کچھ اخلاقی نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ اس واسطے اب میں اس کے تو سراسر خلاف ہوں کہ صوفی بھی اپنی کوئی انجمن بنائیں اور ریزولیشن پاس کیا کریں۔ کیونکہ ان کا یہ کام ہرگز نہیں ہے۔ نہ ان کو انجمن کے ذریعہ سے کسی مرکز کے قایم کرنیکی ضرورت ہے۔ ان کے مرکز پہلے ہی سے بنے ہوئے ہیں۔ اور ہر سلسلہ و خانوادہ انکا مرکزی دارالاجتماع ہے +

البتہ یہ ضرورت ہر اعتبار سے قابل توجہ ہے کہ مشایخ اپنی تلقین کے طرز عمل کو ذرا آج کل کے موافق بنائیں مگر صرف فروعات میں یعنی اصول کو اسی حال قدیم پر رکھنا چاہیے۔ میں مشایخ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان کی حالت ایک طبیب اور ایک بادشاہ کی سی ہے۔ پس جسطرح طبیب ہر موسم اور ہر مزاج کے حسب حال علاج کا طریقہ بدلتا رہتا ہے یا جس طرح بادشاہ حالات کے بموجب نئے نئے قوانین تیار کرتا ہے اور پرانے قوانین منسوخ کر دیتا ہے اسی طرح مشایخ کو بھی کرنا چاہیے جو روحانی طبیب ہیں اور مذہبی حاکم ہیں +

وہ تبدیلی کس قسم کی ہو + میری دانست میں ترک دنیا کی تلقین سب سے زیادہ غور طلب ہے۔ مشایخ نے ترک تعلقات دنیا پر جس قدر زور دیا تھا وہ کوئی خانہ ساز حکم نہ تھا بلکہ قرآن شریف اور احادیث کے متواتر احکام کی بموجب یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور اس پر زیادہ تاکید اس زمانہ میں شروع ہوئی تھی جبکہ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ زوروں پر تھا اور دولت و دنیا ایک سیلاب کی طرح ان کی قبضہ میں آرہی تھی اس وقت مشایخ نے ضروری سمجھا کہ ترک تعلقات دنیا کی ہدایت شدومد سے کریں تاکہ مسلمان دولت کی مصروفیت میں خدا کو نہ بھول جائیں +

مگر اس وقت بھی ان کی نصیحت یہی ہوتی تھی کہ دولت سے محبت نہ بڑھاؤ اور محض

کا حق بھی ادا ہو جائیگا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں خدا و رسولؐ اور اولوالامر کی اطاعت کو ایک ہی سلسلہ میں درجہ وار بیان کیا گیا ہے *

میں نے اس مضمون کی بنیاد اسی پر رکھی ہے کہ ذکر الٰہی سے تسکین احساس حاصل ہوتی ہے اور اب میں کہتا ہوں کہ ذکر الٰہی مکمل طریقہ سے عمل میں نہیں آسکتا جب تک کہ پیر کی اطاعت کامل طور پر مریدوں میں رائج نہ ہو۔ اگر اطاعت کا مرکز مریدوں میں قایم ہو جائے تو ان کے تمام اضطرابات دینی و دنیاوی میں تسکین تامہ پیدا ہو جائیگی پیروں ہی پر منحصر نہیں ہے جو شخص کسی ہادی اور رہنما کی اطاعت کرے گا وہ ضرور تسکین احساس کی نصیحت حاصل کرلیگا *

میں اس شبہ کو دور کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اطاعت کی اس لغت میں سیاسی اطاعت میرے پیش نظر نہیں ہے اور سیاسی بے اطاعتی کا ذکر محض تمثیل کے طور پر کیا گیا ہے *

تلقین درویشی میں ضرورت تبدیلی

ذکر الٰہی کے طریقوں کا بیان کرنے سے پہلے میں حضرات مشائخ ہندوستان سے ایک ضروری عرضداشت کرنی چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میرے خیال میں یہ زمانہ ایسا آیا ہے جس میں درویشی کے تلقین کا طریقہ فروعات میں قدرے بدلدینا ضروری معلوم ہوتا ہے *

ایک زمانہ تھا کہ میں نے صوفیوں کی انجمن حلقہ نظام المشائخ یا آل انڈیا صوفی کانفرنس کے نام سے قایم کی تھی۔ اور میں مشائخ کو سیاسی طریقہ کے ایک ضابطہ اور شیرازہ میں منضبط ہونا ضروری سمجھتا تھا۔ مگر دس سال کے تجربے نے میرا یہ خیال بدل دیا اور مجھکو معلوم ہوگیا کہ جو انجمنیں اس ملک میں قایم ہوتی ہیں یہ انگریزوں کی

اس سیاسی اندیشہ کے علاوہ مذہبًا اور طریقتًا بھی مشائخ کو اپنی روزی خود کمانی چاہئے۔ مسلمانوں کے ابتدائی زمانہ میں ہر صوفی بزرگ کوئی نہ کوئی پیشہ کرتے تھے چنانچہ لوہار۔ بڑھئی۔ رسی بٹنے والے۔ بزاز۔ قصاب وغیرہ پیشوں کے صدہا اولیا اللہ گزر چکے ہیں۔ بعد کے زمانہ میں یہ پیشہ وری اس وجہ سے باقی نہیں رہی کہ دولت کی کثرت اور فتنوں کے ہجوم نے مشائخ کے فرائض ہدایت کو اس قدر بڑھا دیا تھا کہ وہ خود محنت کرکے روزی کمانے کا وقت نہ بچا سکتے تھے اس کے علاوہ خلقت کی طرف سے ان کی خدمت اور امداد اس کثرت سے ہوتی تھی کہ ہر درویش معاش کی طرف سے مطمئن رہتا تھا اور اس کو آجکل کی طرح مریدوں سے روپیہ وصول کرنے کے لئے طرح طرح کے ناجائز حیلے نہ کرنے پڑتے تھے ؛

اگر مشائخ کسب معاش کے لئے تجارت یا صنعت وحرفت کے کام شروع کردینگے تو خدا کے سامنے بھی ان کی عزت ہوگی اور مریدین میں بھی ان کی وقعت بڑھے گی اور یہ کمزوری بھی دور ہو جائیگی جو آج کل ان میں کسب زر کی وجہ سے پائی جاتی ہے۔ کہ وہ مریدوں سے روپیہ لینے کے لئے ناروا کام کرتے ہیں اور اس سے ان کے ضمیر و احساس کو تکلیف رہتی ہے۔ اگر انہوں نے میرے لکھنے پر توجہ فرمائی تو چند روز میں ان کو تسکین احساس کی نعمت حاصل ہو جائیگی اور ان کے مرید بھی ان کی تقلید کرکے اس نعمت سے مالامال ہو جائیں گے ؛

ریاضات ومجاہدات میں تبدیلی :۔ دوسری بات میرے ذہن میں یہ آتی ہے کہ عہد قدیم میں جو طریقے ریاضتوں اور مجاہدوں کے رائج تھے ان میں بھی قدرے تبدیلی ہونی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ زیادہ روزے نہ رکھوائے جائیں اور ترک حیوانات اصرار نہ کیا جائے کیونکہ لوگوں کی جسمانی حالت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اور افلاس عام نے ان کو از حد ناتوان کر دیا ہے۔ روزے اور ترک حیوانات کا مجاہدہ ان کو فائدہ کی جگہ

اسی کے غلام نہ بن جاؤ اور کوئی بزرگ یہ فرماتا تھا کہ دولت کا حاصل کرنا حرام و ناجائز ہے اگر ایسا حکم دیا جاتا تو حصول دولت کا یہ میلان عام ہرگز ترقی نہ کرتا۔

آج کل ہم بحیثیت قوم کے مفلس و نادار ہو گئے ہیں اور رزق کی تنگی نے ہم سب کو پراگندہ خاطر کر دیا ہے۔ اور عبادت رب میں ذوق کی کمی بھی اسی افلاس عام کے سبب بڑھ گئی ہے اس واسطے ضرورت ہے کہ مشائخ بجائے ترک دنیا کے ہر مرید کو نصیحت کریں کہ جائز روزی اپنی محنت سے کماؤ اور کوئی شخص نکما نہ رہے۔ کیونکہ وقت ایسا آنے والا ہے کہ ہر شخص قانوناً مجبور کیا جائیگا کہ اپنی روزی خود کما کر کھائے۔ آنے والا زمانہ کسی شخص کو تارک دنیا اور بیکار نہ رہنے دیگا۔ لہذا عقلمندی یہ ہے کہ ہم لوگ پہلے سے تیار ہو جائیں اور قانون کے جبر کا شکار نہ بنیں جس سے ہم کو طرح طرح کی ذلتیں برداشت کرنے کا اندیشہ ہے۔

خود مشائخ بھی محنت سے روزی کمائیں۔ میں شاید ایک بڑی گستاخی کرونگا اگر حضرات مشائخ سے یہ عرض کروں کہ خود ان کو بھی محنت اور مشقت سے اپنی روزی حاصل کرنی چاہیئے۔ مگر یہ گستاخی نہیں ہے بلکہ آنے والے خطرہ کی اطلاع ہے کیونکہ اگرچہ میں اس کا خوف تو نہیں کرتا کہ بالشویک حکومت یہاں ہو جائیگی کیونکہ مجھ یقین ہے کہ انگریزوں کی قوتِ اسلحہ ان کو یہاں آنے نہ دیگی۔ لیکن یہ اندیشہ یقینی ہے کہ ہندوستان میں بالشویک خیالات ضرور پھیل جائیں گے اور یہاں آیندہ زمانہ میں حکومت کا طریقہ انہی اصول پر قایم ہوگا۔ اور بالشویک اصول میں یہ بات داخل ہے کہ کوئی شخص نکما نہ رہے۔ وہ پادریوں کو بھی نکما نہیں رہنے دیتے اور ان سے بھی روزی کمانے کے لئے جبراً محنت لیتے ہیں تو کیا مشائخ ہند اسی طرح بیٹھے رہیں گے اور ان سے یہ نہ کہا جائے گا کہ وہ بھی کوئی کام کریں اور اپنی روزی محنت و مشقت سے کمائیں۔

جس نے ہمہ اوست کو جان کر سمجھ لیا
اس کے حواس کبھی مضطرب نہ ہونگے

قرآن شریف کا وعدہ سچا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور اللہ کے ذکر کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس کے اسمائے ذات و صفات کو زبان سے پڑھا جائے اور دل میں اور تمام رگوں اور پٹھوں میں اس کی یاد کی کیفیت جذب کی جائے اور دوسری یہ ہے کہ بطور فلسفہ کے اللہ کی ذات و صفات کو سمجھا جائے۔ خصوصاً اپنے وجود اور خدا کے وجود کے تعلق باہمی کو معلوم کیا جائے۔

میری دانست میں یہ آخر کا ذکر یعنی خدا کو بطریق فلسفہ و تصوف کے سمجھنا بنیادی چیز ہے اور اچھی طرح سمجھ میں آجائے تو زبانی ذکر الٰہی سے بھی زیادہ موثر ہوگا۔ اس واسطے میں اس کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ذات :۔ ایک ہستی مطلق ہے جس کو واجب الوجود کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ بغیر اجزا کے کل ہے۔ وہ سب کو محیط ہے۔ لیکن خود احاطہ سے باہر ہے۔ وہ کسی علم میں نہیں سما سکتی۔ وہ کسی قید میں نہیں آسکتی اس میں زوال و تغیر نہیں ہے۔

سب چیزیں اسی سے موجود ہیں۔ مگر وہ کسی سے موجود نہیں ہے اور زمین و آسمان میں اس کے سوا اور کچھ بھی اس کے بغیر نہیں پایا جاتا۔ اس واسطے بس وہ ایک ہی ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہوتی نہ کوئی اس سے پیدا ہوا۔

مگر اس کی شناخت بغیر ناموں اور صفتوں اور ان کے مظاہر کے محال ہے اس واسطے صفات و اسماء کا عرفان مقدم ہے۔

صفات :۔ جب وہ ہستی مطلق مرتبہ ظہور میں کسی خاص تجلی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے

نقصان پہنچائے گا کیونکہ ان مجاہدات کی ضرورت اس واسطے پڑتی تھی کہ لوگوں کے بدن میں خون کثرت سے ہوتا تھا اور وہ عمدہ عمدہ غذائیں کھاتے تھے اب نہ بدن میں خون رہا ہے نہ اچھی غذا میسر آتی ہے۔ اچھی کیا بُری غذا بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتی اور قدرتاً ہر شخص مجاہدات اور ریاضات میں مبتلا ہے آجکل تو یہ طریقہ مناسب ہے کہ ذکر الٰہی کرنے والوں کو پوری مگر سادہ اور زود ہضم غذا ملے تاکہ وہ ذکر الٰہی اطمینان اور سلامتی حواس سے کر سکیں ✤

وحدت وجود کے قال میں تبدیلی:۔ تیسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ وحدت وجود کے قال کو ذرا محدود کیا جائے۔ کیونکہ بے علمی کا دَور ہے اور عوام اس کے فہم سے قاصر ہیں۔ اور بناوٹی درویش اسی قال کے پردے میں صدہا قسم کی آوارگیاں کر کے درویشی کو بدنام کرتے ہیں ✤

میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج کل میرے مضامین میں بھی وحدت وجود کا قال زیادہ ہوتا ہے۔ مگر میں صرف اشارے اور کنائے کرتا ہوں کیونکہ اس کو علم ادب میں جذب کرنا اور نئی روشنی کے دماغوں کو اس سے آشنا رکھنا بہت ضروری ہے۔ میں نے اپنی تحریروں کو ایسے قال سے بچانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے جو دائرہ انشا پردازی سے آگے بڑھ کر ذہنوں اور دماغوں کو خدا بننے یا ہر چیز کو خدا کہنے کے الحاد میں ڈال دے اور آئندہ بھی جبتک زندگی ہے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط کو پیش نظر رکھنا چاہتا ہوں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ وحدت وجود کے مسئلہ کو عام فہم طریقہ سے علمی طور پر لکھا جائے۔ اور میں اس کی ضرورت بھی محسوس کرتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ جب تک عربی علوم کا عام رواج نہ ہو اور لوگ مذہبی تعلیم سے زیادہ واقف کار نہ ہوں اس قسم کے مضامین خلقت کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے تاہم میں نے عام فہم مثالوں کے ذریعے سے تھوڑا سا ذکر وحدت وجود کا بیان کیا ہے۔ تاکہ عقائد کی بنیاد درست ہو جائے ✤

ذات و صفات کے پرتوہ کے کچھ بھی نہیں ہے*

مثلاً ایک ڈورے میں چند گرہیں لگی ہوئی ہیں ان گرہوں کو ڈورا نہیں کہتے ہیں بلکہ انکی شکل و صورت کے سبب گرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ گرہ کے اندر سوای ڈورے کے اور کچھ بھی موجود نہیں ہے*

پس اس گرہ کو تعین کہیں گے۔ جب گرہ لگ گئی تو گرہ ہے اور کھل گئی تو ڈورا ہے۔ گرہ کو ڈورا نہیں کہتے اور صرف ڈورہ کو گرہ نہیں کہہ سکتے*

یا مثلاً لوہے کو پگھلا کر ایک قلم بنائی اور دوسری تلوار بنائی اب قلم اور تلوار جن صورتوں کا نام ہے ان کے اندر سوائے لوہے کے اور کوئی چیز موجود نہیں اور یہ ان کی شکل تعین ہے۔ مگر ان کو لوہا نہیں کہتے۔ اور جب تک شکلیں قایم ہیں قلم اور تلوار ہی کہتے ہیں۔

یا مثلاً برف کی صورت ہے کہ اس کی حقیقت میں سوائے پانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ مگر جب تک برف کی شکل قایم ہے پانی اس کو نہیں کہتے۔

اسی طرح تمام موجودات کی شکلوں اور صورتوں کو تعینات کی نظر سے دیکھنا چاہیے کہ اگرچہ وہ ذات الہی سے جدا اور غیر نہیں ہیں مگر جب تک ان کی صورتیں قایم ہیں اور تعینات کی قید میں ہیں ان کو ذات الہی نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ کہنا یا سمجھنا شرک ہے*

کتاب میں جو حروف سیاہی سے لکھے جاتے ہیں ان میں سیاہی ذات ہے اور حروف کی شکلیں صفات ہیں کہ صفات ذات سے جدا نہیں یعنی کوئی حرف سیاہی کے سوا اپنی غیر حقیقت کچھ نہیں رکھتا۔ مگر شکل تعین کے سبب پڑھنے میں حرف ہی آتے ہیں*

پس جب ایک اصلیت و حقیقت مختلف قسم کی صورتیں نمودار ہوتی ہیں تو ان شکلوں کو تعینات کہتے ہیں اور جب کسی اعلی حقیقت کی شکلیں ادنی درجوں میں تقسیم ہونے لگتی ہیں تو ان کو تنزلات کے نام سے یاد کرتے ہیں یعنی اس حقیقت کا ظہور اشکال تنزل میں ہوا ہے

مثلاً ہوا ایک اعلی حقیقت ہے۔ حرارت آفتاب زمین کی رطوبت کو ہوائی ابخرے کی شکل

تو اسی شان ظہور کو صفت کہتے ہیں۔ مثلاً جب مخلوق ظاہر ہوئی تو معلوم ہوا کہ ذات کی صفت خالقی نے تجلی کا جلوہ دکھایا ⁕

ذات کی بے شمار صفات ہیں مگر وہ سب ذات سے جدا اور غیر نہیں ہیں۔ گو ہر صفت دوسری صفت سے اور ذات تمام صفات سے جدا اور علیحدہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں سب ایک ہی ہیں۔ جدائی بالکل نہیں۔ مثلاً پھول کی خوشبو اس کی صفت ہے جو چمن کی ہوا کو معطر کر رہی ہے۔ مگر وہ پھول کی ذات سے جدا نہیں کہی جا سکتی۔ ع

اُو درمن و من در وے چون بو بگلاب اندر است

جس طرح ذات قدیم و لازوال ہے اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم و ازلی و بے زوال ہیں۔ نہ ذات کا ادراک حقیقی ممکن نہ صفات کا ⁕

ذات میں وحدت ہے اور صفات میں گوناگوں کثرت۔ مگر چونکہ صفات ذات سے جدا نہیں اس لئے ان کی کثرت بھی صرف دید و شنید کی ہے۔ ورنہ وحدت ہی وحدت ہے ⁕

ہمہ اوست :- اسی کو کہتے ہیں کہ سب کچھ وہی ایک ذات ہے۔ اس کے سوا اور غیر کچھ بھی نہیں ہے اور یہ جو کچھ نظر آتا ہے ذات یکتا کے غیر نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں ہے وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْط (اور وہ اللہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے) اور دوسری آیت میں ہے وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (اور وہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تم کہیں بھی ہو) اور تیسری آیت میں ہے اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ (تم جس طرف بھی دیکھو اللہ کی ذات اُدھر ہی موجود ہے)

تعینات و تنزلات :- صوفیوں کی اصطلاح میں الفاظ تعینات تنزلات اکثر لکھے جاتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ موجودات کی یہ جس قدر شکلیں اور صورتیں نظر آتی ہیں۔ یہ ذات کی صفات اور ان کی تجلیات کے جلوے ہیں مگر ان کی اصلیت بغیر

گفتن و نہ بیان:۔ مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وحدت وجود نہ بیان بلکہ سمجھنے اور اپنے حس یقین پر طاری کرنے کی چیز ہے۔ کہنے اور بے سمجھے کہتے پھرنے کی چیز نہیں ہے جیسا کہ آجکل بعض جاہل درویش نما لوگ کہتے پھرتے ہیں کہ ہمی خدا وہ بھی خدا۔ تم بھی خدا ہم بھی خدا۔ کہ جو پہچان جاتا ہے اس کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کو حس حیرت اور ذوق مشاہدہ مزید میں زبان سے کچھ کہنے کی فرصت ہی نہیں ملتی +

ناسوت:۔ اسی سلسلہ میں ضرورت ہے کہ لاہوت و جبروت و ملکوت و ناسوت کی حقیقت بھی تھوڑی سی بیان کر دی جائے کیونکہ یہ الفاظ اکثر صوفیوں کی بول چال اور ان کی کتابوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ذکر الٰہی سے پہلے ان کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے +

پہلے ناسوت ہے جو ہمارے اس موجود و محسوس نظر آنے والے عالم کا نام ہے۔ اور اس عالم ظاہر کی زبان و اصطلاح میں جو کچھ کہا جائے اس کو ناسوت کی زبان کہنا چاہیئے +

ملکوت:۔ ناسوت کا باطن ملکوت ہے۔ یعنی عالم ظاہر کے بطون کو ملکوت کہتے ہیں۔ جو عالم ناسوت کے قریب و متصل ہے۔ ناسوت کے عالم سے جب عروج ہوتا ہے تو پہلے ملکوت کا منظر سامنے آتا ہے۔ ذکر و فکر کے ذرائع جو ناسوت میں استعمال کئے جائیں پہلے ملکوت میں پہنچاتے ہیں اور انسان اپنی حمد و ذکر کا بطون مشاہدہ کرتا ہے +

جبروت:۔ اس کے بعد ملکوت کے بطون کا ظہور ہوتا ہے اور اس کو جبروت کہتے ہیں۔ گویا یہ ناسوت کا تیسرا درجہ اور ملکوت کا باطن ہے۔ یہاں اپنے وجود کی پوری اور خود بخود شناسائی ہوتی ہے اور ناسوت و ملکوت کے درجے اس عرفان کے ماتحت دکھائی دینے لگتے ہیں +

لاہوت:۔ پھر جبروت کا باطن نمودار ہوتا ہے۔ جسکا نام لاہوت ہے۔ یہاں اپنی

میں زمین سے فضائے آسمانی میں لیجاتی ہے اور پھر پانی بنا کر زمین پر برساتی ہے اور وہ پانی کھیتوں میں بھی جاتا ہے اور گندی موریوں اور نالیوں میں بھی پس ہوا کی حقیقت اعلیٰ نے جب تشکل تعین یعنی ابخرے کی صورت اختیار کی تو پانی بننا اس کا تنزل ہے اور پھر برسنا اور زمین پر رواں دواں پھرنا دوسرے تنزلات ہیں +

یہ سب مجازی مثالیں ہیں۔ اس ذات حقیقی کی کہ وہ بھی تعینات و تنزلات میں اسی طرح اپنی صفات کی تجلیات دکھایا کرتی ہے اور انہی تعینات و تنزلات سے اس کائنات کا یہ تمام کارخانہ گہما گہمی سے چلتا نظر آتا ہے +

فہم ہمہ اوست میں تسکین احساس:۔ حاصل مقصد یہ ہے کہ جب انسان ذات الٰہی کی وحدت تامہ کا یقین کر لیتا ہے اور اس کو اپنے وجود کی حقیقت اور تمام کائنات اور اس کی خوشیوں اور تکلیفوں کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے تو وہ کسی صدمہ دنیاوی سے بھی پریشان نہیں ہوتا اور اس کو کوئی آفت بھی پراگندہ خاطر اور مضطر الحال نہیں کر سکتی اور وہ اپنے وجود کو ان فانی اور بے اصل خوشیوں اور تکلیفوں سے ایک اعلیٰ اور برتر و بے نیاز چیز تصور کر کے ہر وقت لذت تسکین و سرور سے شاد کام رہتا ہے +

فہم ہمہ اوست افضل الذکر ہے:۔ کیونکہ افضل الذکر کلمہ لا الٰہ الا اللہ فرمایا گیا ہے۔ اور بغیر عقیدۂ ہمہ اوست کے اس کلمہ کی ذکر کی اصلیت ذہن پر طاری نہیں ہوتی +

جب انسان سمجھ لیتا ہے کہ اس موجودات و محسوسات کے عالم میں ذات واحد کے سوا اور کچھ بھی موجود نہیں ہے اور موجودات کی یہ سب صورتیں اسی ایک ذات کی صفات کے جلوے ہیں تو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی اس کی سمجھ میں آجاتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی الٰہ مگر اللہ یعنی ایک اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں ہے +

زبان سے لفظوں کا پڑھ لینا اور گن گن کر اللہ کا ذکر کرنا بغیر اس فہمیدگی اور یقین کے سراسر بیکار ہے +

صفات اور اسماء کی تجلیاں روح و قلب کے واسطے سے نفس تک آتی ہیں مگر یہ چونکہ عالمِ خلق سے تعلق رکھتا ہے اس واسطے اس میں وہ لطافت نہیں ہے جو روح و قلب میں ہے۔ اس واسطے اس میں بغیر تربیت ناسوتی کے ان تجلیات کی قبولیت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ نفس اپنی فطرت کے تقاضے سے ان تجلیوں سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ اور حواسِ جسمانی کو ایسے احکام دیتا ہے جن سے کثافت میں ترقی ہو اور قلب و روح کے آئینوں میں تجلیاں نہ چمک سکیں۔

انسان مجاہدات و عبادات کے ذریعے سے نفس کو تربیت دیتا ہے تو پہلے اس میں ایک کیفیت حالت کی ہوتی ہے یعنی وہ خود اپنے آپ کو تجلیات کی عدم قبولیت پر نفریں کرتا ہے مگر اپنے جذبات کی مغلوبیت کے سبب اصلاح نہیں کر سکتا۔ اس کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ اور جب مجاہدات کی قوت نفس کو آزو جلا دیتی ہے تو وہ ترقی کر کے بالکل آئینہ بن جاتا ہے اور اس میں روح و قلب کی تجلیاں مکمل طور سے چمکنے لگتی ہیں اور کوئی حجاب کثافت کا نفس میں باقی نہیں رہتا اس وقت اس کا نام نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی کو نفس کے مٹانا یا نفس کو قابو میں کر لینا کہتے ہیں۔ اور اس کے نام مطمئنہ ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا پورا تصفیہ اور کمال یہی ہے کہ اس میں تسکین و اطمینان پیدا ہو جائے۔

قرآن شریف نے بھی نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کا لفظ استعمال کیا ہے اور مطمئنہ کا لفظ جہاں آیا ہے وہاں یہ عبارت ہے۔ یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔ (اے نفس مطمئنہ آ جا اپنے رب کی طرف رضامندی اور پوری رضامندی کی شان سے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نفس مطمئن ہو جاتا ہے تو اس میں رضا کے کمال کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور یہی رضا کے کمال تسکین احساس ہے۔

اشغال و اذکار

عقائد کے ذکر الٰہی کے بعد اب دوسرے درجے کے ذکر الٰہی کا بیان کیا جاتا ہے۔

کیا جائے کہ قریب میں لوگ سوتے ہوں اور ان کے ذکر سے کسی کی نیند خراب نہ ہو۔ تہجد کے وقت پہلے بارہ رکعت دو دو رکعت کی نیت سے نوافل تہجد پڑھے جائیں اور ہر رکعت میں بعد سورۃ فاتحہ کے تین تین مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھی جائے اور نماز سے فارغ ہو کر یہ پڑھے اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ عَنْ غَیْرِکَ وَنَوِّرْ قَلْبِیْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِکَ اَبَدًا یَا اَللّٰہُ یَا اَللّٰہُ یَا اَللّٰہُ

ترجمہ :- یا اللہ پاک کر میرے دل کو اپنے غیر سے اور روشن کر میرے دل کو اپنی پہچان کے نور سے ہمیشہ یا اللہ یا اللہ یا اللہ۔

اور اس کے بعد توبہ و استغفار پڑھے اور وہ یہ ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔

ترجمہ بخشش چاہتا ہوں میں اللہ سے وہ اللہ کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی جیتا جاگتا اور سب کا تھامنے والا۔ اور توبہ کر کے اسکی طرف آتا ہوں۔

اس کے بعد تین مرتبہ درود شریف پڑھے۔ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا حَبِیْبَ اللّٰہِ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ۔

ترجمہ :- درود و سلام آپ پر [illegible] درود و سلام آپ پر اے اللہ کے [illegible] پیارے درود و سلام آپ پر اے [illegible]

پھر چہار زانو پالتی مار کر بیٹھ جائے [illegible] پاؤں کے انگوٹھے اور اسکی برابر والی انگلی [illegible] پاؤں کے گھٹنے کی جڑ میں نیچے کی طرف رگ کیماس کو پکڑے مضبوطی کے ساتھ رگ کیماس کا تعلق دل سے ہے۔ اس کے دبانے سے قلب کے اندر حرارت پیدا ہوتی ہے۔ بیٹھنے میں کمر کو سیدھا رکھنا چاہیئے اور رخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے اور دونوں ہاتھ زانو پر رکھنے چاہیئیں [illegible] بسم اللہ پڑھ کے تین دفعہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھے [illegible] کلمہ شہادت اور اس کے

حلال ہو اور غیر اہل کے لئے حرام ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اشارہ حکیم نہ ایں کار حکم
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل تصوف کا اختلاف بھی نہایت مہذب اور با ادب ہوتا ہے
درویشوں کی تعلیم میں جو کچھ فرق و اختلاف ہے وہ ایک طبیب کی تجاویز کے مثل سمجھنا چاہئے
کہ وہ مریض کی حالت کے موافق طریق علاج بدلتا رہتا ہے۔ اسی واسطے بزرگوں نے
فرمایا ہے اَلطُّرُقُ اِلَى اللّٰهِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ (خدا کی طرف جانے کے طریقے مخلوق
کے سانسوں کی طرح کثیر ہیں)۔

چشتیہ خاندان کے اذکار و اشغال

توجہ:- اگرچہ توجہ زیادہ تر نقشبندیہ سلسلہ میں مروج ہے لیکن چشتیہ خاندان میں بھی
اس کی تعلیم ہوتی ہے اور ان کے طریقے کئی ہیں جن میں سے ایک یہاں لکھا جاتا ہے۔
مرشد مریدوں کے سامنے دو زانو بیٹھ جائے اور خود ان کی طرف رخ کرکے دو زانو بیٹھ
جائے اور دل کو تمام خیالات سے خالی اور یکسو کرکے اسم ذات یعنی اللّٰہ مریدوں کے دلوں پر
ایک سوا نیزہ جس میں خیال کے اندر پڑھے اور اسم ذات کی ضرب تصور میں مریدوں
کے دلوں پر لگائے اور یہ تصور کرے کہ اس اسم کی کیفیت ذکر اور اثر جذب و شوق میرے دل
سے منتقل ہو کر مریدوں کے دل میں جا رہا ہے۔ اس طرح ایک مجلس یا دو چار مجلسوں میں ان
کے دلوں کے اندر حرارت ذکر پیدا ہو جائیگی اور وہ متحرک ہو کر ہر قسم کے اذکار اشغال
کے لئے اپنے اندر اہلیت پیدا کر لیں گے۔ اکثر بزرگ تعلیم اذکار اشغال سے پہلے توجہ کو اسی
واسطے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے قلب کے اندر ذکر و شغل کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔
ذکر جہر: چشتیہ خاندان میں زیادہ تر ذکر جہر یعنی آواز سے ذکر کرنا ان کے یہاں صرف
تہجد کے وقت مروج ہے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ اذکار و اشغال لوگوں کو سنانے
اور دکھانے کو کریں۔ اور تہجد کے وقت بھی ان کے ہاں ہدایت ہے کہ ایسی حالت میں ذکر جہر

ذکر اثبات مجرد چھ سو بار مسلسل کرنا چاہیے۔ اس کو یک ضربی ذکر کہتے ہیں ۔

ذکر اسم ذات :۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو زانو بیٹھ کر سر کو دائیں کندھے کی طرف لا کر آنکھیں بند کر کے لفظ اللہ اللہ کہے۔ پہلے لفظ اللہ کی حرف ہ کو پیش سے پڑھے اور دوسرے لفظ اللہ کے حرف ہ کو ساکن رکھے۔ پہلے لفظ اللہ کی ضرب [illegible] جو داہنی چھاتی کے نیچے واقع ہے اور دوسرے لفظ اللہ کی ضرب دل پر لگائے جو بائیں چھاتی کے نیچے واقع ہے۔ اور اس ذکر کو چھ سو بار کرے اور اسی ذکر میں اسمائے صفات امہات کا تصور کرے جو اللہ سمیع۔ اللہ بصیر۔ اللہ علیم ہیں ۔

تصور [illegible] :۔ جب نو بار اللہ اللہ کہہ چکے تو ایک بار اللہ حاضری کہے اور دوسری دفعہ جب نو کی گنتی ہو رہی ہو تو اللہ ناظری کہے اور جب تیسری بار نو کا عدد پورا ہو تو تیسرے مرتبہ اللہ معی کہے ۔

یہ ذکر بارہ تسبیح کا تہجد کے وقت کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص تہجد کے وقت نہ کر سکے تو اور کسی فرصت اور آسانی کے وقت کر سکتا ہے۔ ذکر سے فارغ ہونے کے بعد اپنے سلسلے کے بزرگوں کی جناب میں فاتحہ پڑھنی چاہیے ۔

ذکر پاس انفاس :۔ اس کے طریقے بہت اقسام کے ہیں جن میں آسان اور عام فہم دو طریقے بیان کئے جاتے ہیں ۔

نفی و اثبات کا پاس انفاس :۔ یہ ہے کہ جب اندر کا سانس جانے لگے تو لا الہ کو اور جب [illegible] تو الا اللہ کے حرف [illegible] کہے اس طریقہ کو [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

اسم ذات کا پاس انفاس :۔ اس [illegible] بیان [illegible]

بعد بائیں زانوں کی طرف اتنا سر جھکائے کہ پیشانی گھٹنے کے قریب پہنچ جائے اور وہاں سے
باآواز بلند خوش لحنی کے ساتھ لفظ لا الٰہ شروع کر کے سر کو دائیں زانو کے اوپر سے لاتے
ہوئے دائیں مونڈھے تک پھرا ہوا لائے اور سانس کو اتنا روکے کہ جتنی دیر میں بائیں طرف جا
تک سکتی ہیں۔ اس کے بعد سر کو تھوڑا سا پیٹھ کی طرف کھینچ کر یہ تصور کرے کہ تمام خطرات
ماسوا اللہ کو میں نے پس پشت ڈال دیا اور اس کے بعد سر کو بائیں طرف کی چھاتی کے نیچے
جھکا کر جہاں کہ دل واقع ہے الا اللہ کی ضرب لگائے اور یہ تصور کرے کہ میں نے عشق
الٰہی کو دل میں بھر لیا ٭

لا الٰہ کو نفی کہتے ہیں اور الا اللہ کو اثبات کہتے ہیں۔ اس واسطے اس ذکر کا نام نفی
اثبات ہوا۔ نفی کے وقت آنکھیں کھلی رہنی چاہئیں اور اثبات کے وقت بند۔ اسی طرح سے یہ ذکر
دو سو مرتبہ کرنا چاہئے۔ اس ذکر کا نام ذکر چہار ضربی ہے۔ اس ذکر میں نو دفعہ لا الٰہ الا اللہ
کہنے کے بعد دسویں مرتبہ محمد رسول اللہ بھی کہنا چاہئے۔ اس کے بعد بطریق سابق تین
بار کلمہ طیبہ اور ایک بار کلمہ شہادت پڑھنا چاہئے ٭

ضروری ہدایت:- اس ذکر میں یہ ہدایت ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم کے وقت
لا معبود کا تصور کرے۔ یعنی جب زبان سے لا الٰہ کہے تو خیال کرے کہ لا معبود یعنی
نہیں ہے کوئی معبود۔ اور درمیانی تعلیم والا نفی کے وقت لا مقصود یا لا مطلوب کا
تصور کرے۔ اور انتہائی تعلیم والا لا موجود کا تصور کرے ٭

ذکر اثبات مجرد:- نفی و اثبات یعنی لا الٰہ الا اللہ کے ذکر کے بعد دو زانو بیٹھ جائے اور اثبات
مجرد کا ذکر کرے۔ اثبات مجرد صرف الا اللہ کو کہتے ہیں۔ اس ذکر کے وقت کمر سیدھی رکھے
اور سر کو دائیں کندھے کی طرف سیدھا رکھ کے پوری قوت سے دل پر یعنی بائیں چھاتی کی طرف
الا اللہ کی ضرب لگائے اور یہ تصور رکھے کہ سوائے اللہ کے کچھ موجود نہیں ہے۔ اور
میرے سوا اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں ہے ٭

جن کے بدن میں خون کم ہو یا قلب و دماغ میں کمزوری ہو وہ حبس دم اور ذکر جہر ہرگز نہ کریں بلکہ ذکر خفی پر اکتفا کیا جائے۔ ورنہ طرح طرح کے امراض کا اندیشہ ہے +

میں نے ذکر حدادی اور ذکر آرہ اور ذکر جاروب وغیرہ کو اس واسطے یہاں بیان نہیں کیا کہ میرے خیال میں آج کل لوگوں کی جسمانی قوت ان اذکار کے قابل نہیں ہے اور صرف اسم ذات کا پاس انفاس کافی سمجھتا ہوں۔ یا شغل سلطانا محمودا و شغل سلطانا نصیرا و شغل سلطان الاذکار۔ کہ یہ سب چیزیں ترقی روحانیت و تسکین احساس کے لئے بالکل کافی ہیں +

شغل نصیرا: یہ خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحؒ کا خاص شغل ہے اور اس سے خطرات قلب دور ہو جاتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ صبح یا شام کے وقت قبلہ رخ دو زانو بیٹھ جائے اور دل کو یکسو کر کے دونوں آنکھوں کی نظر ناک کی چونچ پر جمائے اور پلک نہ جھپکنے دے اور اس دید میں ایک نور غیر معین کا تصور رکھے۔ شروع شروع میں آنکھوں میں درد ہوگا اور پانی بہیگا مگر رفتہ رفتہ عادت ہو جائے گی +

شغل محمودہ: اس شغل میں نظر دل کو دونوں بھووں کے اس جوڑ پر جمانا چاہئے جو ناک کے اوپر اور پیشانی کے نیچے واقع ہے۔ یہ ذرا مشکل ہے مگر فائدہ بہت ہے۔ ہندو فقرا کے ہاں بھی اس طرز کا ایک شغل ہے جس کو ترکٹی کہتے ہیں

ان اشغال سے نماز کے اندر خطرے نہیں آتے اور یہ بہت مجرب علاج دفع خطرات کا ہے۔ خصوصاً شغل نصیرا +

سلطان الاذکار: سلطان الاذکار کے طریقے بہت سے ہیں۔ مگر آسان طریقہ یہ ہے کہ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ منھ۔ ہاتھ کی انگلیوں سے بند کر کے سانس کو ناف کے نیچے سے کھینچے اور دماغ تک لیجائے اور وہاں اس کو روک لے اور طاقت کے

اور منھ بند کرلے اور جب اندر کا سانس لے تو لفظ اللہ کو ادا کرے اور سانس کو اتنا کھینچے کہ تمام پیٹ اور چھاتی سانس سے بھر جائے اور یہ تصور کرے کہ اللہ تمام باطن میں محیط ہے اس کے بعد آہستہ سے سانس کو ناک کے راستہ باہر لائے اور باہر لاتے وقت ہُو کہے یعنی اندر کے سانس میں اللہ اور باہر کے سانس میں ہُو کہنا چاہئے +

ذکر اسمِ ذات کی اقسام اسم ذات کا ذکر یک ضربی بھی ہوتا ہے اور دو ضربی بھی اور سہ ضربی بھی۔ اور چہار ضربی بھی۔

یک ضربی کا ذکر یہ ہے کہ لفظ اللہ کی پوری قوت سے بآواز بلند دل پر ضرب لگائے اور دو ضربی میں اول ضرب روح پر اور دوسری دل پر اور سہ ضربی میں اول دائیں زانو پر دوسری بائیں زانو پر۔ تیسری روح پر چوتھی دل پر اور چہار ضربی میں اول دائیں زانو پر دوسری بائیں زانو پر تیسری روح پر۔ چوتھی دل پر۔ اس ذکر میں آنکھیں بند رہنی چاہئیں +

حبس دم - یہ شغل تمام صوفیوں میں ضروری مانا گیا ہے۔ خصوصاً چشتی اور قادری اس کے مفید ہونے کے زیادہ قائل ہیں۔ مگر نقشبندی اس کو چنداں ضروری نہیں سمجھتے تاہم اس کے اچھے ہونے کے قائل ہیں +

حبس دم سانس کی ایک ورزش ہے۔ اس سے علاوہ روحانی ترقی کے جسمانی قوت کو بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔ حبس دم کے بعض طریقوں سے میں نے سل و دق کے بیماروں کا علاج کیا ہے اور بہت مفید پایا۔ مگر بیماروں سے ان کی طاقت کے موافق حبس دم کرانا چاہئے۔ ورنہ ذرا سی بے احتیاطی میں مرض کی حرارت بجائے کم ہونے کے اور بڑھ جاتی ہے۔ حبس دم کا طریقہ یہ ہے کہ ناک اور منہ بند کرکے سانس روکنے کی طاقت بڑھائی جائے اشغال میں اس کے طریقے جداگانہ ہیں +

ہدایت - اس خطرہ سے ہر شخص کو آگاہ رہنا چاہئے کہ کمزور سینہ والے لوگ زیادہ

بھی ہیبت کی سی بناتا ہے اس واسطے اس کو شغل ہیبت کہتے ہیں ✤

ضروری ہدایت:- میں نے آسان طریقے سے اذکار و اشغال لکھے ہیں اور عام الفاظ میں ان کی ترکیب لکھی ہے۔ پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جسمانی طاقت اور افکار دنیا کی کثرت و قلت کا خیال کر کے ان کو کیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہر شخص دنیا کا کاروبار ترک کر کے رات دن یہی اشغال کرنے شروع کر دے۔ بلکہ ایک وقت اس کام کے لئے مقرر کر لینا چاہئے۔ نیز کسی واقف کار درویش سے زبانی پوچھ بھی لینا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کتاب کے الفاظ اچھی طرح سمجھ میں نہ آئیں اور شغل میں غلطی ہو جائے۔ کیونکہ غلطی ہو جانے سے بعض اوقات حواس خراب ہو جاتے ہیں اور انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً کمزوری دماغ کی حالت میں حبس دم کے اشغال مناسب نہیں ہیں اور پھیپھڑے کی خرابی ہو تو جہر کا ذکر نقصان پہنچاتا ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کرے آپ سمجھ لو کہ وہ کیسا فقیر ہے اور مصلحت شناسی فہم کی صلاحیت اس میں نہیں ہے ✤

مراقبے

اب میں چند مراقبوں کے طریقے لکھتا ہوں لیکن پہلے سمجھ لینا چاہئے کہ مراقبہ ایک خاص صورت کا نام ہے جو تصور کی قوت بڑھانے اور کسی خاص چیز کی تاثیر [illegible] حاصل کرنے کو بنائی [illegible] عربی زبان میں رقبہ گردن کو کہتے ہیں۔ چونکہ مراقبہ گردن جھکا کر کیا جاتا ہے اس واسطے اس کا نام مراقبہ رکھا گیا ہے۔ اور چونکہ خطرات نفسانی و شیطانی سے محفوظ رہنے اور معشوق قلب کو ایک رقیب کی طرح اغیار کے خیالات سے بچانے کے لئے یہ مشق کی جاتی ہے اس واسطے بھی اس کا نام مراقبہ ہے ✤

موافق کچھ دیر روکے رکھے اور جب سانس کو ناف کے نیچے سے اوپر لیجانے لگے۔ تو اللہ سانس میں کہے اور جب دماغ میں سانس کو حبس کرے تو ھُو کہے اور ھُو کی قوت لطیفہ اخفے پر دل کی آنکھ کو لگائے رکھے۔ لطیفہ اخفے ام الدماغ میں ہے اور جب حبس دم کی طاقت ختم ہونے لگے تو ناک کی راہ سانس چھوڑ دے۔ اور دوبارہ ایسا ہی کرے۔ اس طرح شروع شروع میں صرف دو چار بار کرنا چاہئے۔ اور رفتہ رفتہ مدت حبس دم کو بڑھانا چاہئے ۔

شغل صوت سرمدی :۔ سلطان الاذکار کی ایک قسم شغل صوت سرمدی ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ آنکھ۔ کان۔ ناک بند کرکے تصور کرے کہ پانی گرنے یا شہد کی مکھیوں کی بھنبھنانے کی آواز آرہی ہے۔ پانی گرنے کی آواز کے تصور میں یہ خیال کرنا چاہئے کہ کسی اونچی جگہ سے نیچی جگہ پانی یکساں گر رہا ہے ۔

اسی تصور کی حالت میں اسم ذات کا شغل بھی قلب اور لطیفہ اخفے میں جاری رکھنا چاہئے۔ رفتہ رفتہ تصور کی یہ آواز اصلی آواز بن جائیگی اور غیب کی وہ صدا سنائی دینے لگے گی جسکی طلب ہے مجبور کرتے ہے اور جس کو حضرت موسےٰ نے کوہ طور پر سنا تھا ۔

شغل میت :۔ سلطان الاذکار کی ایک قسم کو شغل میت بھی کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لیٹ کر دونوں پاؤں کے انگوٹھے آپس میں باندھ لیے جائیں اور یکسو ہو کر اور حبس دم کر کے زیر ناف سے لفظ اللہ کو سانس کے ساتھ اٹھایا جائے اور ام الدماغ میں سانس کو روک کر صوت سرمدی کا تصور کیا جائے اور کچھ دیر کے بعد جبکہ حبس دم کی طاقت ختم ہو سانس ھُو کہکر ناک کے راستہ چھوڑ دیا جائے ۔

اس میں چونکہ شاغل مردہ کی طرح بے حس و حرکت ہو کر شغل کرتا ہے اور صوت

ہمہ اوست کا مراقبہ:- اس میں آیت ھُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاھِرُ وَ الْبَاطِنُ کا تصور کیا جاتا ہے۔ کہ کچھ بھی نہیں ہے مگر وہی ایک ذات ہے کہ اول بھی وہی۔ آخر بھی وہی۔ ظاہر بھی وہی۔ باطن بھی وہی ✤

مراقبہ قرب خاص:- اس میں آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کا تصور کیا جاتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ہم انسان کی رگ جان سے بھی قریب ہیں۔ اس مراقبہ میں ذات الٰہی کو اپنے بالکل قریب تصور کرنا چاہیے ✤

وحدت وجود کے مراقبے:- کئی ہیں جن میں آیت اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔ اور کَانَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا اور وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ۔ اور فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ اور ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وغیرہ ہیں ✤

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ تم جدھر رُخ کرو اسی طرف خدا کی ذات ہے۔ اور دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات تمہاری نگہبان ہے۔ اور تیسری کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہر شے کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور چوتھی کا ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفوس کو کیوں نہیں دیکھتے اور پانچویں کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ اللہ جیتا جاگتا اور سب کو قائم رکھنے والا ہے ✤

مراقبہ ہوا:- یہ تخلیہ کی حالت میں اس طرح کیا جاتا ہے کہ آنکھیں کھول کر سامنے کی ہوا اوپر کی خالی فضا کو دیکھتے ہیں۔ اور پلک نہیں جھپکنے دیتے۔ اس سے دل میں حرارت عشق اور آنکھ میں ایک عجیب اثر حیرت پیدا ہو جاتا ہے ✤

مراقبہ ہوا کا ایک یہ طریقہ بھی ہے کہ ایک تاریک حجرے میں آنکھ کھول کر خلا کو دیکھیں اور نظر جما کر بغیر پلک کے جھپکانے رکھے ✤

مراقبہ ہمہ اوست ہی ہو میں نہیں ہوں:- مراقبہ میں یہ تصور بڑھایا جائے کہ تم ہی ہو میں نہیں ہوں اللہ ہی ہے اور میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ تو اس سے بہت جلد نفس مغلوب ہو جاتا ہے اور مشاہدات قرب ظاہر ہونے لگتے ہیں ✤

ہر مراقبہ میں دوزانو بیٹھنا گردن جھکانا اور آنکھیں بند کر کے تصور کرنا ضروری ہے۔
اس واسطے میں ایک مراقبہ کی کیفیت مفصل لکھ دیتا ہوں اور باقی مراقبوں کا سرسری ذکر
کر دینا کافی ہے۔ اسی پر سب مراقبوں کو قیاس کر لینا چاہئے ؛

مراقبہ اسم ذات :۔ دل کی پراگندگی اور خرابی تین وجہ سے ہوتی ہے ایک تو نفس
کی خرابی سے کہ وہ ہر وقت قلب کو تباہ کرنے اور بگاڑنے کی جستجو کرتا رہتا ہے۔ دوسری ناگہانی
تعلقات دنیا کی کثرت کے سبب دل پریشان رہا کرتا ہے۔ پس ایسی حالتوں میں اسم ذات
کا مراقبہ کرنا چاہئے۔ اس سے طمانیت قلب اور تسکین احساس کی نعمت حاصل ہوگی ؛

اس کا طریقہ یہ ہے کہ باوضو دوزانو قبلہ رخ ہو کر بیٹھ جانا چاہئے اور اعوذ باللہ اور بسم اللہ
پڑھ کر گردن جھکا کر اسم ذات کا تصور کرے یعنی اسم اللہ کا تصور جمانا چاہئے۔ اس سے
نفس کی شرارت جاتی رہے گی اور ناگہانی خطرات کی کثرت ہو تو اسمائے صفات
امہات یعنی یا سمیع یا بصیر یا علیم کا تصور کرے۔ اور تعلقات دنیا کی کثرت کے سبب
خطرے پیدا ہوتے ہوں تو اپنے مرشد کا تصور کرے ؛

شروع شروع میں مراقبہ ایک تکلف اور تکلیف معلوم ہوگا مگر رفتہ رفتہ عادت ہو
جائیگی اور تصور کی قوت اس کو کمال تسکین احساس تک پہنچا دیگی ؛

دیدار الٰہی کا مراقبہ :۔ اس کے لئے ترکیب مذکور کے موافق آیت اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی
کا تصور کرے۔ اس آیت کے معنے یہ ہیں کیا جانتا نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے پس مراقبہ میں
یہ خیال کرنا چاہئے کہ اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اور پھر اس کے بعد جب مشق بڑھ جائے تو یہ
تصور کرے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں ؛

خدا سے یکجائی کا مراقبہ :۔ اس مراقبہ میں ایک آیت کا تصور کرنا چاہئے۔ وَھُوَ مَعَکُمْ
اَیْنَمَا کُنْتُمْ اللہ تمہارے ساتھ ہے تم کہیں بھی ہو۔ اس تصور میں خدا کی معیت اور یکجائی
کے خیال کو اس قدر بڑھایا جائے کہ خدا اپنے ساتھ نظر آنے لگے ؛

تصور میں یہی فقرہ جما یا جاتا ہے۔ تم ہی ہو میں نہیں ٭

مراقبہ کا فلسفہ: حاصل مقصد یہ ہے کہ مراقبہ تصور کی ایک ورزش ہے جو شخص اس ورزش کو جانتا ہے وہ تسکین احساس سے محروم نہیں رہتا اور جب اس کی مشق تصور بڑھ جاتی ہے تو ہر دینی و دنیاوی کام میں اس کی قوت تصور مدد دیتی ہے ٭

انجام

اس مختصر تحریر میں جس قدر لکھا جا سکتا تھا لکھ دیا گیا۔ اس کے بعد کتاب پیر بھائی کے حصوں میں اور تفصیل و تشریح مذکور ہوگی۔ جس میں ہر سلسلہ اور ہر خاندان کے اذکار و اشغال اور مراقبوں وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ جب یہ بڑی کتاب تیار ہو کر شائع ہوگی تو ناظرین درس تصوف کو سلسلہ وار سمجھ لیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

۱۷۔ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ ہجری
یوم چہار شنبہ مطابق
۲۹۔ دسمبر ۱۹۲۰ء

فاطمی دعوت اسلام

از مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ

یہ کتاب ابھی تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں سُنّی شیعہ بنی فاطمہ کے تبلیغ اسلام کے کارنامے جمع کئے گئے ہیں۔ دنیا کی کسی زبان میں اس خاص طرز کی کوئی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی ۔

اس میں دعوت اسلام کی ضرورت اور دعوت و اشاعت اسلام کے طریقے مفصل طور سے بتائے گئے ہیں + اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کا پورا بیان ہے اور حضرت علیؓ و حضرت امام حسنؓ و حضرت امام حسینؓ کی دعوت اسلام کی کیفیت ہے اور غم حسینؓ کے ذریعے دعوت اسلام اور تعزیوں کے ذریعہ اشاعت اسلام کا حال ہے اس کے بعد قادریہ مشائخ کے ذریعے دعوت و اشاعت کا بیان ہے اور موجودہ دور کے بہت سے مشائخ قادریہ کا تذکرہ ہے۔ پھر سہروردیہ رفاعیہ سلسلوں کے ذریعہ اشاعت اسلام کا حال ہے پھر چشتیہ خاندان کے دعوتی کارنامے ہیں اور چشتیوں کی ان تمام حکمت عملیوں کا ذکر ہے جو اشاعت اسلام کے لئے مفید ہوئیں مثلاً موسیقی۔ قبر کا غسل۔ قبر کا طواف۔ خواجہ کی چھڑیاں خواجہ کی بھی وغیرہ۔ پھر موجودہ اور گزشتہ مشائخ چشتیہ کی سرگزشت اشاعت اسلام ہے۔ پھر بوہروں اور آغا خانیوں کی اشاعت اسلام کا تذکرہ ہے۔ اور ان کی تمام خفیہ رازداری طشت از بام کرکے دکھا دیئے ہیں پھر امام شاہی سلسلہ اور پیر مشائخ کے طریقے اور پیر نام پنتھ کی اشاعت اسلام کی کیفیت

جو مسلمان اس کتاب کو تمام و کمال پڑھ لیگا اسلام کا مشنری اور داعی بن جائیگا قیمت مجلد

ملنے کا پتہ:۔ کارکن خواجہ ڈپو دہلی سے منگائیے۔

[illegible] باسمعین

إِنَّا مِنَ اللّٰهِ - إِنَّا إِلَى اللّٰهِ - إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ مَبْعُوثُونَ ۝

کم ٹو موت

موت کی طرف آؤ

زیست دُنیا کی فنا اور حیات آخرت کی بقا سمجھانیوالی کتاب

جسکا پڑھنا زندہ رہنا سکھاتا ہے!

کفن بر سر بستہ حسن نظامی

نے لکھکر لکھواکر صورت بنائی

اور

کارکن "خواجہ ڈپو دہلی"

نے

بماہ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۰ء

میں دوسری بار

حافظ محمد سعید ہاشمی نے مطبع ہاشمی دہلی میں طبع ہوئی

بار ثانی

(روپی مروجی)

قیمت ۸؎

کم ٹو موت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جس قوم کا زوال قریب ہوتا ہے وہ موت کے وقت کو بھول جاتی ہے یا جان بوجھ کر مرنے کا خیال سامنے نہیں آنے دیتی۔ تاکہ عیش زندگی کرکرا نہ ہو۔ قلعہ دہلی کے قصے مشہور ہیں کہ ان مغل بادشاہوں کی اولاد جنہوں نے ہمیشہ دریائے مرگ کے کنارے کھڑے ہو کر ملک فتح کئے اب آخر زمانہ میں ایسی ہو گئی تھی کہ اگر کوئی اسکے سامنے کلمہ توحید پڑھتا تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ تاکہ وہ چیز جو مرتے وقت پڑھی جاتی ہے کانوں میں نہ پڑے۔ سورۂ یٰسین کو قلعہ دہلی کی بیگمات شادی کے نام سے یاد کرتی تھیں یعنی مار ڈالنے والی سورت اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ وہ جب درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی زیارت کو آتے تو محمد شاہ بادشاہ کے مقبرہ پر پردے ڈلوا دئے جاتے تھے کیونکہ امیروں وزیروں کو خوف تھا کہ کہیں بادشاہ کی نگاہ بادشاہ کی قبر پر نہ پڑ جائے اور زندگی کے انجام کار کا دھیان انکو تکلیف نہ دے ❊

نتیجہ یہ ہوا کہ موت ان سب کو کھا گئی۔ عیش و عشرت ملیا میٹ ہو گئی اور آج انکی خوابگاہوں میں یورپ والے جوتیوں سمیت سیر کرتے پھرتے ہیں

۷۸۶

عقبیٰ کے دوست

جناب مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایونی کی خدمت میں آخرت کی نسبتِ ازلی اور محبتِ ابدی کی یادگار میں پیش کی جاتی ہے ٭

دہلی۔ زین بسیرا
ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ

حسن نظامی

تھے اس واسطے ان میں نہایت مستعدی، جفاکشی اور استقلال کے
اوصاف پائے جاتے تھے۔

اب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ کالر نکٹائی لگا کر بوٹ پہن کر ہوا
خوری کو نکلتے ہیں اور رستہ میں کوئی جنازہ مل جاتا ہے تو منہ پھیر لیتے
ہیں ہمکو ڈر ہوتا ہے کہ مرنے کا خیال ہمارے دماغ کو مضمحل کر دے گا
اور ہم کچہری کا کام اچھی طرح نہ کر سکیں گے۔ مگر کاش ہمکو بہادر شاہ
کی مذکورہ مثال سے عبرت ہو جنہوں نے دماغ کی حفاظت میں ملک غارت
کر دیا یقین مانو اگر ہم موت کے خوف سے اسکو بھولنا یا بھلانا چاہیں گے
تو ہماری ہستی ناپید ہو جائے گی اور فنا ہمارے بقائے ظاہری کو نابود کر دیگی

یہ جتنے امیر اور روپے والے لوگ ہیں یا یہ جسقدر تاج تخت کے مالک
کہلاتے ہیں موت کے نام سے ان کا دم فنا ہوتا ہے۔ مرنے کا ذکر کرو تو انکے
منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں بات کاٹ کر اور ذکر کرنے لگتے ہیں لیکن ان بدنصیبوں کو خبر نہیں
موت کا وقت قریب آ رہا ہے وہ ایک دن انکی گردن مروڑ کر رکھدے گا۔ ان کا سب یہ مال
دولت تاج و تخت دوسروں کے حصہ میں تقسیم ہو جائے گا۔

اس دن یہ چار گز کپڑے کے کفن کو دوسروں کے محتاج ہوں گے
اور جو لوگ آج انکی خیر خواہی میں پسینہ پر خون گرانا چاہتے ہیں جھوٹی مخبریاں
کر کے ان کے ہاتھوں سے بے گناہوں پر ظلم کراتے ہیں وہ بیک بینی و دو گوش
قبر کی اندھیری کوٹھری میں پھینک کر چلے آئیں گے جہاں نہ برقی لیمپ ہوں گے
نہ گیس کے ہنڈے البتہ دوزخ کی آگ کے شعلوں اور قہر خدا کے شراروں
اور عذاب کے فرشتوں کی چمکتی ہوئی خوفناک آنکھوں کی روشنی ضرور ہو گی

یہ بڑے خوف کا مقام ہے۔ انسان کو ہر وقت آخری منزل کا کھٹکا دل میں رکھنا چاہیئے۔ ہمارے آقائے نامدار مقبول پروردگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص رات دن میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرے وہ شہید کا درجہ پائے گا۔ اسکی وجہ صاف ظاہر ہے کہ شہید کو تو ایک دفعہ موت کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔ مگر جو شخص رات دن میں چالیس دفعہ موت کا خیال کرے تو وہ گویا ہر بار موت کا ذائقہ چکھتا ہے۔ اس لئے اس کا رتبہ شہید کے برابر ہو تو کیا تعجب ہے

ہمارے رسول صلعم موت کو اس قدر قریب جانتے تھے اور ہر وقت مرنے کے لئے اتنے آمادہ رہتے تھے کہ اگر آج کل کے آدمی اس کا ذکر سنیں تو حیران ہو جائیں۔ ایک دفعہ آپ نے چاروں اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے دریافت کیا کہ تم موت کو کتنا قریب سمجھتے ہو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کی صبح کی نماز پڑھنے کے بعد مجھکو امید نہیں رہتی کہ ظہر کی نماز تک زندہ رہوں گا۔ فاروق اعظمؓ نے کہا کہ میں ظہر پڑھ کر عصر کا وقت ملنے سے ناامید ہو جاتا ہوں۔ عثمان غنیؓ بولے مجھکو عصر کے بعد مغرب کی آس باقی نہیں رہتی۔ حیدر کرارؓ نے التماس کی کہ مغرب ادا کرنے کے بعد عشا کا بھروسہ نہیں رہتا۔

یہ سنکر ہمارے آقا رسولؐ نامدار نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے۔ جب میں نماز میں دائیں طرف سلام پھیرتا ہوں تو مجھکو بائیں جانب گردن پھیرنے کا یقین نہیں رہتا اور خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس سے پہلے موت آجائے

جنکو مرنے کا اتنا یقین تھا وہ آج کا کام آج ہی ختم کر دینا چاہتے

جو موت کے فرشتے کو اندر آنے سے روکے۔ اس گھڑی کس کی مجال ہے کہ ڈپلومیسی اور پالیسی سے موت کی بلا کو ٹالے۔ سب لن ترانیاں ہیچ ہو گئیں ساری طراریاں عاجز آ گئیں۔ قصہ مختصر موت یاد رکھنے کی چیز ہے ہندوستانیوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کو وقت آخر بار بار یاد دلایا جائے اگر ان کو کام کا آدمی بنانا ہے تو صاف صاف کہنا چاہیئے کہ جتنی زندگی ہے اسکو غنیمت جانو اور نیکی و پارسائی سے کام شروع کرو۔ وقت ضائع نہ کرو۔ کل خبر نہیں کیا پیش آ جائے جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرو۔

دولہا دلہن کی موت

جودت نصرتی اکیس سالہ ترک زادہ ایڈریانوپل کے محاصرے سے ایک دن پہلے اپنی سسرال میں خوش و خورم بیٹھا سگرٹ کا دھواں اُڑا رہا تھا اسکی شادی کو پورے سات دن بھی نہیں ہوئے تھے ارمان بھری دلہن کے سوا کمرہ میں کوئی نہ تھا۔ ترکوں کے دستور کے موافق یہ لڑکی بھی گانا اور باجا بجانا جانتی تھی اسلیئے شوہر کی خوش باشی کے خاطر اپنے اپنا سریلا قانون باجا بجانا شروع کیا۔

جودت باجے کی مستانہ نواؤں سے جھومنے لگا اسنے اپنی کرچ کو زمین پر ٹیک کر بغل میں دبا لیا۔ اور اپنی گیسو دراز بیوی سے جنگی گیت گانے کی فرمایش کی۔ شرمیلی ترکن نے مسکرا کر دیکھا مگر سمجھ میں آنے والی آواز سے "بسر و چشم" کہا اور بولی۔ آپ یہاں بھی قتل گاہوں کو نہیں بھولتے۔ جودت نے

لوحِ محفوظ اور افقِ مستور کے حجابات اُٹھ جائیں تو ہیں ان کو وہ سب کچھ دکھا سکتا ہوں جو میری آنکھیں دیکھتی ہیں مگر قدرت ان پردوں کی ڈوری پکڑے کھڑی ہے کسی کو چھپے ہوئے بھید تک جانے نہیں دیتی۔ اور جو جا سکتے ہیں انکو کہنے نہیں دیتی کس بھول میں ہو۔ وقت آخر آن پہنچا۔ کوچ کی تیاری کرو۔ ریل کا لاین کلیر ہو چکا اور تمنے اب تک بستر بھی نہیں باندھا۔

یہ جو عشرت خانوں میں کہانی دار پلنگ پر پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ یہ جو تفریح اور ہنسی خوشی کو باعث زندگانی سمجھتے ہیں یہ جو یورپ میں بیٹھ کر تمہارے لیے کتابیں لکھتے ہیں کہ خوب ہنسو عمر دراز ہوگی۔ موت کا فکر پاس نہ آنے دو ہمیشہ سلامت رہوگے یہ سب نزع کی بے قراری بہت جلد گرفتار ہونیوالے ہیں اسوقت ان کی زبان بند ہو جائے گی۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی ایڑیاں رگڑیں گے۔ ٹانگیں پیچھیں اور بے کلی سے کبھی سمیٹیں گے کبھی پھیلائیں گے۔ یاروں، دوستوں، بال بچوں۔ مال دولت۔ گھر بار کو حسرت و مایوسی سے دیکھیں گے۔ سانس سینے میں ٹھوکریں کھائے گا۔ بدن ٹھنڈا پڑ جائے گا دم کھینچ کھینچ کر آنکھوں میں آئے گا اور ان میں نشتر چبھوئے گا جس طرح یہ زندگی میں دوسروں کی دل آزاریاں کرتے تھے۔ نام نمود کے لئے پرائی جانوں کو بے گناہ برباد کرتے تھے۔ تاج و تخت کی ہوس میں دغا فریب ظلم و ستم۔ جفا کاری و خونریزی انکا شیوہ ہو گیا تھا۔ آج ان کو معلوم ہوگا کہ جس سے ڈرتے تھے گھبراتے تھے۔ چھوت کا انتظام کرتے تھے۔ صفائی اور ڈس انفکٹ پر توکل کرتے تھے۔ وہ چیز کسی سے نہ رکی اور آ گئی اب یہ سارا ساز و سامان دھرا رہ جائے گا۔ اب کوئی ڈاکٹر نہیں ہے جو جان کو بچائے اب کوئی پہرہ والا نہیں ہے

اندھیرے میں شعلے چمکے اور سامنے کی لائن میں افرا تفری اور بھاگ دوڑ ہونے لگی۔

صبح کا نور نمودار ہوا۔ بلغاری لشکر نے ترکوں کو اپنے مورچوں پر سنگینیں مارتے دیکھا وہ گھبرا گئے۔ اوسان جاتے رہے۔ کپتان جودت نصرتی اور اسکی بیوی گھوڑوں پر سوار تلواریں اٹھائے ساتھیوں کو للکار رہے تھے۔

اسوقت بڑی گھمسان کا رن تھا۔ دلہن ترکن کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پستول سے اپنے دولہا پر حملہ کرنے والوں کا خاتمہ کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک ظالم بلغاری نے بندوق پر چڑھی ہوئی سنگین پیچھے سے اس مرادوں والی ناشاد دلہن کی کمر میں ماری جو سینے کے پار نکل گئی۔ مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے پستول چھوٹ پڑا۔ اور بلبلا کر سینے کو تھام لیا گیا۔ چند سکنڈ کے بعد وہ چکرا کر گھوڑے سے گری۔ اور موت کے وقت کے بے ربط الفاظ میں اتنا منہ سے نکلا۔ جودت خدا حافظ۔

ترک سوار اپنے افسر کی بیوی کا یہ عالم دیکھ کر چاروں طرف سے گھر کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ اور دشمن پر غضب ناک حملے کرنے لگے۔ جودت گھوڑے سے کود پڑا۔ عروسی پلنگ پر لیٹنے والی کی لاش کو خاک سے اٹھا لیا۔ پسینہ آلود پیشانی جسپر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی چومی۔ سنگین خوردہ سینے کو سینہ سے لگایا اور بے قرار آنکھوں سے آسمان کو دیکھا وہ خدا سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس قربانی کو قبول کرے۔ اس کا دل عشق اور مایوسی میں دیوانہ ہو گیا تھا مگر اسنے دیکھا یہ وقت غفلت کا نہیں ہے۔ دشمن ساتھ کے سپاہیوں کو ختم کئے دیتا ہے۔ اسلئے اسنے لاش دو سواروں کے سپرد کی کہ جس طرح ممکن ہو قلعہ میں پہنچاؤ۔ اور خود تلوار اٹھا کر زخمی شیر کی طرح دشمن کی صفوں میں گھس گیا

اپنی چھوٹی سی سرخ مونچھ کو مروڑا۔ اور کہا۔ ہاں میں عشرت خانوں کی بہار میں جنگ سے خارستان کو یاد رکھنا قومی فخر سمجھتا ہوں۔ تم انگلیوں سے قہوہ قانون کے نغموں میں میری خوراک پیدا کریں۔ اور تم اپنی شیریں آواز سے اس پر نمک ڈالو۔

قانون کے بھاری سُر زنان خانے میں گونجنے لگے۔ اور ترکن نے یہ گیت شروع کیا جب جواں مردوں نے تیغ کے قبضہ پر ہاتھ رکھا دشمن تھرا گیا۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔ اور جب توپوں کو ہی دکھائی گئی۔ پہاڑ اور جنگل حواس باختہ ہو گئے۔ ہمارے سپاہیوں نے آج خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے کھرے کھرے قہوہ کی پیالی پی۔ کیونکہ وہ جان سے ہاتھ دھو کر میدان میں نکلے تھے۔

جودت اس نغمہ سرائی میں محو تھا اور باہر اسکو کوئی شخص آواز دے رہا تھا۔ قانون کی آواز ذرا مدھم پڑی تو اُسنے سنا کوئی اُسکو پکارتا ہے۔ فوراً باہر نکلا۔ دیکھا سرکری پاشا کا ایڈیکانگ ہے۔ اُسنے کہا نصرتی دشمنوں کی فوجیں قریب آگئیں سرکری آفندی نے یاد فرمایا ہے۔ کہ کپتان جودت نصرتی جس حال میں ہوں فوراً ہمراہ لیکر آؤ۔

جودت اُلٹے قدموں اندر آیا۔ بیوی سے رخصت ہوا۔ کرچ لگا ٹوپی سر پر رکھا ایڈیکانگ کے ساتھ چل دیا۔

غنیم نے ایڈریانوپل کو گھیر لیا تھا۔ شدت سے گولہ باری ہو رہی تھی پچھلی رات تو کہیں ذرا خاموش ہوئی تھیں کہ اتنے میں قلعے کے باہر کچھ سوار نہایت سکوت کے عالم میں دشمن کی فوج کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دئے۔ یکایک بندوقوں کے فیر کی آواز آئی۔

انھوں نے دیکھا کہ ایک سترہ سالہ کنیز مظلوم صورت بنائے سہمی ہوئی کھڑی ہے
کبھی شکستہ کنگر کو دیکھتی ہے کبھی بادشاہ کی صورت کو۔ شاہی سواری رک گئی۔ پوچھا
گیا کیا حال ہے۔ بولی شیشۂ کامرانی ٹوٹ گیا جہاں سلطانی امید کے شکستہ
شیشوں کو جوڑ دیا کرتا ہے۔ دیکھتی ہوں یہ شیشہ بھی جڑتا ہے یا نہیں۔ لطیفہ پسند
بادشاہ کو یہ برجستگی اور حاضر جوابی بھا گئی۔ فرمایا نام کیا ہے عرض کیا نشیمن بلبل۔
اب تو بادشاہ پھڑک گئے۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جھک کر آداب بجا لائی اور
ہاتھ باندھ نظریں نیچی کر دو زانو بیٹھ گئی۔ ارشاد ہوا بلبل کا نشیمن ایک جگہ نہیں رہتا
آج اس گلستاں میں کل اس چمن میں پرسوں کسی اور غنچہ پر۔ عرض کی جہاں پناہ
کے اقبال سے یہ لونڈی وہ گل ہے جسکو دیکھ کر بلبل پھر کسی پھول کے پاس نہیں
جاتا ایک جگہ نشیمن بنا لیتا ہے۔

حکم ہوا اس کو محل میں لیجاؤ۔ نہلاؤ۔ دھلاؤ۔ حرم شاہی بناؤ۔ چند روز
کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ گل خانم تمام محل کی بیگمات سے زیادہ منظور نظر
بن گئی۔ ایک لمحہ کے لئے بادشاہ اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔

ایک برس تک یہی عالم رہا۔ دوسرے سال سردی کے موسم میں گل خانم
بادشاہ کے پاس تھی۔ کروٹ جو لی تو سینہ میں کوئی چیز چبھی اور [illegible] جلن
ہونے لگی۔ پاس [illegible] ضبط کیا مگر نہ ہو سکا۔ [illegible]
نکل گئی۔ بادشاہ گھبرا کر پوچھنے لگے گل خانم کیا ہوا۔ [illegible] جہاں پناہ
جی فرمائیں کوئی تردد کی بات [illegible] کے پاس کوئی چیز [illegible]
حضور نے اسی وقت پہرے والے کو آواز دی لونڈیاں حاضر [illegible]
قریب لائی گئی۔ بچھونے کو دیکھا تو ایک چھوٹا سا [illegible] چار پائی میں [illegible]
رکھا ہوا تھا کہ نوک کروٹ لینے والے کے چبھ جاتے۔ تو گل خانم کی گرم صدری

اس کی زبان پر ایک نعرہ تھا۔

میں توحید کا فدائی ہوں میں نے اپنی زندگی کی سب امیدیں ابھی وحدت کی قربانگاہ میں چڑھائی ہیں۔ اب میرے دل میں زندگی کی محبت نہیں ہے اب میں عربی رسول کی آبرو پر نثار ہونا چاہتا ہوں ہتھیارو۔ میرے ساتھ چلو جنت میں میری پیاری کا دل تنہائی میں گھبراتا ہوگا۔ تھوڑی دیر یہ آواز آئی۔ اسکے بعد دیکھا تو ایک تڑپتی ہوئی لاش گھوڑے سے زمین پر گرتی ہوئی نظر آئی جس کے منہ سے آخری نقطہ یہ نکلا اشہدان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ

یہ جودت نصرتی دولھا کپتان تھا جو اپنی دلہن سے آدھ گھنٹے بعد دنیا سے رخصت ہوا۔ اور کہہ گیا کہ موت دولھا دلہن کو بھی آجاتی ہو وہ بھول میں نہ رہیں

سکراتِ موت کی ہچکیاں

گرمی کے موسم میں محمد شاہ بادشاہ پائیں باغ کے حوض پر شام کے وقت محفل جمایا کرتے تھے۔ حوض میں گلاب کیوڑے کے فوارے چھٹتے در و دیوار پر خس کا عطر چھڑکا جاتا اور پری چہرہ خواصیں عیش پناہ بادشاہ کو برابر پنکھا جھلتی رہتی تھیں۔

ایک دن گل خانم نام ایک گجراتی چھوکری عطر کا کنٹر لئے دیواروں پر عطر چھڑکتی پھرتی تھی کہ بادشاہ محل سے برآمد ہو گئے۔ یہ لونڈی نئی آئی تھی گجرات کے حاکم نے بھیجی تھی۔ رعب شاہی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے بے اوسان ہو گئی۔ اور کنٹر ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گیا بادشاہ بالکل قریب آگئے تھے

اور سر ہوگا۔ یہ شمعیں ساتھ بھیجدو۔ قبر میں اندھیرا ہوگا۔ میرے زیور میری سوکنوں کو نہ دینا۔ اللہ۔ اللہ۔ اوہ مجھے اٹھاؤ۔ برف میں ڈالدو۔ آ۔ آ۔ آگ بدن میں۔ قاتل کو سہاگ۔ مبارک ہم تو چلے وہ بھی ایک دن اسی طرح پھڑ پھڑ کے تڑپے۔ لا الہ الا اللہ۔ الا اللہ۔ الا اللہ۔ محمد۔ محمد۔ محمد رسول رسول اللہ۔

یہ کہنے پائی تھی کہ غش آگیا۔ بدن تھرتھرانے لگا۔ آنکھیں پتھرا گئیں ناک کا بانسہ ڈھل گیا۔ اور زور سے ایک ہچکی ہچکی کی طرح آئی۔

حاضرین نے بادشاہ سے عرض کیا حضور اب ان میں کیا رکھا ہے دوسرے کمرے میں تشریف لے چلئے۔ یہ سنکر بادشاہ نے مرنے والی کا سر زانوں سے اُتار دیا اور تشریف لے گئے۔ جانے کے بعد گل خانم کو دو ہچکیاں اور آئیں۔ اسکے بعد سکرات موت اور زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

اے اس عبرت نامہ کے پڑھنے والو۔ سب کو یہ وقت پیش آنا ہے اس سے غافل نہ رہو گناہوں سے توبہ کرو۔ اور اس زندگی کا اسباب راحت خرید و جہاں موت نہیں ہے۔

قبر کی اشرفیاں

ایک کنجوس روپئے والے کی موت کا بیان

ایک شخص بہت مالدار تھا۔ اسکے کئی بچے تھے مگر وہ اپنی دولت خرچ کرنے نہ دیتا تھا۔ بچے جوتے کپڑے پھٹے آیا پانی دال کا کام ... بچے

اتاری گئی۔ دیکھا دل کے پاس ہلکا سا ایک زخم ہے حکیموں جراحوں کی طلبی ہوئی۔ آن کی آن میں سب حاضر ہو گئے تفتیش سے معلوم ہوا کہ کسی بیگم نے رشک و حسد سے زہر کا بجھا ہوا نشتر رکھوا دیا تھا وہ چبھا ہے۔ اب جان کی خیر نہیں کیونکہ دل قریب ہے زہر اثر کر چکا۔

بادشاہ ہائے کر کے بیہوش ہو گئے۔ گل خانم نے البتہ استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اپنے تمام زیورات اور کپڑے طلب کئے پلی ہوئی آغا مینا کا پنجرا بھی منگوایا اور سب چیزوں کو سامنے رکھکر نگاہ حسرت سے دیکھا۔

مینا رات کے سبب چپ تھی۔ اس سے مخاطب ہو کر بولی لو پیاری تمھاری چاہنے والی دنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ اب تم خدا کے حوالے خبر نہیں میرے بعد تم پر کیا گزرے۔

اتنا بولنے پائی تھی کہ زہر کا اثر خون پر چھا گیا۔ گردن ڈھلک گئی۔ منہ میں کف آنے لگے۔ لونڈیوں نے دوڑ کر سہارا دیا۔ حکیم جراح دوائیں لیکر آ گئے مگر اس کا تو کام تمام ہو چکا تھا۔ شاہی خواب گاہ کی آرائش کا کیا کہنا چپہ چپہ بہشت کا نمونہ تھا۔ کافوری شمعیں روشن تھیں چھپر کھٹ میں بادشاہ بیہوش پڑے تھے جن کو خوشبوئیں اور دوائیں سونگھا کر ہوشیار کیا گیا۔

بادشاہ اٹھے گل خانم کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اور دو آنسو اس کے اداس چہرے پر ٹپکائے۔ خانم نے ذرا سی آنکھ کھولی اور کہا میرے آقا میرے سلطان [illegible] میرے مالک میرے تاجدار پانی ایک گھونٹ کلیجہ پھٹا جاتا ہے ... سنئے ... قائم ... خدا ... یا جائے ... اُف۔ آہ۔ میں اُف۔ آہ۔ [illegible] میں تمہارے نامراد جاتی ہوں اب اس زانو پر

باتیں بتائیں۔ مگر باپ کو یقین نہ آیا اور کوٹھڑی میں جا کر کونہ کھودا۔ تو روپیہ
کی تھیلیاں غائب تھیں۔ یہ دیکھ کر اس نے ہائے کا نعرہ مارا اور کلیجہ پکڑ کے
بیٹھ گیا آنکھیں پتھرا گئیں۔ لڑکا یہ دیکھ کر بہت گھبرایا اور معافی مانگنے لگا اور
کہا اب تو مجھ سے خطا ہو گئی آیندہ نہ ہوگی۔ باپ نے کچھ جواب نہ دیا اور کہا
بازار سے حلوا خرید لاؤ۔ لڑکا گیا اور حلوہ خرید لایا۔ باپ نے اپنا کرتا اتارا۔
اندر ایک گدڑی پہنے ہوئے تھا اسکو اُدھیڑا تو اشرفیاں نکل آئیں اس نے
ان اشرفیوں کو ایک ایک کر کے حلوے میں رکھا اور نگل گیا۔ یہاں تک
کہ ساری اشرفیاں اور حلوا کھا لیا۔ اور کہا تم اس قابل نہیں ہو کہ دولت
تم کو دوں۔ اسلئے میں نے سب کھالی۔

یہ کہہ کر وہ وہیں لیٹ گیا۔ دم توڑنے لگا اور مر گیا۔ لڑکوں نے
کفن کا سامان کیا اور قبرستان میں جا کر دبا آئے۔

اس بات کا چرچا سارے محلہ میں تھا اور لوگ مرنے والے کنجوس
پر لعنت بھیجتے تھے۔ اس محلہ میں چند کفن چور بھی رہتے تھے۔ انہوں نے سنا
تو دو دن کے بعد رات کو کنجوس کی قبر پر گئے تاکہ لاش کو چیر کر اشرفیاں
نکال لیں۔ چنانچہ انہوں نے قبر کھودی اور پٹاؤ کا پتھر ہٹایا گیا۔ دیکھتے ہیں
لاش پٹی پڑی ہے اور اشرفیاں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ ایک چور نے
ایک اشرفی پر ہاتھ ڈالا تاکہ اسکو اٹھائے۔ اشرفی کو ہاتھ لگانا تھا کہ یہ معلوم
ہوا گویا آگ کی چنگاری پر ہاتھ پڑا۔ بلبلا گیا۔ ہاتھ کھینچ لیا۔ اور قبر سے باہر آ گیا
[illegible] پاؤں میں ڈال دیا [illegible]
[illegible] جہاں پاؤں سے [illegible] نکالا [illegible] آگ لگنے لگی
[illegible]

پرانے بچھونے پر سوتا اور اسی حال میں بچوں کو رکھتا تھا۔

جب بچوں نے ہوش سنبھالا تو انہوں نے خیال کیا ہمارا باپ اتنا پیسے والا ہے۔ مگر ایسے غریبی حال میں کیوں رہتا ہے ایک دن انہوں نے باپ سے پوچھا کہ باواجان یہ کیا بات ہے کہ اور لوگ جب ان کو خدا کھانے پہننے کو دیتا ہے تو اچھے سے اچھا کھاتے ہیں اچھے سے اچھا پہنتے ہیں۔ لیکن آپ ہمیشہ مفلس کنگالوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور ہمکو بھی رکھتے ہیں۔ آخر یہ دولت کس دن کام آئے گی۔

باپ نے ہنسکر کہا۔ نادان روپیہ جمع کرنے کے لئے ہے یا خرچ کرنے کے واسطے۔ یہ جتنے اُجلے اُجلے کپڑے والے سفید پوش بازاروں میں پھرتے ہیں بس یہ ان کا خالی لفافہ ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں۔ وقت پڑے تو دو روپے بھی ان کے گھر میں نہ نکلیں۔ اور میں چاہوں تو لاکھوں روپیے ایک وقت میں نکال سکتا ہوں۔ یہ سنکر بچوں نے کچھ اور بولنا چاہا مگر باپ نے دھمکا کر چپکا کر دیا۔ اور کہا میں زیادہ باتیں نہیں سنتا۔ آدمی کو چاہیئے کمائے اور جمع کرے۔ خرچ کرنے کا نام لیگے تو گھر سے نکال دونگا۔

بڑے بیٹے کو یہ بات بہت بری لگی اور تاک میں رہا کہ باپ کی آنکھ بچے تو روپیہ چراؤں۔ آخر یہی ہوا۔ ایک دن باپ باہر گیا ہوا تھا لڑکے نے کوٹھری کا کونا کھودا جہاں روپیہ دفن تھا اور سب توڑے نکال لئے۔ اسکے بعد مٹی ڈال کر جگہ برابر کر دی۔

اب آہستہ آہستہ یہ روپیہ اڑانا شروع کیا۔ خوب عیاشیاں کیں اور فضول خرچی میں سارا روپیہ برباد کر دیا۔ باپ کو دیکھو۔ .... [illegible] نے لڑکے کے اچھے کپڑوں کو دیکھ کر دریافت کیا کہ یہ [illegible] سے آئے [illegible] [illegible] چھوٹ [illegible]

پھر کہا کہ میاں کلمہ پڑھو۔ یہ سنتے ہی آواز خاموش اور سایہ غائب ہوگیا۔

صبح کو اس مردے کے گھر والے پھولوں کی چادر چڑھانے آئے تو میں نے ان سے رات کا قصہ بیان کیا۔ یہ سنتے ہی ایک بڑھیا عورت نے چیخ ماری اور رونے لگی۔ یہ اس مردے کی ماں تھی۔ اس نے کہا مرنے والے کا سلوک میرے ساتھ اور اپنی بیوی کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ میں نے اسی وقت اس کا قصور معاف کیا۔ اور گھر جا کر اسکی نوجوان مظلوم بیوہ سے بھی قصور معاف کراؤنگی شاید ان گناہوں کے سبب اسکی پکڑ ہوئی ہو۔ اور معاف کر دینے سے بخشا جائے اور عذاب سے چھٹکارا پائے۔

دیکھو ماں اور بیوی کو ستانے اور ان پر ظلم کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے ڈرو۔ اور توبہ کرو۔ تم کبھی اپنی ماں بہن بھائی بیوی بچوں کو نہ ستانا۔

تو دیکھ! علاء الدین خلجی کیسا سلطان تھا۔ وہ تمام ہندوستان پر خود مختاری کی حکومت کرتا تھا۔ اس کی تلوار کا زور جنگلوں پہاڑوں میں مشہور تھا اسکو دوسرا اسکندر بننے کی ہوس تھی۔ اسکے دربار کی شان و شوکت بے مثال تھی۔

مگر آج خیال کر کیا وہ کہیں ہے؟ اس کی اجڑی [illegible] کا کچھ نشان ملتا ہے؟ قطب مینار سے نیچے دیکھ مغرب کی جانب ٹوٹے پھوٹے در و دیوار ہیں خس و خاشاک کے انبار ہیں۔ یہاں اس سلطان کا شاندار [illegible] تھا

کہ تیسرے دن ہائے ہائے چلا۔ ہائے چلا چیختا ہوا مر گیا۔
کنجوسوں اور چوروں کا یہ انجام ہوتا ہے۔

بے چین مردہ

غدر سے پہلے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس ایک مکان میں کوئی شاہ صاحب رہتے تھے۔ اس مکان کے صحن میں دہلی کے شہزادوں کا قبرستان بھی تھا۔ ایک دن کسی نوجوان شہزادہ کا جنازہ یہاں لاکر دفن کیا گیا۔ شاہ صاحب کا بیان ہے کہ جب رات ہوئی اور میں سو گیا تو یکایک کسی کی ہائے ہائے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ حیران تھا کہ الٰہی یہ آواز کہاں سے آئی باہر صحن کی طرف خیال کیا تو معلوم ہوا کہ ایک سایہ سا ہے جو قبر کے چاروں طرف دوڑتا پھرتا ہے۔ اسی سے آواز آتی ہے ہائے ہائے میں جلا۔ ہائے میں جلا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں ڈر کے مارے میں کانپنے لگا۔ مگر دل مضبوط کرکے میں نے زور زور سے کلمہ پڑھنا شروع کیا اور کہا میاں تم بھی کلمہ پڑھو عذاب کم ہو جائے گا۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ آواز جاتی رہی۔ اور سایہ غائب ہو گیا۔ میں لیٹ رہا اور آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں پھر وہی غل شور پیدا ہوا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو وہ سایہ اسی طرح قبر کے چاروں طرف گھبرایا پھر رہا ہے۔ اور ہائے ہائے کی آواز آ رہی ہے۔

اب کے میری ہمت ٹوٹ گئی۔ اور خوف کے مارے بڑی دیر تک کلمہ منہ سے نہ نکلا۔ لیکن جب مردہ کی بے چینی حد سے بڑھی تو میں نے

اور حجت کی بارش برستی رہی عقل نے بہتیرا زور لگایا تلوار نے ہر چند دھمکیاں دیں مگر لامذہب کا انکار نہ ٹوٹا۔ وہ جہاں تھا وہیں رہا۔

کوئی ایک ثبوت پیش کرتا لامذہب چار تردیدیں سامنے لاتا زبان اسکی تیز قلم میں اس کے روانی۔ علم میں پورا۔ ارادہ کا پکا۔ بھلا کس کی مجال تھی جو قائل کرتا اور مذہب کے آگے اس کا سر جھکاتا۔

لامذہب جانتا تھا جس چیز کا خلقت نے مذہب نام رکھا ہے وہ فطرت انسانی کی ایسی رہنمائی ہے جو آدمی کو دائرہ انسانیت میں قائم رکھ سکے مگر جب میں خود اپنے عقل ضمیر سے اتنی تمیز رکھتا ہوں کہ سوسائٹی اور آدمیت کے خلاف کوئی بات ہاتھ پاؤں آنکھ کان زبان یا اعضائے ظاہری و باطنی سے نہ کروں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ہجوم بے عقلاں میں شریک ہوں اور مذہبی آدمی کہلاؤں کیونکہ مذہب کے پابند زیادہ جاہل اور بے عقل لوگ ہوتے ہیں۔ اور مذہب کے رستہ میں چلنے والے کو بے شمار مضحکہ خیز بیوقوفی کی رسمیں بھی ادا کرنی پڑتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو مذہب آدمی سے ایسی ناشائستہ حرکات جوش تعصبی میں کرا دیتا ہے جو دانش اور ہوش انسانی کے سراسر منافی ہیں

غرض لامذہب کا انکار دن بہ دن پختہ ہوتا گیا پہلے تو لوگ اسکو سمجھاتے تھے تحریری و تقریری اثر اس پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اور اب وہ خود دوسرے اہل مذہب کو فہمایش کرتا تھا اور عقل و دلیل کے زور سے اس نے متعدد آدمیوں کو منکر مذہب بنا دیا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میرا جادو چل سکتا ہے تو اس نے ایک کتاب اسلام اور عقلیت یا مذہب اور عقل کے نام سے لکھ ڈالی اور اسکو شائع کر دیا۔

مگراب قبر کا تعویذ بھی باقی نہیں[1]۔ جہاں اس عظیم الشان سلطان کی لاش دفن کی گئی تھی۔ وہاں ایک ویران گڑھا نظر آتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ نہ یہاں مخملی شامیانہ ہے۔ نہ پہرے والے سپاہی ہیں۔ نہ آواز دینے والے چوبدار ہیں گھاس کے تنکوں چونے کے کنکروں خارا کے پتھروں میں مُردہ بدن خاک بنا پڑا ہے

ذرا دوسری طرف نگاہ اٹھا۔ غیاث الدین بلبن غلام خاندان کا مشہور شہنشاہ اور اس کا بیٹا محمد خان شہید شکستہ مقبروں میں پڑے سوتے ہیں۔ ان کے گورخانے بھی برباد و تباہ پڑے ہیں۔ اور منظر پڑھا گیارہ گیارہ میل پرانی دہلی کے کھنڈروں کو دیکھ۔ کیا کیا محل تھے کیسی کیسی مسجدیں و خانقاہیں تھیں حویلیاں اور بلند عمارتیں تھیں مگر اب سب سرنگوں پڑی دم توڑ رہی ہیں۔

میں نے کہا۔ آسمان والو مجھ سے کیا کہتے ہو۔ تم خود دیکھو بابل و نینوا روما کے آثار قدیم کا انجام دیکھ چکے ہو۔ دہلی کو بھی انہی پر قیاس کر لو۔

کیا تم مجھ سے لکھوانا چاہتے ہو کہ دنیا کے جاہ پرست تمام خود سے بلند بلند نئی عمارتوں کے بنانے والے اگلے وقتوں کے اس انجام سے عبرت حاصل کریں لیکن مجھ سے نہ کہلواؤ۔ لوح محفوظ میں دیکھو کہ وہاں کیا لکھا ہے اس کے بعد تم بھی انتظار کرو اور میں بھی راہ دیکھوں۔

موت کی گھڑی

اچھا لکھنے والے لکھ چکے اچھا بولنے والے بول کر تھک گئے دلیل

---

[1] انگریزی سرکار نے اب اس مقبرہ کی مرمت کرا کے قبر کا تعویذ بھی بنوا دیا ہے۔ حسن نظامی

مرتی ہے۔

اُس کی آمدنی اتنی تھی کہ ذاتی ضروریات سے روپے بچ رہتے تھے اُن کو وہ طالب علموں یا اور غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا مگر زکوٰۃ کے ٹیکس کو وہ فضول سمجھتا تھا کیونکہ اس کو مذہبی قواعد کے ماتحت رہ کر خیرات کرنے سے چڑ ہی تھی۔

لامذہب پروفیسر میں ایک متقی مسلمان کے اوصاف سب موجود تھے سوائے اس کے کہ اس کا عقیدہ مذہب اور اس کے خدا پر نہ تھا۔ اس کا خیال تھا خدا کوئی چیز نہیں ہے فطرت کے تقاضے سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور شکل بدل کر مٹ جاتی ہیں۔

اگرچہ وہ مسلمانی مذہب کا منکر تھا مگر مسلمان قوم پر اس کی جان فدا تھی۔ کیا مجال کہ مسلمانوں کی کہیں توہین ہوتی ہو اور وہ برداشت کرلے۔ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ وہ سرحدی جوان تھا ہاتھ پاؤں خوب مضبوط تھے دس پانچ کیا سو پچاس آدمیوں کی ہیبت اس پر ذرہ کے برابر بھی اثر نہ کرتی تھی۔

لامذہب پروفیسر کو شادی کی رسمیں معلوم کرنے کا بڑا شوق تھا ہر قوم کی رسومات شادی سنتا موقع بنتا تو خود جا کر دیکھتا۔ کوئی کتاب ایسی ملتی تو بار بار پڑھتا۔ اور ہر اسم کو یاد کرکے لوگوں کو سناتا۔

یہ سن چکے ہو کہ لامذہب پروفیسر بہت توانا اور تندرست نوجوان تھا پاکبازی کے سبب اسکی صحت جسمانی بہت اچھی حالت پر قائم تھی اور وہ یقین کرتا تھا کہ طبعی عمر سے پہلے اسکو موت نہیں آئے گی۔

یہ یقین اہل مذہب کے ایمان کی طرح مضبوط تھا۔ اور کوئی چیز اسکے

کتاب کے شائع ہوتے ہی توقع کے موافق اہل مذہب جوش میں آگئے جہاں اس نے تعلیم پائی تھی اسکو برا بھلا کہنے لگے بعض نے نفس تعلیم کو صلواتیں سنا دیں دو ایک نے عقل کے پتھر کا جواب عقلی پتھر سے دیا لامذہب سنکر اسکر اکر مزے لیتا تھا اس کو تو پہلے سے ان حرکات عجیب کا علم تھا وہ چاہتا تو اس پر ایک پیشین گوئی شائع کر سکتا تھا جو بالکل ہو بہو پوری اتری مگر پیشین گوئی کو بھی وہ مذہب کی ایک شاخ سمجھتا تھا لہذا وہ چپکا رہا اور اپنا کام کئے گیا۔

لامذہب کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ شراب سے اسکو نفرت تھی زنا اور جوئے کا کبھی اس نے ارادہ بھی نہیں کیا۔ دغا فریب غیبت چوری سے گناہ اس نے دانستہ کیا نادانستہ بھی نہیں کئے اپنی روزی محنت سے کماتا تھا اور بڑی بے فکری اور آزادی کی خوش باش زندگی بسر کرتا تھا۔

اس کی زندگی کا پروگرام یہ تھا صبح طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہوتا ورزش کرتا غسل کر کے دودھ پیتا۔ پھر ہواخوری کو نکل جاتا واپس آکر کالج کے سبق کی کتاب دیکھتا۔ کیونکہ وہ ایک کالج کا پروفیسر تھا۔ دس بجے کھانا کھا کر کالج جاتا چار بجے واپس آکر کچھ ناشتہ کرتا اور ٹینس کھیلنے ایک کلب میں چلا جاتا وہیں اسکے ہم خیال احباب ملتے جن سے سورج چھپنے کے وقت تک خوش گپی رہتی پھر گھر آتا کھانا کھا کر کتاب دیکھتا۔ اخبار پڑھتا۔ اور پاؤں پھیلا کر آرام سے سو رہتا اسکو نمازوں کی پابندی جیل نظر آتی تھی۔ وہ کہتا تھا وقت کی پابندی کام کے لئے ضروری ہے۔ اس کام کی کیا ضرورت ہے جس کا نتیجہ کچھ نہیں خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جاتا ہے۔

وہ بہت فیاض تھا۔ اکثر اپنے حصہ کا کھانا کوئی بیکس محتاج سامنے آجاتا تو اس کو دیدیتا تھا۔ مگر روزہ پر اس کو حیرت تھی کہ خلقت بھوکی کیوں

دل و دماغ ہی نے اس خبر کو زیادہ اہم نہیں سمجھا تھا۔
مگر اسکے ساتھ ہی وہ اپنے قوائے حفظ ماتقدم پر بار بار زور ڈالتا تھا اور سوچتا تھا کہ میرا مرض ان امراض میں نہیں ہے جنکا علاج ڈاکٹروں کو معلوم نہیں معمولی بیماری ہے جسکی حقیقت سے اور اسکی دوا سے میں خود اناڑی آدمی تک واقف ہوں پھر کیا وجہ ہے جو دوا اپنا اثر نہیں کرتی۔ مجھے آخر دم تک تدابیر اور کوشش سے غافل نہ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ نیچر کا فیصلہ نہیں ہے آدمی کی رائے میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بشریت سے سب ڈاکٹروں کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو۔
یہ خیال کرتے ہی اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا رہا۔ اس کا ضمیر خود بخود نادم سا ہو گیا۔ کیونکہ اس خیال کی لہر کے ساتھ دوسرے گوشہ خیال سے یہ کھوج پیدا ہوتی تھی کہ اسی طرح خدا کے وجود کو نہ ماننے میں ممکن ہے میری بشری بھول ہو اور مرض کو لاعلاج خدا ہی نے کر دیا ہو تاکہ وہ میرے انکار مذہب کو زک پہنچائے۔ اس خیالی جنبش نے پروفیسر کو کچھ گھبرا سا دیا۔ اسکے چہرہ پر پسینہ آ گیا۔ دل کی حرکت تیز ہو گئی مگر فوراً ایک دوسرے خیال نے اسکے اوسان درست کر دیے جو یہ تھا۔
ہر انسان میں قدرتی طور پر لیاقت اور نالائقی۔ قوت اور کمزوری کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ اگر علم و تربیت سے لیاقت اور طاقت کو سہارا ملا تو وہ نالائقی اور کمزوری پر حاوے ہو جاتی ہیں۔ ورنہ انسان پر غلبہ نالائقی اور کمزوری کا ہو جاتا ہے چونکہ میری تعلیم و تربیت اچھی ہوئی ہے میں اپنی کمزوریوں پر غالب تھا مگر اب بیماری کے سبب اعضائے دماغی ناتوان ہو گئے ہیں اسواسطے عقیدہ کی کمزوری ابھر آئی ہے اور مجھکو خدا۔ مذہب کی حقانیت کا وہم ولاتی ہے پس مجھے مستحکم ہونا چاہئے اور دنیا سے چلتے وقت

خیالِ عقلی کو بدلنے والی موجود تھی۔

لیکن یکایک وہ بیمار ہوا۔ اور ایسا کہ باوجود جسمی قوت کے بستر سے اٹھنا دوبھر ہو گیا۔ اس کے دوستوں نے ڈاکٹروں کا جم غفیر جمع کر دیا جنہوں نے بہت توجہ سے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی۔ اور پھر علاج شروع کیا۔ ڈاکٹروں نے مرض کے جو اسباب تجویز کئے ان کو پروفیسر نے تسلیم کیا اور اسے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ٹھیک راستے پر پہنچے ہیں اور اب مرض کے دفعیہ میں انکی کامیابی یقینی ہے۔ ڈاکٹروں نے جو کچھ دوا بتائی اوسکو ٹھیک اصول کے موافق ان کو استعمال کیا۔ اور پرہیز بھی ایسا کیا جو پرہیز کا حق تھا یعنی ڈاکٹری مشورہ سے ایک انچہ ادھر اُدھر نہ ہوا۔

مگر پروفیسر حیران تھا کہ دوا اثر کیوں نہیں کرتی۔ مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور کوئی تدبیر اس کو روک نہیں سکتی۔ اس نے بار بار ڈاکٹر تبدیل کرائے لیکن کسی سے مرض کی روک تھام نہ ہو سکی

وہ یونانی علاج کا قائل نہ تھا مگر مجبور ہو کر چند اچھے طبیب بھی بلائے اُن کی تجویز بھی ڈاکٹروں سے موافق ہوتی مگر دوا پی تو اس کا اثر یہاں بھی ندارد آخر ڈاکٹروں اور طبیبوں نے جواب دیدیا۔ احباب کو نہیں خود پروفیسر کو کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پروفیسر ڈرنے والا آدمی نہیں ہے۔

پروفیسر نے اس فیصلہ کو بہت اطمینان سے سنا اسکی عقل موت سے کبھی نہیں ڈرتی کیجا عقل و فلسفہ سے اس کے دماغ کی پرورش ہوئی تھی وہ موت کو زندگی کا ایک لازمی اور ضروری حصہ سمجھتا تھا۔ اس واسطے اس نے ڈاکٹری رائے کی کچھ پروا نہ کی اور اطلاعِ مرگ سے ہوش باطنی اور حواس ظاہری کو پراگندہ نہ ہونے دیا۔ یہ کہنا چاہئے کہ پروفیسر کے اعصاب

حمق پن کے خیالات میں جان کیوں دوں۔

اسی کشمکش میں تلوؤں میں کسی نے بجلی کی مشین لگا دی جس سے بدن کے پٹھے اکڑنے لگے اور پروفیسر کو سخت تکلیف ہونے لگی۔ وہ تڑپنا چاہتا تھا مگر تڑپ نہ سکتا تھا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اسکی آواز نہ نکلتی تھی وہ پیروں کے سمیٹنے کی خواہش میں تمام جسم کی قوت خرچ کر رہا تھا مگر پاؤں ہلتے تک نہ تھے وہ دیکھ رہا تھا کہ پاؤں سامنے پھیلے ہوئے ہیں لیکن اسکے ارادہ سے اوپر کو نہیں سمٹتے زبان کا حس معلوم ہوتا تھا کہ وہ منہ کے اندر موجود ہے مگر وہ بولنے سے گویا انکار کرتی تھی۔ پروفیسر نے اس بے اختیاری سے ہراساں ہو کر پلنگ کے آس پاس اپنے احباب کو دیکھا لیکن کسی دوست نے اس کے مطلب کو نہ سمجھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی فریاد ان سے کرے کسی کی مخالفت بھی نہ تھی کوئی روکنے والا نہ تھا مگر زبان پر قفل لگ گیا تھا۔ اور اسی بات سے پروفیسر زیادہ کھسیانہ اور مایوس تھا۔

بجلی کی مشین موجود نہ تھی مگر پروفیسر کو معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اس کے پیروں پر بجلی لگی ہوئی ہے جو اسکی رگوں اور پٹھوں کو کھینچ کھینچ کر توڑے ڈالتی ہے اسے معلوم ہوا کہ دماغ نشتر سے چیرا جاتا ہے اور میں دماغ کے اندر آباد ہوں۔ اس واسطے اس نے پھر کوشش کی۔ اور پکار پکار کر کہنا شروع کیا اس گھر کے اندر میں ہوں اس کو نہ توڑنا۔ اس کو نہ توڑنا۔ اس کو نہ چھیڑنا مگر اسکی چیخ پکار سے اسکو تسلی نہ ہوئی۔ اس واسطے اس نے خیال کیا کہ میری آواز شاید کسی نے بھی نہیں سُنی۔ ہائے میں کیسا بے کس ہو گیا ہوں۔

اب اسے معلوم ہوا کہ میں شاید ہزاروں کوس اونچے مینار سے نیچے گر رہا ہوں۔ اور نیچے گرتے وقت کلیجہ میں جو ایک سناٹا سا ہوتا ہے۔

ایسی بے عقلی کی حرکت سے اپنے کیریکٹر کو گندہ نہ کرنا چاہئے۔

اس خیالی موج نے پروفیسر کے بحرِ قلب کا وہ بلبلا توڑ ڈالا جس میں ابھی ساری عمر کے بعد تصورِ خدا کی ہوا سمائی تھی، اور وہ ہمہ تن صاف سینہ ہو کر پھر اپنے مرض پر غور کرنے لگا۔

سکرات کا الارم

افسوس اجل نے پروفیسر کو مزید غور و فکر کی مہلت نہ دی اور اپنی آمد کا گھنٹہ بجانا شروع کر دیا۔

پروفیسر نے بہت کم موت کا فلسفہ پڑھا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی جوان تھا اور اس وقت کی تیاری کو ضروری نہ سمجھتا تھا۔ نہ اس نے اور لوگوں کے مرنے میں کبھی شرکت کی تھی، جو مرنے کی حالت سے واقف ہوتا اس واسطے موت کی آمد کا اصلی نشان اس کو معلوم نہ تھا تاہم وقت آخر کی جسمانی کوفت سے اس نے سمجھا کہ یہ کیفیت مرض کی تکلیف سے کچھ الگ سی ہے۔ شاید کچھ پیش آنیوالا ہے، ممکن ہے ڈاکٹروں کی رائے کے موافق موت آئی ہو اور یہ حالت موت کی ہو اگر مذہب والے سچے ہیں کہ موت کے وقت فرشتے آیا کرتے ہیں تو وہ کہاں ہیں مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ سب فرضی کہانیاں تھیں۔ یا شاید مجھے موت نہ آئی ہو، موت نہیں آئی تو فرشتے کیونکر آتے۔

پروفیسر اپنے خیال پر جھنجلایا کہ گھڑی گھڑی خدا و مذہب کا دھیان کیوں آتا ہے، موت آئی ہے تو میں خوشی سے زندگی دینے کو تیار ہوں اور

بنگلہ کی چھت بھی میرا ساتھ نہیں دیتی۔ زندگی میں یہ مجھکو دھوپ اور بارش سے بچاتی تھی۔ میری کتابیں الماری میں خاموش رکھی ہیں وہ بھی کچھ نہیں بولتیں۔

میں آدمی ہوں عقل کا پتلا ہوں کیا اسکی ناچیزی اور لاچاری کا ثبوت بھی پیش آنے والا تھا جس کا علاج میرے پاس نہیں۔

یہ کہتے کہتے پھر بجلی اسکے پیروں میں لگا گئی۔ اور پھر اسی تکلیف اسکو ہونے لگی۔

اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وحشی ایام سے خدا سے مدد مانگوں گا۔ اسکا اقرار کروں گا۔ بے شک... بے اسکے خیال کرنے سے مجھکو تسلی ہوتی ہے۔

مجھے حضرت علیؓ کا قول یاد ہے کہ اگر موت کے بعد کچھ نہیں ہے تو خدا پرست اور منکرین خدا کی یکساں حالت ہے اور اگر کوئی دوسرا عالم مرنے کے بعد ہو تو خدا پرست فائدے میں ہیں اور منکر گھاٹے میں بیشک علیؓ کا فلسفہ سچا ہے خدا کے اقرار میں لذت ہے۔ اور اسکے انکار میں بیکسی۔ مایوسی وہ فرد موجود ہے۔ نہ ہوتا تو انسان اس وقت مجبور کا چارہ کار ضرور پیدا کر لینا ہی نہیں کرنے دیتا۔ اسی نے دواؤں کو بے اثر کر دیا۔ وہی عقل کو مغلوب کر رہا ہے

اے خدا تو جہاں ہے میری سُن میں تجھکو تسلیم کرتا ہوں تیرا اقرار کرتا ہوں میں اپنے نام محمد ظریف کے پہلے حصہ کی بھی تصدیق کرتا ہوں۔ محمد تیرا فرستادہ تھا۔ میری عقل کا سلام اُس کو پہنچا۔ اور اس بےبسی میں میرا سہارا بن موت سے بچا لے یا اسکی دشواری کو آسان کر۔

یہ کہتے ہی پروفیسر کے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ تکلیف جاتی رہی اور ایک طرح کی لذت کا اثر اسکو محسوس ہوا جسم کے رونگٹوں سے

اس کا حس پروفیسر کو بہت تیزی سے محسوس ہونے لگا
پھر معلوم ہوا کہ دل میں ایک دریا ہے میں مینار پر سے اسکے اندر گر پڑا
بہت دیر تک تو دریا کی تہ میں ڈبکیاں کھاتا رہا آخر اوپر ابھرا اور پانی سے گردن
باہر نکالی۔
گردن نکلنی تھی کہ اسکو یہ معلوم ہوا کہ میں نے خواب دیکھا ہے پلنگ
پر لیٹا تھا۔ دوست چاروں طرف بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر آلہ سے دل کی حرکت دیکھ
رہا تھا۔ پروفیسر نے ڈاکٹر سے کہا کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز ہے جو میری زندگی کو
موت کے ہاتھ سے بچائے۔ ڈاکٹر کوئی خدا پرست آدمی تھا۔ بولا سوائے خدا
کے کسی میں یہ طاقت نہیں۔
پروفیسر اس چیز کا نام مت لو۔ کیا ایسے عقل اور سائنس کے زمانہ میں
انسان جیسی ہستی موت کو روکنے سے عاجز ہے تو کیا تاریک اور وحشی زمانہ
کا خدا اس وقت میں بھی ہم لوگوں پر کچھ اقتدار رکھتا ہے۔
یورپ و امریکہ نے بڑی بھول کی جو اسباب حیات کیلئے آلات
بنانے میں مصروف ہو گئے آسایش جسمانی کی ترقیوں کے لئے انہوں نے
اپنی عقلوں کو خرچ کیا۔ کاش وہ سب کے سب موت کی حقیقت معلوم کرتے۔
کاش وہ اتنا سمجھ لیتے کہ تھوڑی دیر کے واسطے موت کیونکر رک سکتی ہے۔ آہ میں
زندہ رہ سکوں تو ساری زندگی اسی دریافت میں خرچ کر دوں گا۔ ارے کوئی
تو ایسا آئے جو مجھے اس وقت مرنے نہ دے کوئی تدبیر تو ایسی نکالو کہ موت مجھکو
مہلت دیدے۔
ہائے یہ کمپونڈ کے درخت کیسے زندگی میں آزاد کھڑے ہیں اور میں انکا مالک
جان دے رہا ہوں۔ یہ میز کرسیاں موجود ہیں اور میرا وجود فنا ہو جائے! بس

اکلوتہ کی موت

زندگی ہنستی تھی اسرائیلی خاندان کے اُن چند افراد پر جن کو موت سے کدورت نفرت عداوت خدا معلوم کیا تھا کہ مری ہوئی چیونٹی تک کا ذکر گھر میں نہ آسکتا تھا۔ عورتیں تو خیر جاہل کم عقل دشمن جو کچھ بھی تھیں مگر رونا ان کمبخت مردوں کا ہے پڑھے لکھے سمجھدار دور اندیش اور پھر یہ بھی نہیں کہ سب نوعمر جوان دو برس کے بچہ سے لیکر پینسٹھ برس تک کے بڈھے پھونس موجود مگر کیا مجال جو بڑوں تک میں موت کا نام آجائے عورتوں نے تو خیر یہی انتظام کیا تھا کہ اگر کسی ماما نے مرا ہوا چوہا دیکھ لیا تو تین دن گھر میں قدم نہ رکھے مگر مرد بھی عورتوں سے کسی طرح ہیٹے نہ تھے نواب ولی محمد خاں کا تعلقہ کچھ نہیں تو ایک چھ ہزار روپیہ ماہوار کا ہوگا خدا جھوٹ نہ بلائے منشی محرر کارندے خزانچی نوکر چاکر یہ وہ سب ملا کر کوئی سو آدمیوں کا عملہ تھا مگر کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ موت کا نام لے سکتا نیا ملازم ادھر نام لکھا گیا اور اُدھر اُس خاص داروغہ نے جو اسی کام کی تنخواہ پاتا تھا صاف صاف کہہ دیا کہ دنیا بھر کے قصور کیجیو مگر موت کا نام کبھی نہ لیجیو اشد ضرورت ہو تو موت کو پیدائش کہہ دینا جائز ہے مگر یہ نام جس کی زبان سے نکلا اُس کا پھر ٹھکانا نہیں ولی محمد بیوقوف شخص نہ تھا قومی کاموں میں اسکے چندے مہمانوں کی خاطر مدارات حاجتمندوں سے اسکی ہمدردی عام طور پر مشہور تھی مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ موت سے اسے ایسی کیا دشمنی تھی کہ اگر اسکا

کوئی چیز نکلتی معلوم ہوئی۔ انھوں پر نیند کا سا غلبہ ہوا اور ایک ہچکولہ ایسا لگا کہ پروفیسر نیند سے چونکتا سارہ گیا اور پھر اسے خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں ہے کیسا ہے۔ کیا تھا کہاں تھا۔ اور اب کہاں چلا گیا۔

جناب مولانا راشد الخیری مصور غم ادادہلی کے مشہور انشا پرداز ہیں۔ زنانہ رسالہ عصمت کے اڈیٹر اور متعدد ورنانہ کتب کے مصنف ہیں۔ انکی عبارت ایک مخصوص رنگ کی ہوتی ہے خصوصاً مضامین غم لکھنے میں انکو کمال حاصل ہے شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی سے انکی قریبی رشتہ داری ہے مگر ادب اردو میں انہوں نے مولانا مرحوم سے جداگانہ ایک شاخ ایجاد کی ہے۔

مجھے رسالہ کم ؤسوت لکھتے وقت خیال آیا کہ مولا صمد ح کے چند مضامین بھی اس کتاب میں شریک کئے جائیں۔ مگر وہ میری طرح لکھنے کی مشین نہیں بہت کم لکھتے ہیں اور بہت تقاضوں سے لکھتے ہیں۔ احسانمند ہوں کہ انہوں نے میری درخواست رد نہیں کی۔ اور اس رسالہ کم ؤسوت کے لئے چند مضامین بہت جلدی تیار کرکے دیدئے۔ جو ناظرین کی خدمت میں حاضر کئے جاتے ہیں۔ پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مولانا غم ادا نے ہر مضمون میں موت کا وقت مجسم کرکے کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان میں انکی انشا پردازی کے لاجواب کمالات کا دریا بہتا نظر آتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ رسالہ کم ؤسوت کا مقصد اس جدید اضافہ سے دوگنا روشن ہوگیا اور اہل ملک نے مختلف طبقوں کے وقت آخر کو الفاظ کے نقشہ میں سامنے موجود دیکھ لیا۔ اور یہی وہ چیز ہے جسکی خاطر میں نے یہ رسالہ مرتب کیا ہے۔

حسن نظامی

ضمیر الدولہ۔ پیدا ہوتے ہی گوند کھانے بھی اڑاؤ گے یا نہیں۔
وزیر۔ واہ سرکار کیسی کہ ہاں پیدائش ہو اور آپ مذاق اڑائیں۔
ضمیر الدولہ۔ تو کیا پیدائش رونے کا وقت ہے۔
ضمیر الدولہ بہادر نے اتنی دیر مغز مارا اور خاک نہ سمجھے کہ وزیر کا مطلب کیا استنے ہی میں ولی محمد خاں بھی آ گئے۔ سنتے ہی تیوری پر بل آ گیا چہرہ بدل گیا کیا ہے، کیوں ایسے لوگ نوکر رکھے جاتے جنکو ایسی ضرورتیں پیش آئیں بلاؤ داروغہ کو، بیوقوف کچھ نہیں سمجھتا، نہیں پہلے سے اچھی طرح دیکھ لیتا سخت تکلیف ہوئی حد سے زیادہ اذیت نامعقول نالائق چلو ہٹو سامنے سے بھاگ جاؤ پھر کبھی مت آؤ۔

نواب ولی محمد خاں کی عمر کا سرمایہ اور بیگم صاحب کی جمع پونجی صرف ایک پانچ برس کا بچہ تھا جو پیدا ہوتے ہی باپ بن چکا تھا اور جسکا نام تھا ابو العلا نواب ظہیر محمد خاں یہ بچہ ماں کی طرف سے چار بہنوں میں اور باپ کی طرف سے پانچ بھائیوں میں صرف ایک تھا اور سچ مچ کی نعمت تھا کہ جس خاندان میں چالیس سال تک چوہے کا بچہ نہ دکھائی دے وہاں ابو العلا جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا اللہ آمین کا بچہ فقیر کا نہیں غریب کا نہیں موت جوت والوں کا بچہ کیا آنکھوں کا تارا تھا کہ دو خالائیں اپنے اپنے گھر بار چھوڑ تین کوس سے روزانہ آتی تھیں یا مینہ صبح اسکے واسطے آئیں اور شام کو جائیں بڑی تو اس کے کارن میاں کو بھی چھوڑ بیٹھی دن رات بچہ تھا اور وہ تھی لاڈلے اور ملائی ضدی اور مرت بیاہی سب ہی قسم کے بچے دیکھے مگر یہ رنگ دیکھا نہ سنا کہ بچہ خاصا اچھا بھلا چنگا پڑا سو رہا ہے اور اکثر ماں اور خالائیں کبھی کبھی باپ اور چچا بھی اسکے پاس بیٹھے اسکا چہرہ دیکھ رہے ہیں کوئی ناک کی تعریف کر رہا ہے کوئی آنکھ کی

ں چلتا تو ملک الموت کو کچا کھا جاتا دشمنی بھی نہیں اس کا مقصد صرف یہ تھا
قدرت کی تمام مخلوقات بیگناہ قیدیوں کی حراست دکھیاری رانڈوں کا
انہ بیوگی بیکس اپاہجوں کا عرصہ حیات ہر چیز دنیا میں قائم رہے مگر موت کا
ود رہے۔ اتفاق سے نواب ضمیر الدولہ بہادر شکار کی غرض سے تشریف
ست نواب کے قدیمی دوست تھے جی کھول کر خاطر مدارات کی طرح رنگ
یل کو دیکھ کر بھانڈ رنڈیاں میراثیں کوئی فرحت ظاہری ایسی نہ تھی
نظر نہ آئی ہو۔ ولی محمد خاں ایک روز محلسرا میں تھے اور ضمیر الدولہ بہادر
بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے کہ وزیر ایک نیا نوکر جسکو آئے دو دن بھی نہ ہوئے
تھے اور ابھی صورت تک نہ دیکھی تھی دفعتہً گھبرایا ہوا آیا اور ضمیر الدولہ کے سامنے
کھڑا ہو گیا ہانپ رہا تھا آنکھ میں آنسو تھے دل کا اللہ مالک تھا۔

ضمیر الدولہ۔ کیا ہے؟

وزیر۔ حضور کیا عرض کروں! والد پیدا ہو گئے۔

ضمیر الدولہ۔ تمہارے ہاں والد پیدا ہوتے۔ کب؟

وزیر۔ (روکر) سرکار ابھی تھوڑی سی دیر ہوئی۔

ضمیر الدولہ۔ والدہ بھی پیدا ہوئیں یا ابھی نہیں۔

وزیر۔ جی سرکار والدہ کو پیدا ہوئے تو چار برس ہوئے۔

ضمیر الدولہ۔ تو اب چار برس کی ہیں اور تمہارے ہاں کون کون پیدا
ہو چکا ہے۔

وزیر۔ غریب پرور کس کس کو گنواؤں، دو بھائی پیدا ہوئے تین بہنیں پیدا
ہوئیں اب ایک میں رہ گیا ہوں سو اب میں بھی صبح شام میں پیدا ہونے
والا ہوں۔

گھر پہنچتے آدھی دور رستہ طے کیا ہوگا ایک بڑھیا عورت نواب ولی محمد خاں کے سامنے آئی اور کہا۔

نواب! تیرے دولہا کی عمر دراز! تین وقت کی بھوکی ہوں، اس مالک کے نام پر جس نے یہ دن دکھایا، دکھیاری کا پیٹ بھر دے تیرا لال جئے، ہزاری عمر مجھ پر بھی رحم کر!

ہٹ پرے، آگے بڑھ، بہشتا، چل رستہ دے، ہٹیا دیئے نکلی ہے، بھاگ!

اچھا بابا، اچھا خفا نہ ہو، غلطی کی، معاف کر۔

صبح علی الصباح ظہیر کو دولہا بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں بہنیں بھاوجیں بہو بیٹیاں نیگ پر اڑی ہوئی تھیں آج شادی کا آخری روز اور جشن سالگرہ کا خاتمہ تھا دودھ سے غسل دیا گیا عطر کے کنٹر لنڈھائے گئے زربفت کی اچکن کا پہلا بٹن پھوپی لگا رہی تھیں کہ موذن نے صبح کے سہانے وقت میں دنیا والوں کو ایک زبردست طاقت والے کا پیام پہنچایا پرند اسکی عظمت کا ذکر سنتے ہی تسبیح میں مصروف ہوگئے درخت جھوم جھوم کر نعرہ توحید لگانے لگے مگر غفلت کا پردہ تھا تو انسان اور اسرائیلی خاندان پر موذن کا جھنجوڑنا بیکار چڑیوں کی حمد بے سود اور درختوں کا سجدہ فضول تھا وہی رنگ رلیاں اور وہی چہل پہل صبح ختم ہوئی وقت گذر گیا نرہ جواہر دولہا پر نچھاور ہو کر عزیزوں کو نیگ ملے نوکروں کو انعام بچھ ملے سلام کو آ رہا تھا کہ طبیعت نے مالش کی قے ہوئی دست لگے اور اس غضب کے کہ وہ کی گنتی تھی نہ چار کی تار بندھ گیا دوپہر تک تو نڈھال ہو کر پلنگ سے اٹھنے کے قابل نہ تھا ولی محمد خاں بیگم صاحب خالائیں چچا سب پریشان ہوگئے ڈاکٹر بھی آگئے حکیم بھی ملا بھی اور سیانے بھی مگر ظہیر کی حالت نہ

کسی نے ہاتھ سہلانے شروع کئے کسی نے پاؤں۔ ادھر بچے نے آنکھ کھولی ادھر
چاروں طرف سے اناؤں ماماؤں کی تو باری بھی نہ آئی تھی ماں اور خالہ باپ چچا
بیتابانہ لپکے کسی نے گود میں اٹھا لیا کسی نے ہاتھ سہلائے کسی نے پاؤں۔
پانچ برس کے بعد پانچ چھ برس اور آنکھ بند کرکے گذر گئے ظہیر کی عمر اب
گیارہ برس کے قریب تھی خاندان کے ہر متنفس کی آنکھیں اسپر لگی ہوئی تھیں
اور زندگی کا یہ عاشق خاندان جو بھول کر بھی موت کا خیال نہ کرتا تھا اپنی عمر میں
دن عید رات شبرات بسر کر رہا تھا بارھویں سالگرہ قریب آئی تو دھوم دھام کی
شادی تجویز ہوئی دور دور سے مہمان آنے شروع ہوئے ہزاروں من کھانا تیار ہوا
محلسرا اور دیوان خانہ ایسا سجا کہ منہ سے بول اٹھا مشہور گویوں اور حسین طائفوں
کا تار بندھ گیا سات دن کی مہمانداری اور سب کو عام دعوت تھی مگر کھلانے والوں کا
طبقہ خاص تھا یہ نہیں کہ غریب غربا لنگڑے لولے جسکا جی چاہے دسترخوان پر
جا بیٹھے پانچویں دن سلامی تھی جسمیں لڑکا دولہا بنکر سارے شہر میں پھرتا اور
بڑی دادی جان کے سلام کو جاتا پھولوں کا گہنا اس طرح تیار ہوا کہ اڑوس پڑوس
کے تمام باغ خالی ہو گئے دولہا سلامی کو چڑھا تو اسکے جلوس میں بیسیوں ہاتھی
سینکڑوں گھوڑے ہزاروں چوبدار حاضر تھے ولی محمد خاں اپنے تزک و احتشام
کو دیکھکر پھولے نہ سماتے تھے اور بچے کو دیکھ کر باچھیں کھلی جاتی تھیں انکی نگاہ میں
اسوقت دنیا و مافیہا ہیچ تھی اور انکا خیال بادی النظر میں غلط بھی نہ تھا
دولت اعزاز صحت بےفکری کونسی شے تھی جو میسر نہ تھی رنج انکے خیال میں بھی
نہ پھٹک سکتا تھا اور تکلیف انکے ذہن میں بھی نہ آسکتی تھی دولہا گھوڑے سے
اترا سلام کو گیا گیارہ ہزار روپیہ سلامی کا آیا نقارہ پر چوٹ لگی ولی محمد خاں کو جان
کا پیارا علاوہ شاباش شاباش کہکر چاکر آپ جھیلنے کو دیتے عزیز و اقارب شاداں و فرحاں

سے کہا: ان سے کہا مگر زرت جنبا سے وہم وگمان میں بھی نہ تھی خاک نہ سمجھ سکے اسوقت ظہیر نے حسرت بھری نظروں سے ماں کو دیکھا آنسو بہہ رہے تھے زبان باہر نکال کر ماں کو دکھائی اور بمشکل ہاتھ اٹھا کر جوڑے اور پانی مانگا ماں بیتاب ہو گئی لٹکے ہاتھوں کو بوسہ دیا اس کے آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھے کہا۔

"میں اپنے لال کے لئے پانی لاؤں"

ماں پانی لینے گئی مگر اسکے منہ موڑتے ہی ظہیر کو ہچکی آئی اور وہ پانی کو ترسا شربت کو بھی ڈلتا دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ظہیر کی موت پر ان لوگوں کا کیا حشر ہوا ظاہر ہے دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی ماں اور باپ دونوں سر پھوڑ رہے تھے لیکن ظہیر کی موت انکو یہ سبق دے گئی ہر حالت میں تغیر اور ہر صورت میں انقلاب انسانی زندگی کا لازمہ ہے موت سر پر کھڑی ہے زندگی کے فانی تعلقات کو آناً فاناً ختم کر دیگی تمول میں افلاس صحت میں علالت جوانی میں بڑھاپا اور زندگی میں موت سے غافل ہونا شیوۂ انسانیت نہیں

اے انسان کس شے پر بھولا اور کس ہستی پر پھولا تیری طاقت ختم ہونے والی اور تیری زندگی مٹ جانے والی ابدی طاقت اور اٹل زندگی اس ہی ایک ہستی کی ہے۔ جو سب سے بہتر اور سب سے طاقتور ہے۔

رشی منی دیوتا اوتار ولی نبی پیغمبر دنیا ان پاک نفوس سے کبھی خالی نہ رہی۔

سنبھلنی تھی نہ سنبھلی موت کے آثار تمام جسم پر ظاہر ہو گئے ناخن نیلے ہو گئے
آنکھیں بیٹھ گئیں اور جس چہرہ کو دیکھ دیکھ کر ماں باپ ہمیشہ ناز کرتے تھے چشم زدن
میں اسپر مردنی چھا گئی شادی کا گھر موت کی محفل ہو گیا چاروں طرف لوگ
خاموش سناٹے میں بیٹھے تھے کہ بچہ گھبرا کر اٹھا برابر میں ماں تھی بیتاب ہو کر اسکی
گردن میں ہاتھ ڈالکر کہا۔

اماجان! اب تکلیف نہیں اٹھائی جاتی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی پسلیاں
نکلی پڑتی ہیں دعا کرو کہ موت اس تکلیف کو ختم کر دے۔

توج توج خدانخواستہ خدانخواستہ۔ دشمن دشمن

ایک متفقہ آواز گونجی مگر ماں کا کلیجہ بچے کی اس تکلیف سے نکل پڑا وہ فرط
محبت میں لپٹ گئی منہ پر منہ رکھدیا باپ کی آنکھ سے آنسو کی جھڑیاں بہہ
رہی تھیں غمناک آنکھیں اسکی صورت کو دیکھتی تھیں اور روتی تھیں اب اللہ
ولی محمد کو یہ خیال آیا کہ اگر موت اس لال کو مجھ سے جدا کر گئی تو کیا کروں گا اس
خیال کے آتے ہی بے اختیار ہو گیا اور جوش محبت میں اسکے ہاتھ اٹھا کر اپنی
آنکھوں پر رکھ لئے اس وقت ظہیر بیہوش ہو چکا تھا اور ہیضہ کی آخری منزل تشنج
شروع تھا خالائیں سر پیٹ رہی تھیں چچا دیواروں سے ٹکریں مار رہے تھے
ماں گم سم اور باپ ساکت تھا دونوں کی آنکھیں اس بارہ سال کے مہمان بچہ پر لگی
ہوئیں تھیں جسکو اپنا سمجھتے تھے وہ غیر کی ملکیت تھا جسکے نام سے گھبراتے تھے
وہ آنے والی اٹل جسکا نام تک لینا گوارا نہ تھا اسکی طاقت لازوال تھی۔

دفعتہً ظہیر نے آنکھ کھولی پھول سا چہرہ کمہلا چکا تھا زبان اور ہونٹ
خشک تھے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو چکی تھی اور جس پر ہزاروں روپیہ خالی
خوشیوں کے واسطے قربان ہو رہا تھا وہ پانی کے ایک گھونٹ کا محتاج تھا انتظار

جس طرح پر کہ پھنسا دینے کو بے دینوں کو نقل کرتا ہو مسلمانوں کی کافر نقال

بہر حال جلال شاہ وہ شخص تھا کہ مسلمان اس پر ہنستے اور وہ ان پر روتا تعلیم یافتہ اس کا مضحکہ اڑاتے اور وہ ان کو دعا دیتا دوست دشمن مرید اجنبی اسکی نگاہ میں سب ایک تھے بے نفس انسان اور بے پتہ کا آدمی تھا کہ حاسد جل جل کر اور بعض بعض منہ پر گالیاں دیتے برا بھلا کہتے توہین کرتے تحقیر کرتے مرید ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر ہاتھ چومتے پاؤں چومتے خدمت کرتے اطاعت کرتے مگر نہ اس سے تیوری پر بل آیا نہ اس سے چہرہ پر تازگی۔

جلال شاہ کے پیر مولانا معصوم اللہ شاہ رحمۃ علیہ قندہاری تھے انکے وصال کے بعد خلیفہ اول جلال شاہ ہوئے اور حق الامر یہ ہے کہ گو بہت سے باکمال عقیدت مند مولانا کے موجود تھے اور خلافت کی اہلیت رکھتے تھے مگر جلال شاہ کو کوئی نہ پہنچ سکتا تھا۔

شروع ہی سے جلال شاہ کو ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترک احتشام سے قطعی نفرت تھی وہ نہ خلافت کے خواہشمند تھے نہ اختیارات کے شائق ہوا نے صاف کہہ دیا کہ مجھ کو نہ اس مسند کی ضرورت ہے نہ اس [illegible] خود ہی مرید ہوں دوسروں کو کیا مرید کروں گا ایک [illegible] کرنا ہے دوگز زمین [illegible] کے ہمعصر مولانا کے شاگردان رشید [illegible] کی موجودگی [illegible] کو مجبور کر دیا اور خانقاہ [illegible] جلال شاہ کے قبضہ کا [illegible] مسلمان [illegible] دنیا [illegible] گئی

مریدوں کی تعداد [illegible] ہزار سے زیادہ ہو گئی اور معمولی نہیں

اور جب تک سے نہ یہی کچھ نہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبری ختم ہو گئی یعنی وحی کا آنا بند ہو گیا مگر نبی آخر الزماں کے بعد وہ نیک بندے یقیناً آتے رہے اور چلے گئے جو رسول تو نہ تھے مگر عاشق رسول بلکہ فنا فی الرسول، لیکن زندگی کے شیدا، لذتوں کے عاشق، عیش کے دلدادہ، ان سے بہتر بہت بڑھے ہوئے تھے، وہ دس تھے تو یہ دس لاکھ بلکہ دس کروڑ، خواہش زر کاربراری کا لازمی نتیجہ تھی حصول مقاصد کا بہترین ذریعہ لباس فقر، نتیجہ یہ ہوا، اور کچھ غلط نہ ہوا، کہ کھوٹے اور کھرے بد اور نیک جھوٹے اور سچے بُرے اور اچھے خلط ملط ہو کر سب ایک ہو گئے لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں جلال شاہ خاک حسین آباد سے ایک ایسا شخص اٹھا جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ شریعت اور طریقت تصوف اور توحید عشق اور محبت مجازی اور حقیقی اگر نیت بخیر اور ایمان سالم ہے تو سب ایک ہیں یہ پیچدار گھاٹیاں خطرناک مسافت کٹھن منزلیں فقط دیکھنے میں ٹیڑھی اور سیدھی ہیں ورنہ منزل مقصود ایک یہ اس سے آسان وہ اس سے بشرطیکہ عزم مصمم ہمت پوری دل صاف اور خیال پاک ہو۔

شریعت اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ ایک تن واحد کی کوشش اور وہ کوشش جس میں کوئی ہاتھ تک بٹانے والا نہیں ایسی کامیاب ہوئی کہ آج صرف ہندوستان میں سات کروڑ کے قریب انسان اس کا کلمہ پڑھ رہے ہیں نہ اس سے گریز ہو سکتا ہے کہ اب ہر صوبہ ہر شہر ہر گاؤں مختصر یہ ہے کہ ہر گھر میں ایک لیڈر بڑی بڑی مونچھوں والا لمبی لمبی داڑھی والا ٹخنے پر گٹے والا ڈھیلے قبا سے کرتے والا موجود ہے مگر

آج کل وہ جنہیں اسلام کا دعویٰ ہے کمال دیکھتا ہوں میں سب سے فوق ہے انکا احوال

رہتی ہو بعض دنیا دار علما نے جنکی دکانیں پھیکی پڑ جاتی تھیں انکو بدعتی کا لقب
مشرک کا خطاب کافر کا اعزاز عطا فرما دیا تھا اور بادی النظر میں ان بیچاروں
کے یہ عذرات کچھ بیجا بھی نہ تھے دنیا بھر کے چندے کر ڈالے گئے [illegible] کہیں رسالے
لکھے وعظ کہے تلقین کی انجمنیں قائم کیں مدرسے کنوئیں خانقاہیں سب ہی
چیزوں کے بنوانے کا اعلان کیا حج کی تیاری کی یتیم خانوں کی بنا ڈالی مگر وہ بات
نصیب نہ ہوئی جب تک ایک بھی قوت بھی دنیا میں موجود ہے [illegible] ہو گا نہیں
ہو سکتا کامیاب ضرور ہوتے اور بہت سے بندگان خدا ان کے ڈھنگ پر
آ گئے لیکن جو بات شاہ صاحب کے ہاں تھی وہ نہ میسر ہوئی نہ ہو سکتی تھی
باوجود اس کینہ و کاوش بغض و عداوت کے کہ مولوی انکے برخلاف ہمیشہ زہر
اگلتے رہے انہوں نے کبھی ان میں سے کسی کے برخلاف ایک لفظ تک نہ
کہا اور انکے حق میں دعا خیر کی۔

مرید انکے عاشق زار تھے اور وہ خود صرف شان میں مست تھے علائق
دنیوی اگر سنت رسول نہ ہوتے تو انکو بال بچوں کی بھی زیادہ پروا نہ تھی اور
گو انکی طبیعت اس طرف کچھ زیادہ لگاؤ نہ رکھتی تھی مگر محبوب کا فعل تھا اور
مطلوب کا ارشاد اس کو بھی سر آنکھوں پر رکھا۔ دس برس کی عمر سے ساٹھ
برس کی عمر تک تقریباً پچاس سال شاہ صاحب کی زندگی خلق اللہ کیواسطے
اسلام کا ایک قابل تقلید نمونہ رہی اور اس عرصہ میں انہوں نے دکھا دیا کہ
مسلمانوں کو کس طرح زندہ رہنا چاہیے اور خدا کی رضامندی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے

آخر عمر رو بہ انحطاط ہوئی اور [illegible]
فتور یا طاقت جسمانی میں کوئی نقص [illegible]
کا مرض بری طرح [illegible]

بڑے بڑے عالم ادیب امیر تھیں مگر سب کو یہی ارمان رہا کہ کبھی کسی خدمت کا
حکم ہو اور تعمیل کریں شاہ صاحب مجرد رہتے گھر تھا نہ بیوی تھیں نہ بچے تھے نہ بیٹیاں
تھیں بہویں تھیں دنیا کی ضرورتیں جیسی انسانی زندگی کے ساتھ ہوتی ہیں انکی
بھی تھیں مگر وہ موروثی کھیتوں کی پیداوار انکی آمدنی کا ذریعہ اور زندگی کی کل
کائنات تھی سیکڑوں ہزاروں روپیہ کی سوغاتیں مرید لاتے اور گھر میں پہنچا دیتے
مگر ان کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی وہی ایک وقت جو کی روٹی اور دو مرچ کی چٹنی
انکی غذا تھی گاڑھے کا ایک کرتا اور نیلا تہمد ان کا لباس ایک بدھنی ایک مسواک
ایک بوریا انکی جائداد تھی صبح کی نماز سے فرصت پا کر حجرہ میں چلے جاتے اور
ظہر تک اوراد و وظائف میں مصروف رہتے ظہر کے واسطے فقرائی مریدوں کا
مجمع وقت کا منتظر رہتا نماز کے بعد ان سے بات چیت کرتے اور عصر کے
بعد کلام اللہ لے بیٹھتے مغرب سے فرصت ہوتی تو گھر میں گئے عشا تک ٹھہرے
پھر باہر آئے عشا پڑھی اور جنگل [illegible] اس وقت خاص خاص مرید
ساتھ ہوتے اور فیض صحبت سے [illegible] ہوتے عام طور پر لوگوں کو ساتھ چلنے
کی اجازت نہ تھی [illegible] خدمت میں حاضر رہتے تھے
اور یہ وہ لوگ تھے جن کی ایک ایک نظر انسان کو پارس بنا دے

[illegible] کا حکم مسلمانوں کو کلام اللہ سے دیا اور جس کا اسلام
مسلمانوں [illegible] شاہ صاحب کے ہر فعل [illegible] سے زندگی کے
ہر شعبہ سے [illegible] سے گفتار کی ہر ادا سے ٹپک رہا تھا وہ بظاہر
[illegible] کھاتے تھے پیتے تھے اور دنیا کے تمام
کام [illegible] الرسول تھے سوتے میں اٹھتے میں بیٹھنے میں
[illegible] ایسا تھا کہ انکی زبان اس ذکر سے خالی

مریدوں کا مجمع ہر لمحہ انکی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور ان آخری دنوں میں شاہ صاحب انکو جب طبیعت ٹھیک ہوتی نصیحت فرماتے تو رہتے تھے ایک روز آدہی رات کے وقت طبیعت کو زیادہ سکون تھا میں بھی حاضر تھا کہ شاہ صاحب نے اپنے موت کے متعلق اس طرح گفتگو کی۔

مذہبا موت کی تمنا جائز نہیں اسلئے میں ہرگز موت کا متمنی نہیں مگر موت سے غافل ہونا مسلمان کی نشانی نہیں اسلئے میں نے ہمیشہ اسکو یاد رکھا اور ہر وقت اسکے لئے تیار رہا یہی تھی وہ تیاری جسنے دنیا اور دنیا کے فانی جلوے میری نگاہ میں ہیچ کر دئے اور میرا مقصد کسی طرح منزل مقصود تک پہنچتا رہا پھر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوا اور کیا ہوگا۔ دنیا کا قیام قریب ختم ہو گیا اور اب دوسرا سفر شروع ہوتا ہے یہ ہے وہ سفر جسکی ہر منزل کٹھن اور ہر قدم خوفناک لوگ سمجھتے ہیں کہ موت انسانی زندگی کو ختم کر گئی مگر نہیں بات یہ نہیں ہے موت کہتے ہیں انتقال کو یعنی تبدیل ہو جانا روح کا ایک جگہ سے تبدیل ہو کر دوسری جگہ چلی گئی درحقیقت اسلام نے روح کا مسئلہ ابھی طرح حل نہیں کیا اور یہ ایک زبردست مصلحت تھی اور صرف حکم رب بتا دیا مگر جہانتک اسلام نے ہماری سمجھ کے لائق اسکی تصریح کی وہ یہی ہے کہ روح ایک جسم کو چھوڑکر دوسری ہیئت اختیار کر لیتی ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زندگی ختم ہو گئی اگر ایسا ہو تو موت سے بہتر اور اچھی تو کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی کہ سب عذابوں سے چھڑوا دے۔ موت ہادم اللذات ہے اور ان تعلقات کا خاتمہ کر دیتی ہے جو یہاں ہمنے اپنی ذات کے ساتھ پیدا کر لئے اور جو درحقیقت مستقل نہیں بلکہ ہماری زندگی تک یا اپنے وجود تک کے تھے یہ تبدیلی یا انتقال موت سے ظہور پذیر ہوتا ہے پہنچاتا ہے ہمکو اس مقام پر جہاں اس زندگی کے

اشتغال میں فرق آنے نہ دیا مرض کی طرف توجہ ہوتی نہیں۔ یہ لاپروائی شاہ صاحب
کے واسطے اچھی نہ ہوئی اور اندر ہی اندر بیماری ترقی کرتی گئی نوبت یہاں تک
پہنچی کہ ایک نوالہ بھی حلق سے اتر جاتا تو سانس کا لینا دوبھر ہو جاتا کھانے کی
طرف رغبت ہمیشہ کم رہی اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف آدھ سیر
جو کا آٹا معمول رہا مگر پھر بھی بھوک اضطراری تھی اور حیات انسانی کا لوازمہ
عصر کو نہیں عشا کو رات کو نہیں صبح کو لگتی اور مجبوراً دو چار نوالے جس طرح بھی ہوتا
کھاتے لیکن روٹی تیر کی طرح لگتی اور پانی چھریوں کی طرح گھٹتا سانس لینا
مصیبت ہو جاتا اور سینہ کی یہ کیفیت ہو جاتی گویا کوئی تیز چاقو سے کھرچ رہا
ہے یہ حالت شاید تین مہینہ تک رہی اور اب شاہ صاحب کو اپنی زندگی
سے قطعی مایوسی ہو گئی دعوت کے واسطے ہر وقت تیار تھے موت کو یقینی
سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ اسکا کوئی وقت مقرر نہیں یہ علم انسان کو نہیں
دیا گیا مگر اب اس حالت نے اچھی طرح یقین دلا دیا کہ اور چند روز کی [illegible]
وہ وقت قریب آگیا ہے کہ دنیا سے رخصت ہو کر خدا کے حضور میں حاضر ہوں۔

شاہ صاحب کی خبر علالت اور مرض الموت ایسی چیز نہ تھی کہ چھپی رہتی
اور ظاہر ہو جاتی تو معمولی بات ہو کر ختم ہو جاتی مریدوں کی تعداد اتنی معقول تھی
اس قدر عام ہر دلعزیزی ایسی زیادہ تعلق اتنا بڑھا ہوا انکسار سے کچھ مرید کیا اور غیر
مرید کیا ہر شخص شاہ صاحب کا عاشق تھا جن لوگوں نے اپنی نفسانیت اور
دنیاداری کی وجہ سے ہمیشہ عداوت رکھی وہ بھی [illegible] ان کی
خلقت کے معترف اور خلوص کے مداح تھے۔

اب شاہ صاحب کو اٹھنا بیٹھنا دوبھر ہو گیا اور چند روز میں یہاں تک
نوبت پہنچی کہ بیٹھ کر نماز کے واسطے بھی خود نہ جا سکتے تھے اور یہ حالت تھی

اعمال وافعال کی جوابدہی اور بازپرس ہے اس وقت تک صرف دو باتیں ہمارے
سامنے ہوتی ہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد مگر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ حقوق اللہ
کے احکام صرف حقوق العباد کی ادائی کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں جب تک
کبھی حاکم کا ڈر نہ ہو جمعیت باہمی سازش اور اطمینان سے زندگی بسر نہیں کر سکتی
مگر قانون کا منشا صرف یہی ہے کہ مظلوم ظالم کے ظلم سے کمزور طاقتوروں
کی طاقت سے محفوظ رہیں دنیوی قانون تمکو چوری دغا مکر فریب سے روکتا ہے
اور قدرت کا قانون اس سے کچھ اور توقع رکھتا ہے تم ہی جیسے ہزارہا بندگان خدا
جنکے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک تمسے بھی بہتر ہیں بدترین زندگی بسر کر رہے ہیں اور
تمہاری ہمدردی کے محتاج ہیں رانڈیں جو پردہ کی بیٹھنے والیاں ہیں معصوم
بچوں کو کلیجہ سے لگا کر سنسان وقت میں بھوکی پیاسی خاموش پڑ رہتی ہیں اور
یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تم اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر کر اچھی طرح خود کھا کر
انکو کھلا پلا کر ہنستے بولتے ہو کھیلتے کودتے ہو اور ایک لمحہ کو بھی اس
بدنصیب کا خیال نہیں کرتے جسکا یتیم بچہ دو وقت کے فاقہ سے ماں کی گود میں پڑا
مٹر مٹر اسکا منہ تک رہا ہے اسکے سر پر وارث نہیں ہے جو اسکو کما کر کھلائے ان قدرت نے انکے حقوق اس وقت
موت نے اسکو بیکس کر دیا تم پر مقرر کئے اور یہی بہت بڑا حقوق العباد ہے اپاہج بیکس حاجتمند جنکا
دینے والا سوا خدا کی پاک ذات کے کوئی نہیں کہاں سے اپنی ضرورتیں پوری کریں خدا انکو خود
کر دینے سے رہا تمکو جو کچھ دیا ہے اس میں انکا حصہ بھی شامل ہے نہیں دیتے خود
کھاتے ہو غضب کرتے ہو ظلم کرتے ہو اور حقوق العباد میں مبتلا ہوتے ہو یہ ہیں وہ
جرم جنکی بازپرس ہوتی ہے اور جنکی وجہ سے میرا تمام اعمالنامہ سیاہ ہے میں کہنے
کہہ رہا ہوں کہ موت کے واسطے تیار تھا مگر غلط کہہ رہا ہوں ایک کام بھی ایسا نہ
تھا جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتا امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ پہلے فرمایا تھا

[illegible] یہاں بھی موجود تھیں کہ [illegible] انکی صحبت سے چھوٹنے والا تھا
سعیدہ [illegible] ضرورت کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جاتے اور آپکی نماز قضا نہ ہو ٹھیک
مغرب کے وقت [illegible] سنا کیا جائے۔ شروع شروع میں سلطان مرزا کا بھی
نیا شوق اور گھونگٹ کی نئی دلہن طبیعت زوروں پر تھی کچھ بگڑا جبین بہ جبیں
ہوا خاموش رہا بات کم کی مگر خیالات جو پرورش پاتے پاتے راسخ ہو چکے تھے
اب کیا مٹتے اس نے شوہر کی فرمان برداری ایسی کی کہ چندہی روز میں سلطان
اسکے پاؤں دھو دھو کر پینے لگا۔

سعیدہ بانو گرے پڑے باپ کی بیٹی نہ تھی دادا صدر الصدور باپ
ڈیڑھ سو کا سرشتہ دار پہلوٹھی کی بچی اور اکلوتی اللہ آمین سے پلی نازو نعم میں
بڑھی [illegible] الفت محبت ماں تا اور ہوش کسی چیز نے اسکو مستقبل سے بیہوش نہ کیا
شوہر کی [illegible] ساس نندوں کی خدمت سے ساری سسرال گرویدہ ہوگئی
[illegible] تھی [illegible] پہ ہوئی تو نہ جامہ سے باہر ہوئی نہ حالت میں فرق
[illegible] کی تھی [illegible] جو شیوۂ انسانیت ہے اسوقت
[illegible] ہاتھ سے [illegible] گئی۔

بیٹے کو تو [illegible] طبیعت اور مالدار کے ہاں قسمت ہی
[illegible] امیر کے کم نہیں ہوتی ہاں امیر کے
[illegible] غریب دل مسوس کر رہ جاتا ہے
[illegible] خدا اس سے راضی خلق خدا اس سے
خوش [illegible] پہنچے ہوتے [illegible] اوپر تلے کے بہن بھائی برابر
کے لڑتے [illegible] لڑکیاں دن بھر [illegible] غل غپاڑا کر کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی
اب اسکو چاہئے ماں کی تربیت کہو یا باپ کا خوف کہ اسکے سامنے تو ذرا امن ہو جاتا

اماجان روتی کیوں ہو بچہ کے اتنا کہنے سے دل زیادہ بگڑا بچہ سے لپٹ گئی بچہ
سے لپٹ گیا ماں کے آنسو پونچھ کر خود بھی رونے لگا بچہ کو پیار کیا اور کہنے لگی نہیں
میاں روتی نہیں ہوں اللہ تمہاری عمر دراز کرے دشمن روئیں۔

(بچہ) اماجان بھوک زور کی لگ رہی ہے دیکھئے شام کی روٹی
کھائے ہوئے ہیں۔

(ماں) میاں صبر کرو دیکھو اللہ بھیجے گا چپکے سو جاؤ میں تم سب کو جگا کر
کھلا دوں گی۔

بانو نے کہنے کو یہ بات بچہ سے کہہ دی مگر طبیعت بھری آ رہی تھی
کہ کیا سے کیا ہو گیا جن بچوں پر دو دو تین تین نوکر اور انائیں موجود تھیں آج
وہ مٹھی مٹھی چنوں کو ترس رہے ہیں منہ پھیر کر روتی تھی اور آنسو پونچھ کر چمکارتی
تھی بانو ادھر مصروف تھی دروازہ پر بولا دال موٹھ والا اور چھوٹا بچہ پیسہ کے مرمرے
اور پیسہ کی دال موٹھ لے آیا تین برس کی جان بساط کیا تھی جھولی پھٹی ہوئی
ساری دال اور مرمرے موری میں گر پڑے دو دانے باقی رہ گئے ابھی ماں کے
پاس پہنچا بھی نہ تھا کہ چنے والے نے پیسوں کا تقاضہ کیا بانو کو اس وقت دو پیسے
دو اشرفیوں سے زیادہ تھے کچھ دیر خاموش رہی مگر جب اس نے زیادہ بگڑنا اور
چلانا شروع کیا تو دروازہ پر آئی اور کہا۔

بھائی! تم نے سودا کیوں دے دیا بچہ ہے سب پھینک دیا اس وقت پیسے
نہیں ہیں پھر لے جانا۔

چنے والا۔ پھر لے جانا، دو پیسہ کے لئے تو ضرور آؤں گا میں نہیں جانتا
چنے کے پیسے لاؤ لاؤ جلدی کرو دیر ہوتی ہے۔

بانو۔ بھائی میں سچ کہتی ہوں پیسے موجود نہیں ہیں پھر لے جانا

خاموش تھی گم صم ہر وقت کسی خیال میں مستغرق اور ہر لمحہ کسی فکر میں سرشار پڑی
خبر ہی یہ آ کر پڑی کہ دیور مغلی کھونسا جسنے ہمیشہ کھایا اور نگلا بھائی کے مرتے ہی دیدے
بدل گیا اور ساری جائداد دبا بیٹھا۔ بانو پردہ نشین بچے معصوم لڑنا تو درکنار کوئی
بولنے کے قابل بھی نہ تھا رتی رتی سارا مال قبضہ میں کر لیا اور سوا تھوڑے
سے زیور اور گھر کی معمولی چیز بست کے بانو اور اسکے بچوں کے پاس کچھ نہ رہا
کچا ساتھ خالی ہاتھ چھ بچے اور سب نادان بڑا مکان چھوڑ تین روپیہ ماہوار
کے مکان میں چلی آئی زیور اور اثاثہ کب تک چلتا ایک سال ہی بھر میں ٹھکانے
لگ گیا اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔

اب البتہ بانو کے ہوش حواس بگڑ گئے آمدنی کوڑی کی نہیں آٹا چاہیے
دونوں وقت میں پانسیر بوٹا اور کٹورہ دوپٹے اور قالین سب بک گئے مگر
پیٹ کی آگ کسی طرح نہ بجھی جب گھر کا صفایا ہو چکا اور دانت کریدنے کو تنکا
تک نہ رہا تو سوچا مزدوری کروں۔ سلائی سیئوں نوکری ڈھونڈوں۔ ماماگیری کروں
لیکن کسی طرح ان معصوموں کے حلق میں ٹکڑا ڈالدوں۔ راتیں اس طرح بیتیں
کہ برسات کی اندھیری گھپ راتوں میں مٹی کا دیا تک نصیب نہ ہوا دن اس طرح
گزرتے کہ صبح سے شام تک بانو اور اس کے کلیجہ کے ٹکڑے لق لق کرتے
پھرتے پڑے رہتے اور قدرت کے زبردست انتظام نیند کے فعل کو پورا کر دیا
ایک دن پوری رات اور سارا دن سات دمونہر فاقے سے بسر ہو گیا شام
کے وقت ایک دو نہیں اکٹھے چاروں ایک ایک [illegible] آخر تڑپتے اور پھر کوئی
ماں کے پہلو پر [illegible] فاقہ زدہ بچے اور [illegible] کے معصوم سونا صورت دیکھکر کلیجہ
کٹ گیا پہلا دن اور شاید پہلا موقعہ ہوگا کہ بانو کی آنکھ سے ٹپ ٹپ
آنسو گرنے لگے بڑا بچہ جو کل سے سات برس کا تھا ماں سے قریب آیا اور کہا

روز بروز بدتری سے ہے کیا ہوگا یہ وبا کا ایسا بیٹھا کہ آخر رات کو جب تارے کھلے
ہوئے تھے اور بانو خدا کی قدرت میں محو اپنے مستقبل پر غور کر رہی تھی بخار سا
چڑھا گلا بھی جاڑے سے تھے کپڑا بدن پر تھا نہیں سینہ میں درد شروع ہوا اندر
آکر لیٹ گئی سمجھی کہ اب چلنے کا وقت ہے یہ خیال آتے ہی کلیجہ امنڈنے لگا۔
بچوں کو بلا کر گلے سے لگایا ایک ایک سے چمٹی اور کہا کلیجہ کے ٹکڑو ماں کی حالت
خراب ہے باپ کا سایہ تمہارے سروں پر سے اٹھ گیا ماں اس قابل بھی نہ نکلی
کہ تم معصوموں کے پیٹ بھی بھر دیتی پیارو دیکھ رہی ہوں کہ پرسوں سے بھوکے
ہو مگر کیا کروں کوئی جگہ نہیں کدھر جاؤں کس سے مانگوں زندہ رہی تو کسی کے
ہاں نوکری کروں گی اور تمہارا پیٹ بھروں گی دعا کرو کہ اچھی ہو جاؤں بچو
بیٹھو میرے پاس بیٹھو یہاں سے نہ سرکو میری آنکھیں تمکو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی ہو رہی
ہیں اور گو درد کی شدت بخار کی تیزی حد سے زیادہ ہے مگر دل تمہاری
صورتوں سے تسکین پا رہا ہے۔ فردوس دیکھ چھوٹا رو رہا ہے اس کو گود میں
لے لے لا میرے سینہ پر ڈال دے آ میرے ہاتھیں قربان گئی [illegible]
شکر ہے ایک پیسہ نہیں کہ اسکو دودھ منگوا دیتی دن کا بھوکا پیاسا [illegible]
بخار تیز ہو رہا تھا بچے چاروں طرف [illegible] رو رہے تھے کسی کے سر پر
ہاتھ پھیرتی تھی کسی کو کلیجہ سے لگاتی تھی روتی تھی [illegible] پیٹتی تھی اور چیختی تھی۔
رو رو کر کہتی تھی کلیجہ کے ٹکڑو [illegible] دعا کرو کہ اچھی ہو جاؤں [illegible] صبح
ہوگی باہر نکلوں گی ٹہل کروں گی [illegible] بچوں کو [illegible] دیکھوں گی
[illegible] سے مر جاؤں گی تو کیا کرو گے [illegible] نوکری [illegible]
تک زندہ رہوں گی [illegible]
پڑھ گئے زبان [illegible]

چنے والا۔ کیسی پھر نقل جاتی رہی ہے پھر لیجانا پھر لیجانا کیا مفت کا مال تھا
بچہ سے منگوا اور رکھ لیا پیسے پھر لیجانا کوئی لٹس پکر باندی ہے۔
گھبرا گئی پریشان ہو کر گھر میں آئی پیسہ تو درکنار کوئی چیز بھی نہ تھی کہ
دے کر پیچھا چھڑاتی چنے والا اور شور سے چلا رہا تھا محلہ کے بچے جمع ہو گئے
ایک نے آکر کہا۔

ارے بی پیسے کیوں نہیں دیتیں اس بیچارہ کو دیر ہو رہی ہے۔

بانو۔ اچھا میاں

دوسرا لڑکا۔ لاؤ تو لاؤ۔

بانو۔ اس سے کہدو پھر لیجائیو۔

لڑکا۔ وہ تو اب لیکر جائے گا پھر وہ نہیں جانتا اور نہیں تو لڑکے کو
باہر بیچدو وہ اس سے لیگا۔

اتفاق کی بات تھی کہ اسوقت چمپا پرانی ساتھنی مدتوں کے بعد نکل آئی
بچے اسکو دیکھ کر اچھلنے لگے سلام کر کے بیٹھ گئی بانو کا رنگ دیکھکر دنگ
رہ گئی اور چنے والے سے پوچھ کر کہا کہ

ارے بی پیسے دیتی ہو یا ڈاکی پہ اتر آئیں۔

بانو ہل گئی اور چمپا سے کہا بوا تیرے پاس دو پیسے ہیں۔

چمپا نے کچھ سوچا اور پھر کہا آٹے کے رکھے ہیں لو لیلو۔

دو پیسوں کے واسطے بانو نے چمپا کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ اور پیسے چنے والے
کو دیدئے۔ بات معمولی تھی کئی گذر ہی ہوئی مگر آج کا چرکا ایسا اسکے دل پر
بیٹھا کہ ساری رات روتی رہی سوچتی تھی کہ وارث سر پر نہیں میں ایک عورت
ذات اور ان بچوں کا۔ کیا کرونگی یہاں تک نوبت پہنچ گئی اب

موت کا فلسفہ بیان کرنا فضول سی بات ۔ ہر عالم و جاہل اور ہر فلسفی و
عاقل بغیر فلسفے کے اسکی کیفیت سے واقف و آگاہ ہے۔ دنیا کی ایک چیز بھی
ایسی نہیں بلکہ معلومات انسانی میں ایک وجود بھی ایسا نہیں جو شبہ و یقین
کے منازل سے نہ گذرا ہو یہاں تک کہ وجود باری بھی شک اور یقین کی
کشمکش میں پڑ گیا لیکن دنیا خواہ ہر چیز کو حتی کہ اپنے نفس و وجود کو بھی شک و شبہ
سے دیکھے لیکن موت کی نسبت جرات نہیں کر سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ موت
ہادم اللذات ہے اسکا آنا برحق اور اسکے نتائج محزنہ کا مرتب ہونا یقینی ہے نہ
عجز و مسکینی اسکو روک سکتی ہے نہ سلطنت کا جاہ و جلال اسکو منع کر سکتا ہے نہ
تقوی و طہارت اسکو باز رکھ سکتا ہے۔ فقیر کا ٹوٹا ہوا جھونپڑا اور بادشاہ کا عالی
شان قصر حکومت اسکے نزدیک دونوں یکساں ہیں جس طرح وہ کھلے ہوئے میدان
میں باآسانی گذر کر سکتی ہے بالکل اسی طرح شہنشاہوں کے پردہ پوشیدہ میں
بھی داخل ہو جاتی ہے۔ اسے روتے ہوئے باپ کی بیکسی اور دکھیاری ماں کی بیکلی
پر کبھی رحم نہیں آیا وہ آرزومند [illegible] اور تمناؤں کے [illegible]
عالت سے کبھی مرعوب [illegible] وجاہت [illegible]
بکی [illegible] راحت [illegible] کے احساس [illegible]
[illegible] سرکشی اور [illegible]
اور انسانی [illegible] اسکے [illegible]
[illegible] دنیا [illegible]
نہیں [illegible] اسکی [illegible] اس کی موت
[illegible] ہے۔
لیکن [illegible] کا بہتر [illegible]

پلائیں اچھی ہو جاؤ گی۔

فردوس بڑی بچی تھی سمجھتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے ہچکی بندھ گئی دوڑ کر ماں کے کلیجہ سے چمٹی دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈالدیے اور کہنے لگی بیٹی ہراساں نہو اللہ رحم کرے گا ارے میرا پنڈا جھلس رہا ہے تجھکو بخار نہ ہو جائے چمٹ مت ہٹ جا۔

بڑا لڑکا خاموش بیٹھا حسرت سے ماں کے چہرہ کو تک رہا تھا نگاہ بچہ پر پہنچی کہنے لگی کیوں میرے لال چپکا کیوں ہے اٹھتی ہوں بھیک مانگونگی اور لاؤنگی آ میرے پاس آ میرے چاند لپٹ جا۔

بچہ کا دل پہلے ہی سے بھر رہا تھا ماں کے اتنا کہتے ہی بیتاب ہو گیا اور چیخ مار کر گلے سے لگ گیا بانوں کا ہاتھ بڑے بچے کی کمر پر تھا کہ ہچکی آئی اور فاقہ زدہ بچوں کو بھوکا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

اب تک میں نے اور مولانا راشد الخیری نے جسقدر مضامین موت کی نسبت اس کتاب میں لکھے وہ یا خیالی تھے یا واقعات کو خیالی پیرایہ میں دکھایا گیا تھا [illegible] مضمون ناقص رہ جاتا ہے جبتک رسالہ [illegible] چنانچہ مولانا عاشق حسین صاحب وارث سرہندی نے تحریر فرمایا ہے [illegible] مشہور [illegible]

دنیا کا کہ میرے بعد میری اولاد اور اعزہ کیا کریں گے کیونکر زندگی بسر کرینگے مگر اس
بادشاہ نیک نہاد نے دنیا کے غم کو دور کر دیا کیونکہ ہر شخص مرنے کے وقت مطمئن ہوتا ہے
کہ میرے بعد میری اولاد میری جگہ پر مقرر کر دی جائے گی اور جس طرح میری گذر
اوقات ہوتی تھی اسی طرح میری اولاد کی بھی ہوگی۔

فیروز شاہ بڑی شان و مرتبہ کا بادشاہ ہوا ہے وہ نہایت مستقل مزاج
اولوالعزم صاحب اقبال اور جاہ جلال تھا فیروز آباد جیسے عظیم الشان شہر کی تعمیر
اسکی حوصلہ مندی کی دلیل ہے نوے برس کی عمر پائی اور چالیس برس تک نہایت
شان و شوکت کیساتھ سلطنت کی۔ آخر عمر میں جب اس میں کچھ تعطل نمودار ہوا تو ایک بدباطن
وزیر کے ورغلانے سے اپنے بیٹے کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا مگر وہ اپنے مکان میں
متفق ہوکر بیٹھ رہا اور موقع پاکر مسلح ایک ہوادار میں بیٹھ کر شاہی زنان خانہ میں داخل
ہوگیا اور وہاں سے بادشاہ کے حضور میں پہنچکر قدموں میں سر رکھ دیا اور عرض کیا کہ
اگر میرا ارادہ کچھ اور ہوتا تو اس وقت سے اچھا کونسا موقع تھا یہ محض وزیر کی شرارت
ہے کہ حضور کو میری طرف سے مکدر کر دیا وہ چاہتا ہے کہ وہ [illegible] کا خاتمہ کرکے
خود تخت حکومت پر بیٹھ جائے۔

فیروز شاہ نے اس کا سر اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وزیر کے قتل کا حکم صادر
کر دیا اسکے بعد فیروز شاہ تخت سے علیحدہ ہوکر یاد الٰہی میں مصروف ہوگیا اور
بیٹے کو تمام سلطنت سپرد کر دیا تھوڑے دنوں زندہ رہا اسکے بعد ۱۸ رمضان ۷۹۰ھ
کو وفات پائی۔ وفات فیروز مادۂ تاریخ ہے۔

یہ وہ فیروز شاہ ہے جس کی عظمت اسکے بنائے ہوئے شہر کے کھنڈروں سے اب تک
نمایاں ہو رہی ہے لیکن اب اسکی اقبال مندی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا صرف چند
ویران وحشتناک کھنڈر ہیں جو اسکی ماتم گساری کا فرض ادا کر رہے ہیں یہ کھنڈر

عظمت و وقار سے مرعوب کر دیتی ہے یہ نیک دل عالی حوصلہ کریم النفس و دانشمند بادشاہ
آج سے پانسو برس پہلے ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ تسلیم کیا جاتا تھا فیروز آباد کا
عظیم الشان شہر اسنے آباد کیا عالیشان عمارتیں بنوائیں دہلی کے قرب و جوار میں [illegible]
باغات لگوائے تمدنی و اقتصادی ترقی میں نہایت زیرکی و دانشمندی سے سرگرم رہا۔
شریعت کا تابع اور سہل العمل قانون بنایا اور نافذ کیا رعایا کی فلاح و بہبود میں کبھی
غفلت نہ برتی فیروز شاہ کی نیک نیتی صرف اسی ایک واقعہ سے ظاہر ہوتی ہو کہ چالیس
سال کے عہد حکومت میں کبھی اسکی رعایا کو قحط سالی کے آلام و مصائب سے سامنا
نہیں کرنا پڑا۔ اسکی فیاضی و دریا دلی نیز مخلوق نوازی و رعیت پروری کا اندازہ اس سے
کرو کہ جسوقت وہ تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا جسقدر بقایا لگان و تقاوی کا سرکاری
روپیہ رعایا کے ذمہ تھا سب معاف کر دیا اور نہ صرف معاف کر دیا بلکہ وہ تمام کاغذات
جنہیں پر حساب کتاب تھا جلوا دیا۔

وہ تمام عمر حوصلہ مند بادشاہوں کی طرح مہمات ملکی کے سر کرنے میں مشغول رہا
گجرات اور ٹھٹھہ کی مہموں کو اسنے فتحمندانہ خاتمہ تک پہنچایا سکندر خاں کو شکست دی اور
دوسرے باغیوں اور مفسدوں کا بھی قرار واقعی استیصال کر دیا لیکن باوجود جنگی مصروفیت
کے ملک کے اندرونی انتظامات سے کبھی غافل نہ ہوا۔ وابستگان دامن دولت کا
اس قدر خیال ملحوظ خاطر تھا کہ انکے لئے یہ عام قاعدہ مقرر کر دیا کہ جب کبھی کوئی ملازم
سرکاری فوت ہو تو اسکی جگہ پر ہر حالت میں اسکا بیٹا مقرر کیا جائے بیٹا نہ ہو تو اسکا
داماد و داماد نہ ہو تو غلام اور غلام بھی نہ ہو تو کوئی رشتہ دار اور اس کا رشتہ دار بھی نہ ہو
تو اسکی بیوی کا کوئی قریب یا بعید کا رشتہ دار اس جگہ پہ مقرر کیا جائے اس امر سے
متاثر ہو کر شیخ الاسلام شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے لکھا کہ آدمی کو مرنیکے وقت
صرف دو غم ہوتے ہیں ایک تو دین کا سو اس کا حال کسیکو نہیں معلوم کہ کیا ہوگا دوسرے

نگاہیں خرچ کرنیکے لئے بیشمار دولت حکم پر چلنے کے لئے لاکھوں آدمی۔ آہ کیسا دردناک اور الم انگیز وقت ہوتا ہوگا جبکہ ان سب سے جدا ہوتے ہونگے ایک ایک چیز پر انکی نگاہ حسرت بار پڑتی ہوگی اور انتہائی مایوسی کے ساتھ وہ سب کو چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہونگے۔

اس سے زیادہ عبرت ناک شاہجہاں کی موت ہے جو تیموری خاندان کا چشم و چراغ تھا جسنے برسہا برس باعث شان و شکوہ حکومت کی اتنی بڑی وسیع اقلیم ہند کا یکہ و تنہا فرمانروا بیشمار خزانے کا مالک لاکھوں آدمیوں کی فوج اسکی تابعدار اور اسکے حکم پر جان دینے کے لئے طیار جسنے دلی جیسے عظیم الشان شہر کو آباد کیا تاج محل لال قلعہ موتی مسجد اور جامع مسجد دہلی جیسی عدیم النظیر عمارتیں بنوائیں مگر مرا اس شان سے کہ نہ وہ تخت تھا نہ تاج نہ فوج تھی نہ سپاہ نہ حکم تھا نہ فرمان نہ وہ شان و شوکت تھی نہ وہ شاہانہ اقتدار سب سے بیدخل سب سے جدا قلعہ کے اندر قید کی بیکسی کے عالم میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

نادر شاہ جیسا جابر و ظالم بادشاہ جسنے ایران سے لیکر ہندوستان تک خون کا دریا بہا دیا۔ لاکھوں انسانوں کو جانوروں کی طرح بیدردی و بیرحمی کے ساتھ ذبح کرا دیا شہروں کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا انسانی آبادی کا مستقر جنگلی جانوروں کے رہنے کا بھٹ بنگئی۔ ظلم و سفاکی جبر و تعدی خونریزی و خونخواری کا پیکر مجسم جسنے بے قصور انسانوں کو آپ اپنے قتل پر مجبور کر دیا جسنے خوشہ چین کسانوں کو یہ کہکر تلوار کے گھاٹ اتار دیا کہ این بیچارگان را از زحمت خلاص کنید۔

وہ بھی موت سے کہ جس سے خوفزدہ ہو کر ہمیشہ قتل و غارت کا تماشہ دیکھتا رہا بالآخر جب وہ خیمہ کے اندر سو رہا تھا ... دیکر مار کر صبح تک آپ اپنی گردن مارد جیسا کہ اس سے پہلے ... تھا اور یہ پامال ہندوستان نے اسکو پیدا کر دیا تھا لیکن

عبرت کی تصویر اور بصیرت کا وقیع نمونہ [illegible] صبح کا نور [illegible]
انکھیں [illegible] کا جرات تھے نہیں [illegible] کسی [illegible] شاہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

چشم عبرت واکشا و حال شاہان را نگر — کہ چسان از گردش گردوں گرداں شد خراب
پردہ داری میکند بر قصر قیصر عنکبوت — بوم نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

موت کا وقت آیا تو ساری دولت و حکومت دھری رہ گئی نہ فوج و سپاہ کام آئی نہ جاہ و جلال سپر بنا نہ سطوت و جبروت بچا سکے۔

پھر دیکھو کہ بادشاہ کی موت کس درجہ عبرت پذیر ہوتی ہے موت کی تکلیف ترک تعلق کی وجہ سے ہوتی ہے جسکے تعلقات زیادہ وسیع ہوتے ہیں اور جسقدر دنیا کی چیزوں میں وابستہ ہوتا ہے اسی قدر رنج و محن زیادہ ہوتا ہے۔ اگر آرزوئیں محدود اور تمنائیں مختصر ہوں تو اسی نسبت سے انکی جدائی کی تکلیف ہوتی ہے لیکن بادشاہوں کی وابستگی اور ان کے وسعت تعلقات کا کیا ٹھکانا ہے۔

ایک گدا کی موت چنداں اہم نہیں اسلئے کہ وہ پہلے ہی کونسا ایسا شاد کام تھا جس سے علیحدہ ہونا اسکے لئے باعث تکلیف ہو لیکن بادشاہ جسکو ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہیں عیش و آرام اسکے در کے غلام اور راحت و مسرت اسکے گھر کی کنیز ہوتی ہے وہ گوشہ چشم کی خفیف سی حرکت میں ادھر کی دنیا اُدھر کرسکتے ہیں کھانے کیلئے بہترین غذائیں۔ پہننے کے لئے نفیس ترین کپڑے رہنے کیلئے عالیشان محل سیر کیلئے بہشت زار تفرج

عبداللہ ابن زبیر نے معاویہ کے بعد اپنی دعوت شروع کی ان کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں انکے بھائی مصعب ابن زبیر بھی برابر کے شریک کار تھے چنانچہ بنو امیہ کی سطوت و جبروت کے باوجود ابن زبیر کو اس قدر کامیابی ہو گئی کہ تمام حجاز اور عراق کا زیادہ حصہ کچھ ایران کی زمین ان کا قبض و دخل ہو گیا اور یہاں کے لوگوں نے عبداللہ ابن زبیر کی بیعت کر لی۔ گویا قریب قریب نصف سلطنت پر قابض ہو گئے۔

لیکن ظالم کی رسی دراز خدا کو یہ منظور تھا کہ بنی امیہ کے مظالم و ستمکاریاں حد سے گذر جائیں اور مظلوم کی بیکسی آخر نقطہ مایوسی پر پہنچ جائے چنانچہ عبداللہ ابن زبیر کی فتوحات کا سلسلہ ختم ہو گیا اور رجعت قہقری شروع ہوئی مصعب مارے گئے اور تمام مقبوضہ ملک ہاتھ سے نکل گیا صرف مکہ معظمہ پر ابن زبیر کا قبضہ تھا جسکو انہوں نے اپنی شہادت کے بعد ہاتھ سے جانے دیا۔

مصعب ابن زبیر کے قتل اور مقبوضات کے ہاتھ سے نکل جانیکے بعد عبداللہ ابن زبیر مکہ میں قلعہ بند ہو گئے۔ اور عبدالملک نے تین ہزار لشکر کے ساتھ حجاج بن یوسف ثقفی کو روانہ کیا اور ابن زبیر کو انکے ہمراہیوں سمیت ایک امان نامہ بشرط اطاعت لکھکر حجاج کو دیدیا۔

حجاج جمادی الاولی سنہ ۷۲ھ کو کوفہ سے روانہ ہو کر طائف میں قیام پذیر ہوا اور وہیں سے وقتاً فوقتاً لڑتا رہا چند روز کے بعد حجاج نے عبدالملک کو لکھا کہ عبداللہ ابن زبیر کی قوت بالکل گھٹ گئی ہے اگر آپ حکم دیں اور میری امداد پر مزید لشکر بھیجیں تو انکا محاصرہ کر لیا جائے اسپر عبدالملک نے طارق کو حجاج کی امداد پر مامور کیا چنانچہ طارق مدینہ منورہ آیا وہاں ابن زبیر کے گورنر کو معزول کر کے اپنا گورنر مقرر کیا اور پانچ ہزار سوار ساتھ لیکر مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسکو کیا معلوم تھا کہ جو حکم اس نے دوسروں کے قتل کا دیا ہے وہ اسی کا خاتمہ کر دیگا
چنانچہ ان محافظین نے تہیہ کر لیا کہ اس مصیبت سے دنیا کو نجات دیدینا چاہیے
نادر شام تک قتل و خونریزی کا تماشہ دیکھتا رہا رات کو اپنے خیمہ میں سونے کیلئے گیا
اور چاروں طرف ہتھیار رکھ کر سو گیا لیکن موت خواہ تلواروں کا حصار ہو یا نیزوں کا
اسکی آمد کو کوئی نہیں روک سکتا چنانچہ ان چار محافظین میں سے دو تو اس ارادہ ہی
سے مرعوب ہو کر پھر گئے اور ایک در خیمہ تک جا کر واپس آیا لیکن چوتھا اندر داخل
ہوا اور قبل اسکے کہ نادر سنبھلے اور تلوار پکڑے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

یہ وہی نادر تھا جسکے چشم و ابرو کی خفیف سی جنبش سے دلی کی گلیاں بیگناہوں کے
خون سے گلنار ہو گئی تھیں لیکن آج اس کا مغرور و متمرد سر فٹ بال کی طرح تمام فوج
میں پاؤں سے ٹھکرایا جا رہا تھا وہ فوج و لشکر جو نادر کے حکم پر جان قربان کرتا تھا آج
اسکے سر کا تماشہ بنائے ہوئے تھا۔

بیک گردش چشم نیلوفری نہ نادر بجا ماند نے نادری

دنیائے اسلام میں مظلوم کربلا حضرت سیدنا امام حسینؓ کے بعد عبید اللہ
بن زبیر کی موت بھی بصائر و عبرت کا گنجینہ ہے۔

عبد اللہ ابن زبیر قرن اولیٰ کے ان چند مخصوص اصحاب میں سے ہیں جنکو خداوند
قدوس نے عقل و دانش فہم و فراست تدبیر و تفکر میں ممتاز درجہ عطا فرمایا تھا۔ دنیا
سیاسی تدبیر میں آپکا درجہ بہت بلند تھا اسلئے حکومت وقت ان کی طرف سے ہمیشہ خائف رہتی
چنانچہ جس وقت یزید کو امیر معاویہ کی جانشینی کی بیعت [illegible] ایک عبد اللہ
ابن زبیر ہی تھے انکی نسبت امیر معاویہ نے کہا تھا کہ اسپر نگاہ رکھنا [illegible]
روبہ صفت [illegible] سلطنت کو متزلزل کر دے گا۔

عبداللہ ابن زبیر نے اس حال پر لوگوں کو قائم رکھنے کی غرض اور جوش پیدا کرنیکے واسطے اپنا گھوڑا ذبح کرڈالا اور اسکا گوشت تقسیم کرادیا اگرچہ عبداللہ ابن زبیر کے پاس غلہ اور کھجور کا ذخیرہ بہت جمع تھا مگر وہ عاقبت اندیشی کی وجہ سے نہایت کفایت شعاری سے حسب ضرورت تقسیم کرتے تھے۔

جب محاصرہ کو زیادہ طول ہوا تو حجاج نے ایک امان نامہ لکھکر بھیجدیا اس سے عبداللہ ابن زبیر کے ہمراہیوں میں سے دس ہزار آدمی حجاج سے جا ملے اور اس ستم روزگار کو دیکھئے کہ خود حضرت عبداللہ ابن زبیر کے دو بیٹے اُنسے جدا ہوکر دشمن سے مل گئے جنکے نام حمزہ اور حبیب تھے البتہ تیسرا لڑکا باپ کی رفاقت آخر دم تک کرتا رہا اور عین معرکۂ قتال میں کام آگیا۔

اسکے بعد حجاج نے فوج کو ایک تقریر کے ذریعہ جوش دلایا اور کہا کہ اے بہادرو! حجون اور اسکے میدانوں میں پھیل جاؤ کیونکہ ابن زبیر اب چند ساعت کے اور مہمان ہیں۔ ابن زبیر کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی ماں کے پاس گئے اور کہا اے ماں! مجھے لوگوں نے دھوکہ دیا اور ذلیل کیا یہانتک کہ میرے لڑکوں نے بھی مجکو رسوا کیا۔

اگر میں چاہوں تو مخالفین مجکو دنیا دے سکتے ہیں اب آپ کی کیا رائے ہے؟ اسماء ام زبیر نے جواب دیا تم اپنے معاملہ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو لیکن اگر تم حق پر ہو اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہو تو جو کر رہے ہو کرتے رہو اور اپنی گردن ایسی رسی میں نہ پھنساؤ کہ بنی امیہ کے چھوکرے اس سے کھیلیں۔ اگر تم نے دنیا حاصل کرنے کا قصد کیا تھا تو تم نالائق بندے ہو اپنے کو بھی ہلاک کیا دوسروں کو بھی اگر تم یہ کہتے ہو کہ میں حق پر تھا مگر ہمراہیوں نے دھوکا دیا تو یہ فعل نیکوں کا نہیں۔ ابن زبیر نے کہا اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ لوگ میرے قتل کے بعد مثلہ کرینگے تو [illegible]

حجاج اسکے آنے سے قبل احرام باندھ کر حدود مکہ میں داخل ہو گیا۔ اور بیر میمونہ پر قیام کیا مگر حج کیا نہ طواف اور نہ سعی کی اور نہ قربانی اور عبداللہ ابن زبیر کو عرفات میں داخل ہونے سے روک دیا مجبوراً انہوں نے مکہ ہی میں قربانی کی۔ حالانکہ ابن زبیر نے حجاج کو طواف وسعی بین الصفا والمروہ سے منع نہیں کیا تھا۔

اسکے بعد حجاج نے کوہ ابوقبیس پر منجنیقیں نصب کرائیں تاکہ مکہ پر سنگباری کرے اس سال عبداللہ ابن عمر حج کے لئے تشریف لائے تھے انہوں نے حجاج سے کہلا بھیجا کہ دور دور سے اللہ کے بندے اسکے گھر کی زیارت اور اس کا فریضہ ادا کرنے آئے ہیں انکو اطمینان سے حج وعمرہ کرنے دو اور اسکے بندوں کو اسکی عبادت سے مت روکو چنانچہ حجاج نے تا انقضائے حج سنگباری موقوف کر دی اور منادی کرادی کہ لوگ اپنے اپنے شہروں اور گھروں کو واپس چلے جائیں ہم ابن زبیر پر سنگباری کریں گے۔

اسکے بعد حجاج نے خانہ کعبہ پر سنگباری شروع کرادی پہلا پتھر جسوقت خانہ کعبہ پر گرا ہے تو آسمان سے ایک سخت خوفناک اور مہیب کڑک سنائی دی جس سے چند اہل شام مر گئے۔ اس واقعہ سے حجاج کے لشکر میں [illegible] طاری ہوا تو حجاج نے کہا گھبراؤ نہیں میں تہامہ [illegible] ہوں [illegible] یہ کڑک اور بجلی [illegible] فتح کی خوشخبری ہے اتفاق سے دوسرے روز بجلی گری اور ابن زبیر [illegible] ہلاک ہو گئے۔

اسکے بعد حجاج نے جوش انتقام میں آ کر خانہ کعبہ پر پتھر برسانے شروع کئے عبداللہ ابن زبیر کے آگے بڑے بڑے پتھر آ کر گرتے تھے مگر وہ [illegible] استقامت [illegible] استقلال کی حالت میں کھڑے نماز پڑھا کرتے تھے۔

عرصہ تک اسی طرح جنگ ہوتی رہی۔ بالآخر محاصرہ کی طوالت سے غلہ کی کمی ہو گئی رسد کا آنا بند ہو گیا تھا اسلئے قحط کی سختی ناقابل برداشت ہو گئی

جا رہا ہے۔ انکے یہ الفاظ تیر کی طرح جگر میں پیوست ہو گئے بے اختیار ہو گئیں آنکھوں سے
آنسو جاری ہو گئے اور لپٹ گئیں یہ آخری پیار تھا اور جوبتی کا آخری معانقہ انکے بعد
ابن زبیر اپنی ماں سے رخصت ہوتے معانقہ کے وقت اسمار کا ہاتھ زرہ پر پڑ گیا
دریافت کیا یہ کیا ہے اور کس لئے ہے۔ عبد اللہ ابن زبیر نے کہا محض اطمینان
و مضبوطی کی غرض سے پہن لیا ہے۔ اسمار نے وہ زرہ اتاری اور معمولی کپڑے
زیب تن کرنے کے لئے فرمایا۔ انکے بعد ابن زبیر نے آستینیں کہنیوں تک چڑھائیں
قمیص کے دامن کمر سے باندھ لئے اور بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور
اور میدان کارزار میں پہنچ کر شامیوں پر سخت حملہ کیا اور بہت سے آدمیوں کو
قتل کر ڈالا پھر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ تکبیر کہتے ہوئے ہجوم اعدا میں گھس گئے۔
بعض آدمیوں نے بھاگنے کی رائے دی مگر آپ نے فرمایا کیا برا ہے۔ وہ شخص جو
ایسی حالت میں بھاگ جائے میں اللہ کے فضل سے دین اسلام میں ہوں
زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ قتل کر دیا جاؤں گا سو اس خوف سے بھاگنا حماقت
ہے اسوقت مسجد حرام کے تمام دروازے شامیوں سے بھر گئے تھے مکہ معظمہ کی
ناکہ بندی کر لی گئی تھی۔ حجاج و طارق نے ابطح کی طرف مروہ تک محاصرہ کر لیا تھا
اسی عالم میں ابن زبیر ادھر ادھر حملہ کر رہے تھے۔

جب حجاج نے دیکھا کہ لوگ ابن زبیر پر حملہ کرنے سے جی چراتے ہیں تو سخت
غصہ ہوا اور طیش میں آکر پیادہ پا لشکر لئے ہوئے ابن زبیر کے علم بردار پر حملہ
آور ہوا لیکن ابن زبیر اس نرغہ میں گھس کر اپنے علم بردار کو نکال لائے اور سخت
حملہ کرکے حجاج کو پسپا کرکے لوٹ گئے اور مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کی
اس درمیان میں پھر علم بردار پر حملہ کیا گیا اور وہ مارا گیا مگر ابن زبیر نماز سے فارغ
ہو کر بغیر نشان و علم کے لڑتے رہے یہاں تک کہ ایک ظالم و جفا کار کا تیر پیشانی مبارک

اسپر اسماء نے فرمایا اے میرے بیٹے! بکری جس وقت ذبح کر دی گئی تو اسکو کھال کھینچنے کی پروا نہ ہوگی۔ تم جو کچھ کر رہے ہو بصیرت کے ساتھ کئے جاؤ۔ اسکے بعد ابن زبیر نے ماں کے سر کا بوسہ دیکر کہا میری بھی رائے ہے اسوقت تک نہ مجھے دنیا کی خواہش ہوئی نہ حکومت کی آرزو ہیں اس کام کے لئے صرف اسوجہ مجبور ہوگیا کہ خدائے تعالی کے اوامر کی بجا آوری نہیں کیجاتی اور اسکے مناہی سے لوگ احتساب واحتراز نہیں کرتے ہیں نے مناسب خیال کیا کہ آپ سے بھی مشورہ لیلوں پس واقعہ یہ ہے کہ آپ نے میری بصیرت زیادہ کر دی۔

اور بولے میری ماں! میں آج ضرور مارا جاؤں گا تم زیادہ مغموم و رنجیدہ نہ ہونا اور تم مجھے اللہ کے سپرد کر دو۔ تمہارے لڑکے نے کسی فعل منکر کے ارتکاب کا قصد تک نہیں کیا اور نہ کسی امر مذموم و بدکاری کی طرف توجہ کی نہ اسنے بدعہدی کی ہے نہ کسی پر ظلم کیا ہے نہ کسی ظالم کا معین و مددگار رہا ہے اور نہ اسنے حتی الامکان اللہ کی خلاف مرضی کوئی کام کیا ہے۔

اے اللہ میں اس امر کو اپنے نفس کی برات کی غرض سے نہیں ظاہر کرتا بلکہ اسلیے کہ اپنی ماں کی تسکین خاطر کروں۔

اسماء بولیں مجھے امید ہے کہ اللہ تم کو اسکا اجر جمیل عطا فرمائیگا۔ تم اللہ کا نام لیکر حملہ کرو اگر تم فتحیاب ہوے تو میں مسرور ہونگی۔ اگرچہ لڑائی پر جانیکی اجازت دیدی مگر ماں تھیں پالا پرورش کیا تھا یہ کسی جی سے ہوتا کہ موت کے منہ میں اپنے بچہ کو دیکر آپ گھر بیٹھ رہتیں کچھ سوچیں اور سوچ کر فرمایا اچھا میں بھی تمہارا انجام کار دیکھنے چلتی ہوں مگر ابن زبیر نے کہا آپ تکلیف نہ فرمائیے آپ کو اللہ جزائے خیر دے البتہ دعائے خیر سے مجکو فراموش نہ کیجئے گا۔ ابن زبیر کے ان الفاظ سے محبت مادری میں جوش آگیا تمام جذبات برانگیختہ ہوگئے دیکھ رہی تھیں کہ بیٹا مرنے کے لئے

آخری و مختصر تمنا پوری کر دے

ممکن ہے تم اس غریب و بیکس عورت کو بدنصیب کہو کیونکہ اس عورت سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگی جسکے ایک چھوڑ دو دو بیٹے قتل کر دئے جائیں اور وہ انکی لاش تک کے لئے ترسے۔ لیکن نہیں تم یہ لقب دینے میں عجلت نہ کرو۔ ایسی خوش قسمت مائیں دنیا میں کم ہونگی جیسی ابن زبیر کی بوڑھی ماں اسماتھی اسکا دل نور ایمان سے منور تھا وہ حق و صداقت کی پرستار تھی وہ اس امر پر راضی ہوگی کہ اسکا فرزند ظلم و عدوان کا مقابلہ کرے اور تمرد و سرکشی کو دنیا سے برباد کر دے اور اگر راہ الٰہی میں شہید ہو جائے تو اس پر صبر کرے۔ اسکا فرزند رشید مرضات الٰہی کے پورا کرنے کے لئے کھڑا ہوا ضلالت و گمراہی دور کرنے کیلئے اس نے اپنے تئیں مہالک و خطرات میں ڈالا اور بالآخر خدائے اسلام کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی۔ پھر ایسی مائیں کہاں اور ایسے فرزند کس کو نصیب ہوتے ہیں موت نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا مگر ایسا خاتمہ کہ قیامت تک کے لئے حیات جاوید کا خلعت عطا ہو گیا اور نہ صرف صفحۂ تاریخ پر بلکہ مسلمانوں کے قلوب پر اس کا دوام ثبت ہو گیا۔

عبداللہ ابن زبیر شہید ہو گئے ان کی لاش صلیب پر لٹکائی گئی اور حجاج نے وہ سب کچھ ظلم کر ڈالے جس کے ذکر سے انسانیت شرماتی ہے مگر نہ حجاج رہا نہ اس کے مظالم نہ اس کی ستمگاریاں رہیں نہ اسکا آقا عبدالملک باقی ہے سب فنا ہو گئے سب برباد ہو گئے موت نے مقتول کی طرح قاتل کا بھی خاتمہ کر دیا اور مظلوم کی طرح ظالم بھی موت کے بے اماں حربہ سے نہ بچ سکا۔

عبدالملک اپنے عہد میں دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ، شام و روم و مصر و افریقہ عراق و ایران حجاز و عرب کا مالک تھا سیکڑوں کو پھانسی دیدی لاکھوں

پر آکر لگا جس سے تمام روئے مبارک لہو لہان ہو گیا مگر آپ اس حالت میں بھی لڑتے رہے اسکے بعد دشمن دور سے تیر برسانے لگے اور ایسی سخت سنگباری کی کہ بالآخر آپ گھوڑے سے نیچے گرے اور شہید ہو گئے یہ واقعہ روز سہ شنبہ جمادی الثانی ۷۳ھ کو واقع ہوا۔

پھر حجاج کے سامنے انکا سر پیش کیا گیا اور اسنے عبدالملک کے پاس ایک نامہ بشارت کے ساتھ بھیجدیا۔ پھر لاش منگوائی گئی اور مقام حجون میں مثلہ کر کے صلیب پر چڑھا دی گئی۔

ابن زبیر کی ماں اسماء مقام حجون پر تشریف لے گئیں اور بیٹے کی لاش کو صلیب پر دیکھ کر ایک آہ سرد کھینچی اور ایسا دردناک مرثیہ پڑھا کہ پتھر کے دل جگر پانی ہو گئے۔ اسماء نے حجاج سے بیٹے کی لاش مانگی کہ تجہیز و تکفین کر دیں مگر شقی القلب حجاج نے دفن کرنے کی اجازت نہیں دی۔

تم ابن زبیر کی دکھیا ماں کی حالت کا اندازہ کرو کہ اس بوڑھی بیوہ عورت پر کیا گذر رہی ہوگی جسکا ایک بیٹا مصعب بن زبیر پہلے قتل ہو چکا ہے اور یہ دوسرا فرزند اسکی آنکھوں کے سامنے شہید ہوا اور اسکی بے سر کی لاش صلیب پر آویزاں ہے وہ اس دردناک نظارہ کو دیکھ رہی ہے مگر اتنی قدرت بھی نہیں کہ جسکو نو مہینے تک پیٹ میں رکھا برسوں سینہ پر لٹایا گود میں کھلایا پھر بڑا ہوا شادی کی مگر اسوقت اسکی لاش تک نہیں چھو سکتی نہ کفن کا آخری جوڑا پہنا سکتی ہے۔ نہ دو گز زمین کے اندر اسکو دفن کر سکتی ہے بیکس و مظلوم عورت کا اسوقت کوئی نہیں کہ اسکے دکھ کو دور کرے۔ یہ عورت کون ہے ؟ رسول اللہ کی بھاوج ہے حضرت زبیر کی پھوپی ہے جو رسول اللہ کے پھوپی زاد بھائی تھے مگر یہ امتیازات آج اسکی کچھ مدد نہیں کر سکتے وہ جگر افگار بیٹے کی لاش کے لئے تڑپ رہی ہے مگر کوئی نہیں جو اسکی یہ

کے سر تن سے جدا کر دئے سیکڑوں عورتیں بیوہ ہو گئیں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے مگر جب وقت آگیا تو ساری طاقت طاق تھی نہ زور نہ قوت کچھ کام آیا نہ فوج و لشکر نے ساتھ دیا نہ شوکت و عظمت نے بچایا۔ موت کا فرشتہ آیا اور ایک بیکس انسان کی طرح اسکی روح کو بھی قبض کر لیا۔

غرضکہ ابن زبیر کا فرق مبارک عبد الملک کے پاس پہنچا اور لاش کا حال معلوم ہوا کہ حجاج نے دفن کی اجازت نہیں دی تو وہ بہت خفا ہوا اور حجاج کو سخت ملامت کی اور لاش کے دفن کرنے کی اجازت دی۔

عبد اللہ ابن زبیر موت کے فلسفہ سے واقف تھے وہ اس سے بیزار اور اس کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے انکو معلوم تھا کہ موت آئے گی اور یقینی آئے گی اسلئے حیات مستعار کو اس طرح اسکے سپرد کرنا چاہئے کہ دوسروں کے لئے دلیل راہ اور خود میرے لئے باعث فلاح ہو چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی حق و صداقت کے قربان گاہ پر چڑھا دی۔ پھر دیکھو کہ موت انکی دوست تھی یا دشمن۔

ذیل کی تین نظمیں خاص رسالہ کم نو موت نمبر کے لئے میری خواہش سے آگرہ کے شہرۂ آفاق نیچرل شاعر جناب مولانا سیماب نے لکھی ہیں۔ بیڈر کی موت میں انہوں نے حالات و واقعات کا بے ساختہ آئینہ دکھا دیا ہے اور بکری کی موت کا بیان انکے دل درد آشنا کی تصویر ہے جسکا ہر شعر ابن آدم کا دامن گیر ہے تاکہ وہ سمجھے کہ بقائے حیات کے لئے جو غذائیں اسکے پیٹ میں جاتی ہیں وہ مصائب کے کیا باتوں سے گذر کر آتی ہیں۔

شہزادہ دارا شکوہ برادر اکبر سلطان عالمگیر بادشاہ غازی کا تذکرہ شہادت نہایت الم ناک ہے۔ اسلئے اس سے دولت و حکومت کے نشہ رکھنے والوں کو بہت

ہوا یہ دوسرا پھر حکم اُس کے بھائی کا — کہ بیری اسکا جھکے خنجر جفا کے لئے
وہاں تو صرف بہانہ تھا اک اشارے کا — ستم ہی ٹوٹ پڑا جان مبتلا کے لئے
قدم پہ بھائی کے دارا نے رکھ دیا سر کو — کہا کہ بھائی مجھے چھوڑ دیجیے خدا کے لئے

ہوئی مگر شنوائی نہ التجائی کی
سنی نہ بھائی نے آخر پکار بھائی کی

پھر ایک در پہ لٹکوا دیا سر دارا — کہ ہو تماشہ عبرت من و شما کے لئے
یہ حال اُن کا ہی جو صاحب حکومت تھے — نصیب جنکا تھا پابوس خاک پا کے لئے
جب انکے ساتھ یہ قسمت نے نارسائی کی — تو پھر کہاں ہو مفر ادر اغنیا کے لئے
نہ کام آئی حکومت، نہ منصب شاہی — نہ مال و زر نے دیا ساتھ آگنیا کے لئے
اگر ہے چشم بصیرت تو ہے عیاں یہ بات — ثبات کچھ نہیں دنیائے بیوفا کے لئے
ہر ایک نفس کو چکھنی ہے موت کی لذت — ہزار ہاتھ اٹھایا کرے دعا کے لئے
فنا ہے سارا زمانہ فنا ہے آخر کار — بقا جو ہے تو فقط ذات کبریا کے لئے

رہیں گے پھول نہ پھولوں میں رنگ و بو باقی
رہے گا اے مرے معبود ایک تو باقی

آہ تیرا نام لیتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ طبیعت ہر ایک کام سے بیزار ہو جاتی ہے اور ایک دفعہ ہو کا عالم ہو جاتا ہے۔ اے موت تو کیا ہے؟ تیرا کیا کام ہے؟ کہاں کہاں تو منزل پر پہنچانے کے لئے رہتا ہے تیرا کام ایک دنیا سے دوسری دنیا میں لے جاتا ہے۔ اے موت تو ہر جگہ ہے تیری حکومت

مسافروں کو یہ فطرت کا عام ہے اعلان ۔۔۔ قیام کچھ نہیں اس کارواں سرا کے لئے
ملی کسی کو یہاں عمر جاوداں نہ کبھی ۔۔۔ کسی نے لطف ہمیشہ یہاں نہ آ کے لئے
بنائے سد سکندر رہی بہت مضبوط ۔۔۔ مگر نہ روک نکالی گئی قضا کے لئے
بقا کسی کو میسر نہیں زمانے میں ۔۔۔ نہ بادشہ کے لئے ہے نہ ہے گدا کے لئے
جناب خضر کی حالت جو ہو گئی معلوم ۔۔۔ تو آبرو نہ رہی چشمۂ بقا کے لئے
چمن رہیگا نہ باقی چمن کی شادابی ۔۔۔ یہ سب بہار ہے دو روز کی ہوا کے لئے

جہاں ہو چین سے رہنا یہ وہ مقام نہیں
کہ دو گھڑی سے زیادہ یہاں قیام نہیں

وہ شاہزادۂ عالی تبار و والا جاہ ۔۔۔ جو روشنی تھا ہر اک دیدہ ولا کے لئے
تھا قصر شاہ میں دارا شکوہ جس کا نام ۔۔۔ جو فخر و ناز تھا احباب و اقربا کے لئے
کنیزیں سیکڑوں تھیں جس کی ہم جلیس و انیس ۔۔۔ حسین سیکڑوں تھے ایک مہ لقا کے لئے
تھی اسکی ٹھوکر دنے گر لگی ہوئی دولت ۔۔۔ تو اسکے ہاتھ گہر بار تھے عطا کے لئے
تھا اسکے پاس زر و مال اور لال و گہر ۔۔۔ کچھ انتہا ہی نہ تھی جن کی ابتدا کے لئے
پھر انصیب تھے گردش میں آ گئی قسمت ۔۔۔ وہ سعی کرتا تھا اورنگ بے بہا کے لئے
خدا نے بھائی کو اسکے جو کامیاب کیا ۔۔۔ تباہی آ گئی اس درد آشنا کے لئے

عجیب قسمت دارا میں انقلاب آیا
کہ سب کے خط کا خط تقدیر کا جواب آیا

بلایا بھائی نے جب تخت اسکے ہاتھ آیا ۔۔۔ ملا نہ وقت بھی کچھ عرض مدعا کے لئے
دیا یہ حکم کہ آنکھیں نکال لو اس کی ۔۔۔ سزا یہی ہے فقط ایسے ناسزا کے لئے
سلائیں گرم کیں اور وہ بھی آتش افگندہ ۔۔۔ پھرا سپید کہ کیسی چشم سرمہ سا کے لئے
نکالیں ظلم سے قاتل نے نرگسیں آنکھیں ۔۔۔ رہیں نظر میں نہ گنجائشیں حیا کے لئے

لیکن تو نہ ہو تو پھر زندگی کا لطف نہ ہو اور دنیا میں تمام چیزیں سست ہو جائیں۔
اے موت تجھے تو اس باغ دنیا سے ایسا پھول توڑنا چاہیے کہ جس کی پتیاں اپنی
سال پیمائی کی وجہ سے پژمردہ ہو چکی ہوں نہ کہ وہ کلی جو ابھی کھلنے بھی نہ پائی ہے اور
ہزار روشن آنکھیں جسکے جلوہ کی امید میں معروف نظارہ ہوں۔

گورستان۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں موت یاد آجاتی ہے۔ ہر چہار جانب جو
زمین اٹھی ہوئی ہے اس میں تمام دہقان مٹی کے غلاف سے اپنے آپکو پوشیدہ
کر کے ایسے سوئے ہوئے ہیں کہ باد صبا اور صبح کی اذان بھی انکو بیدار نہیں کر سکتی
ہائے اس میدان میں کیسے کیسے نوجوان اور پری جمال تن تنہا اپنے اپنے حجرہ
میں پناہ گزیں ہیں اور ان لوگوں کا دیکھنے والا سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے
اے زمین تو بڑی رحیم ہے اور شاہ و گدا کے ساتھ ایک ہی سلوک سے پیش
آتی ہے۔

از نظام المشائخ — محمد حنیف سلیم پوری

موت اکبر کی نشانی

یہ خوابگاہ اس بادشاہ جلال الدین اکبر کی ہے جو رجب ۹۴۹ھ میں
شب یکشنبہ کو بطن حمیدہ بانو بیگم زوجہ نصیر الدین ہمایوں سے پیدا ہوا تھا اور
جسنے ۱۳ سال ۸ ماہ ۲۲ دن کی عمر میں تاج و تخت پایا تھا۔ ۱۱ شعبان جمعہ کو آگرہ سے
پیادہ پا اجمیر شریف ہو کر دہلی واپس آیا تھا۔ اور دہلی سے شکار کھیلتا ہوا ۱۳
جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ روز چہار شنبہ کو آگرہ میں آکر رہرو ملک بقا ہوا۔ یہ نادر روضہ
جلال الدین اکبر نے اپنی حیات میں بنوا کر بہشت آباد نام رکھا تھا۔ دروازہ روضہ کا
اسقدر بلند کہ عنقا سے نظر اپنی بے پروبالی و نارسائی سے محجوب۔ یہاں ملا بھی ہے

ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے تو خشکی اور تری اور جنگل اور صحرا سب جگہ موجود ہے کوئی بادشاہ سے بغاوت کر سکتا ہے پر تیری حکومت ایسی ہے کہ بغاوت کیا بلکہ کوئی شخص ہی نظر انداز نہیں دیکھ سکتا بادشاہ تو اپنی ہی قوم کو ایک نظر سے دیکھتا ہے پر تجھے کہ سب پر نظر یکساں ہے۔ نہ تو کوئی امیر اپنی دولت کی وجہ سے رہائی حاصل کر سکتا اور نہ غریب اپنی غربت سے بچ سکتا ہے۔ تو عجب بہروپیہ ہے ہزاروں شکلوں میں اپنے شکار کے روبرو جلوہ نما ہوتی ہے کبھی تو سانپ کبھی ہیضہ اور کبھی کیا کبھی کیا بن کر آدمی کی روح کو اس کے قفس عنصری سے کھینچ لیتی ہے۔ چاند ستارے آفتاب وغیرہ اپنے معین وقت پر نکلتے ہیں سب کا ایک وقت ہے لیکن تیرا اے موت کوئی وقت نہیں تو وقت کی پابندی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتی۔ ڈاکٹر اور حکیم تیرے کام میں خلل ڈالتے ہیں لیکن واہ رے موت! اون کو بھی نہیں چھوڑتی دنیا میں شاید ہی کوئی مخلوق ایسی ہو کہ تیری چاہنے والی نظر آئے۔ ایک شخص اپنی گاڑی چلا رہا تھا راستہ میں بہت کیچڑ ہونے کی وجہ سے اس کا پہیا اس میں دھنس گیا وہ نامرد بغیر کوشش کئے خداوند کریم سے اپنی موت کا خواستگار ہوا کوئی نوجوان شخص وہاں سن رہا تھا اسکے سامنے حاضر ہو کر کہا کہ تو کیا چاہتا ہے اُس نے کہا کہ میری گاڑی کو باہر نکال دے وہ شخص بہت ہنسا اور کہا کہ ابھی تو موت چاہتا تھا اور ابھی مدد۔

اُف۔ موت! تو نے کیسے کیسے پری جمالوں کو گور کی تاریک و تنگ کوٹھری میں سلا دیا کہ پھر کروٹ لینے کا نام ہی نہیں۔ ہائے جن کے محلوں میں ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی آج انکو تن تنہا رکھ چھوڑا ہے۔ آہ اس بچہ کو جسنے ماں کی گود سے کبھی بھی نیچے پیر تک نہ رکھا تو نے گود سے زبردستی چھین کر خاک کے ڈھیر میں چھپا دیا اف ایسے ایسے امیر زادے جنکو اندنیند نہیں آتی تھی وہ بھی خاک پر ایسے بیخبر سوئے ہیں کہ جاگنا مد ہے سب کوئی گریز کرتے ہیں

کیا اعتبار دہر کا عبرت کی جا ہے یہ
عشرت سرا کبھی کبھی ماتم سرا ہے یہ

یاد اجل

از نظام المشائخ
دہلی

[illegible]

میں اے اجل ہوں تیرا امیدوار کب سے — تیری مفارقت میں ہوں بیقرار کب سے
ہے میری جان اے جاں تجھ پہ نثار کب سے — کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے
مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں — اے مرگ تیری خاطر سینہ فگار ہوں میں
اے پُر ناز نخوت [illegible] آن بان والی — اے غم فروش عالم اونچی دکان والی
اے صاحب عزت برتر نشان والی — شرم و حیا کی دیوی شاہانہ شان والی
جاں تیرے خیر مقدم کو رک رہی ہے لب پر — دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے او ستمگر
اے موت بند ہستی سے تو چھڑا دے مجھکو — آزاد کر کے اپنا بندہ بنا دے مجھکو
صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو — آ حجرہ لحد میں چل کر سلا دے مجھکو
اے قہر موت ہی سے ہے وصل کا اک ارماں — آغوش دل میں لیلے شفقت پہ تیری قربان
میں ہوں فقط اکیلا کچھ مال ہو نہ زر ہو — دو گز کا اک کفن ہو کچھ اپنے پاس گر ہو
کھٹکا نہ رہزنوں کا چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو — شادی کی کچھ خبر ہو غم کا نہ کچھ اثر ہو
وہ دن کب آئینگے جب احباب رو رہے ہونگے — ہم اپنا منہ لپیٹے بے فکر سوتے ہوں گے
غربت کی ہو نہ پروا دولت کی ہو نہ حاجت — عزت کی ہو نہ خواہش ذلت کی ہو نہ نفرت
اعدا سے ہو نہ کینہ یاروں سے ہو نہ الفت — اولاد کی محبت ماں باپ کی نہ چاہت
محفوظ ہوں غرض ہم ان ساری آفتوں سے — بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے
ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری [illegible] — [illegible]

سنگ مرمر کی جالیاں اور پھول بوٹے اپنی نزاکت کے لحاظ سے ایسے ہیں گویا مصور نے صفحۂ قرطاس پر گلہائے سر سبز کی جھاڑیاں بنائی ہیں۔ اوپر کا تعویذ سنگ مرمر کا بعض زیارت گاہ عام ہے اور زر و نہ نام اس پر کندہ ہے۔ نیچے کے تہ خانے میں وہ اصلی تعویذ ہے جسمیں وہ جلیل القدر بادشاہ تنہا سو رہا ہے جو کل قلعۂ سرخ اور اقلیم ہند کا مالک تھا۔ ہائے نہ سرہانے اسکے آج کوئی شمع ہے نہ وہ فیضی و ابو الفضل سے عالی مرتبہ ندیم و ہمنوا۔ (مخمس عرش بر شعر داغ)

ایک چادر کفن کی جسکو اوڑھے ہوں پڑا ۔۔۔ اب نہ وہ ہمدرد و ہمدم ہیں نہ کوئی دوسرا
کس سے پوچھوں وہ طلسم رنگ دنیا کیا ہوا ۔۔۔ زندگی میں پاس سے دم بھر نہ ہوتے تھے جدا

قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھ دیا

اے اجل۔ یہ قہر یہ غضب۔ کہ تو نے ایک مچھے کیا کہ سارے زمانے سے جلال الدین اکبر سے رنگین طبع علم دوست بادشاہ کو چھین لیا۔ اور چھین کر اک ایسے تاریک قید خانے میں بند کر دیا جہاں کسی طرح ہم نہیں جا سکتے۔ آہ یا تو وہ وقت تھا جب اکبر قلعہ سرخ کے عالیشان دروازہ سے شان شاہانہ کیساتھ نکلتا تھا یا آج وہ وقت آیا ہے کہ اسی دروازہ سے اس کا حسرت بھرا جنازہ نکل رہا ہے۔ ہے ہے عشق کا دم بھرنے والی رانیوں کا واویلا آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے ہے اور زبان عبرت پر مومن کا یہ نوحہ ہے کہ۔

مدفن بنے زمین چمن وا مصیبتا ۔۔۔ معدوم ہو وہ غنچہ دہن وا مصیبتا
اے منکر و نکیر کو ناچار دہ جواب ۔۔۔ جو جور سے کرے نہ سخن وا مصیبتا۔
جسکو شکستن دل عاشق عذاب ہے ۔۔۔ وہ اور جانکنی کے محن وا مصیبتا
تشبیہ نہ ینہ سے جو ہوتا تھا آب آب ۔۔۔ ملجائے خاک میں وہ بدن وا مصیبتا
دیتے ہیں چھے جو روش ہی جی آرام مل جائے ۔۔۔ اس کا غم ہلاک شدن وا مصیبتا

سرکشوں کو ضعف جسکے عہد دولت میں رہا — رنگ لیاں کر رہے ہیں وہ خودی کے ساتھ میں

موت کر دیتی ہے کیسی ایک دم کایا پلٹ — نیستی سے سارے استحکام ہو جاتے ہیں پٹ

حکیم رابع

پردہ خفا یعنی تھا خیال مرگ کو جسنے نہاں — دل کے پردہ میں رکھا اور آرزوئیں آشکار

پھر قضا کو کیوں نہ ٹالا اور کچھ دن کیلئے — تاکہ بر آتی تمنائے دل بے اختیار

ورنہ امیدوں کو رکھنا چاہئے تھا مختصر — دست برد موت سے تاکہ نہ ہوتیں سوگوار

عمر کوتاہ ہے بشر امید ناحق سے کے لیئے — چشم وا رکھتا ہے شوق دید ناحق کیلئے

حکیم خامس

کشتۂ فکر و تردد تیری سعی ناسپاس — کا نتیجہ یہ تیرے کھل گیا یعنی کہ یاس

احتیاج نا سزا نے عمر بھر رکھا ذلیل — جنس فانی کا تردد عاقبت تھا تیرے پاس

بار غم نے جسکے تجھ سے بیوفائی کی صریح — اور مآل ہی کا لاحاصل رہا ہونا کا ہراس

غیر کا حصہ ہوا سرمایۂ ہستی ترا — اور جواب عصیاں کا اپنے آپ تو دینے چلا

حکیم سادس

ایک تجھ پر تھا تو ناصح مشفق بھی تھا — یاد ہیں اکثر تری ہمکو نصائح دلپذیر

تیرا مرجانا اگرچہ ہے آج اک پند بلیغ — زندگی نے ایسی عبرت خیز کب دی تھی خبر

تو سراپا پند خاموشی ہے سب کے سامنے — چشم عبرت آج عبرت کا تماشا دیکھ لے

حکیم سابع

کل تری تقریر سے مجلس میں اکثر تھی حزیں — چاہتے تھے جلد تو خاموش ہو جائے کہیں

آج ہی انکو تمنا بول اٹھنے کی ترے — اور تو چپکا ہی یوں گویا زبان منہ میں نہیں

لگ گئی مہر خموشی کیوں لب اعجاز پر — کیوں نہیں چلتی ہے مضراب زبان بر ساز پر

حکیم ثامن

تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت ہے بیوفائی تیری معمولی ایک عادت
تجھ سے اماں جو ملنگے انکے گلے لگے تو جو دل سے تجھکو چاہے اس سے الگ ہے تو

از نظام المشائخ

سکندر کا جنازہ

مشغل بزم حکومت فاتح روئے زمین — والی بابل سکندر نامور شاہ جہاں
چھوڑ کر ساز طرب جب راہی عقبیٰ ہوا — آرزوئیں رہ گئیں سب ہاتھ ملتی ہائے ہاں
نعش یوں تابوت زریں میں رکھی جاتی ہے — جس طرح دُرج صدف میں ہو دُر یکتا نہاں
بزم ماتم کا عجب عبرت فزا یہ سین تھا — گرد تابوت سکندر سب کے سب تھے نوحہ خواں
پھر کے آگے سر جو بولا اک حکیم نکتہ سنج — مرنے والو مرنیوالے کیلئے کیوں ہو فغاں
ہے مقدم اور موخر کا یہاں بعد و فراق — ورنہ جانیکو اسی منزل سے ہے ہر کارواں
رہ رو ملک عدم کا ہے مگر نقش قدم — ساکن معمورۂ ہستی کو عبرت کا نشاں
وائے حسرت موت نے محبوس اس کو کر لیا — کل جو اپنے دشمنوں کو قید کرتا تھا یہاں
یہ اسی سلطان کا ہے جسم بے جان ناظرین — جسکے قدموں سے لگی تھی فتح و نصرت عز و شاں
ملتفت ہو تم میں کچھ بھی حس عبرت ہو اگر — نذر غم نقد تخیل اب کرو مرحوم پر

حکیم ثانی۔ تابوت پر ہاتھ رکھ کر۔

…م و زر صندوق میں جو بند رکھتا تھا کبھی — آج خود وہ شاہ منعم ساکن تابوت ہے
…ندگی سے فتح کر کے عالم اسباب کو — کاہلی بھی آدمی کے واسطے اک موت ہے
…ن سکندر کی طرح اور مر سکندر کی طرح — …کر رہ جاتے ترا گھر گھر سکندر کی طرح

حکیم ثالث

…ائے عبرت ہے جو کل غالب تھا سب پر آج وہ — ہو گیا مغلوب کیسا بیکسی کے ہاتھ میں

بیچ میں تابوت تھا اور گرد تھے سب حلقہ بنا
ایک ان میں سے ہوا اس طرح سرگرم سخن

تو نے مغلوب اک زمانہ کو کیا اے بادشاہ
موت کو مغلوب کر سکنے کی نکلی کوئی راہ

دوسرے نے پھر کیا تابوت شاہی سے خطاب
اے خدیو سلطنت گنبد گردوں رکاب

تیرا غصہ تیرا غیظ ایک موت تھا بے اشتباہ
موت پر آیا نہ غصہ تجھکو کیوں اے بادشاہ

تیسرے نے عرض کی اے بادشاہ نامدار
چلتی پھرتی چھاؤں تھی یہ ہستی بے اعتبار

ہاتھ رکھ کر عرض کی چوتھے نے یہ تابوت سے
کتنی جلد اٹھا ہے تو اس مجلس ناسوت سے

صحن عالم میں جو کل تک تھی ترے زیر نگیں
سات بالشت اب سمٹ کر رہ گئی ہے وہ زمیں

پانچویں نے عرض کی اے بادشاہ باوقار
تو نصیحت ہمکو کرتا تھا جہاں میں باربار

اے سکندر لیکن اب وا چشم عبرت ہو گئی
آج مرنے سے ترے پوری نصیحت ہو گئی

کی چھٹے نے عرض جو کل تک مطیع و رام تھے
ہیبت شاہنشہی سے رعشہ بر اندام تھے

آج ہیبت سے تری کوئی خمیدہ سر نہیں
سامنے تیرے کھڑے ہیں مطلق انکو ڈر نہیں

ساتواں بولا کہ تھی میری جدائی ناگوار
آج پہنچوں کس طرح تجھ تک بتا اے شہریار

آٹھویں نے عرض کی دیکھو بچشم اعتبار
ایک دم میں مٹ گیا اس سونے والے کا وقار

کی نویں نے عرض جب دنیا کا یہ انجام ہے
ترک اس کو پہلے ہی کر دینے میں آرام ہے

عرض کی دسویں نے اب عالم سے شکوہ کیوں نہیں
تنگ نظروں میں ترے اسوقت دنیا کیوں نہیں

تجھکو اس تابوت میں خاموش کیوں پاتے ہیں ہم
چار دیواری میں شہروں کی ترا گھٹتا تھا دم

روح نے چھوڑا ہے کتنی جلد یہ خاکی قفس
یوں گئی شاہی تری جس طرح اڑتی ہے مگس

خلق مشتاق زیارت اور تو روپوش ہے
گوش بر آواز دنیا اور تو خاموش ہے

کیوں نہ رکھا تو نے امید دل کو اتنا مختصر
دست برد موت سے ہوتا نہ تجھکو کچھ خطر

بستیاں آباد تھیں جتنی وہ ویراں ہو گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے خواب پریشاں ہو گئیں

تیرے صدقے کتنی جانیں اس تمنا میں گئیں — تو رہے زندہ سلامت اور ترا عز و جاہ

بچ سکا لیکن نہ تو بھی دستِ اجل سے میری — آخرش مر ہی گیا اے جانِ عالم آہ آہ

اک سطح پر خادم و مخدوم دونوں آ گئے — جان نثارِ جانِ جاناں جاں کھو کر رہ گئے

حکیم تاسع

حکم تھا مجکو نہ ہوں دم بھر کو میں تجھ سے جدا — لیکن اب تجھ تک رسائی کی نہیں پاتا ہوں راہ

میں ابھی قائم ہوں اپنے عہد پر اور تو نہیں — میرے آقا کیا یہی ہوتا ہے وعدہ کا نباہ

حکیم عاشر

کم نہیں یہ دن طلوعِ صبحِ محشر سے کہیں — جب تلک ہستیِ عالم ہو رہے گا یادگار

جاتے جاتے آج سے حرمان و غم بھر آ گئے — آنیوالی برکتیں اس دن کی ہیں سوگوار

ہے لہذا مژدۂ عبرت ہر ایسی آنکھ کو — جو زوالِ سلطنت پر ہو کسی کی اشکبار

آج روئے شاہ اور شاہی کا منظر دیکھکر — تخت کا مالک پڑا ہے تختۂ تابوت پر

از ہوہ جستہ میرٹھ — انوار حسین رسوا

سکندر کا تابوت حلقۂ فلاسفہ میں

نتیجۂ فکر لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی

شہر بابل میں سکندر نے کیا جب انتقال — جتنے تھے وابستۂ دولت ہوا ان کو ملال

درد و سوزِ غمِ دلِ اربابِ دولت سے اٹھا — صبح ہوتے ہی جنازہ شان و شوکت سے اٹھا

چھا گیا وابستگانِ دامنِ دولت کا غم — ابرِ تیرہ بن گیا سلطان کی فرقت کا غم

ہو گیا تیار تابوت مرصع زرنگار — رکھ دیا پیکر سکندر کا بچشمِ اشکبار

یوں حکیمان اولوالعزم آئے ماتم کیلئے — تھے کشادہ سب کے سینے ناخنِ غم کیلئے

کسی خاص مضمون کے لئے کلیات اکبر کو دیکھا تو ایسے شعر فوراً مل گئے گویا وہ میرے ہی مقصود کے واسطے لکھے گئے تھے۔

ناظرین ملاحظہ کریں کہ یہ اشعار کم و بیش موت کے مقصود کے کس قدر موافق ہیں۔ گویا اگر اور مضامین اس کتاب میں نہ ہوتے اور صرف یہی منتخب اشعار لکھ دئے جاتے تو میرا مقصود حاصل ہو جاتا۔ اور دلوں پر پہلے سے موت کی حقیقت طاری ہو جاتی ہیں نے اس کتاب میں مختلف حالتوں کے نظارے موت کے متعلق دکھائے ہیں۔ اگر ان اشعار کو غور سے پڑھا گیا تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مجموعہ اشعار میں کوئی شعر ایسا نہیں جو مضامین نثر کے کسی نہ کسی حصہ کا عنوان بنانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

کاش اس وقت میرے پاس کلیات اکبر کا حصہ دوم بھی ہوتا اور اس کا انتخاب بھی اس کتاب میں آسکتا۔ شاید خدا تعالیٰ آئندہ ایڈیشن میں یہ توفیق اور موقع عنایت فرماتے۔

حسن نظامی

زندگی کی چمک سے دیدۂ عبرت ہے بند — [illegible] ان دنوں
جلوہ و نمائش میں اک تفسیر رب العالمیں — [illegible] ان دنوں
من علیہا فان ہی پر ختم ہے قول قسمت — [illegible] ان دنوں

جیتے جی سب سامنے تھے پھول ہیں — [illegible]
وائے ہے ہوش کو [illegible] افسانوں میں — [illegible]

له ارتقائے کلیہ سے اجتماع للبقا۔

امیر کی موت اور فقیر کی موت

دولت مند جو مرتا ہے ۔ روتا ہے اور غم کرتا ہے

ہائے میں دنیا چھوڑ چلا! مال سے ناطہ توڑ چلا!

اور فقیر کو کیا ڈر ہے مرنا جینا برابر ہے

خالی آئے چلے خالی پچھلوں کا اللہ والی

ہے یہ نبی کا فرمودہ اَلْفَقْرُ فَخْرِی

زندگی کی چٹکیاں

حضرت اکبر الہ آبادی کی نظر سے

کتاب مکمل ہوچکی تھی تو مجھے اتفاقاً خیال آیا کہ اس میں لسان العصر ترجمان الملت حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کا کلام کچھ نہ لکھا گیا حالانکہ انکی تحریر میں عبرت و نصیحت کی باتیں ہیں ۔

ارادہ ہوا التماس نامہ تحریر کر کے کچھ منگاؤں مگر دل نے کہا ان کو حوادث زمانے نے روز روز کی علالتوں نے اور کبر سنی نے فرمائشوں کی تعمیل سے معذور کر رکھا ہے ۔ ایسی حالت میں تکلیف دینی مناسب نہیں ۔

اٹھ کر الماری میں سے کلیات اکبر حصہ دوم نکال لی اور اس کو سرسری نظر سے دیکھا تو حسب ذیل اشعار تھوڑی دیر میں مل گئے ۔

سالہا سال سے میں یہ کرامت کلام اکبری دیکھ رہا ہوں کہ جب کبھی

کیوں نہ لوں نام خدا اس بت کی صورت دیکھکر　　لوگ کہتے ہیں کہ کلمہ پڑھ کے مرنا چاہیے

کیسے کیسے زرنگار ایوان ملے ہیں خاک میں　　ریزہ ریزہ اب بھی ویرانوں میں اطلس پوش ہے

سن رہا ہوں شوق سے دنیا کے قصوں کو مگر　　دیکھئے رہتا ہو جو ختم داستاں تک ہوسکے

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا　　اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

شکوہ ملا جسکو زمانے میں مبارک ہو اُسے　　ہم نے تو کچھ بھی نہ پایا غم و حسرت کے سوا
مطمئن ہو کے لگا تا ہوں لحد میں بستر　　اب اٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

فرقت یار میں جینے کا سہارا کیا تھا　　خوب تھی موت سوا موت کے چارا کیا تھا
جان اللہ نے لی جسم ہوا داخل گور　　ہم نے بھی دل میں یہ سمجھا کہ ہمارا کیا تھا

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا　　اب گرد رہ گئی ہے یہ میلا نکل گیا
موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آگئی　　نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا

کام کوئی مجھے باقی نہیں مرنے کے سوا　　کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی نہ کرنے کے سوا
موت سے ڈرتے ہیں اب پہلے یہ تعلیم نہ تھی　　کچھ نہیں آتا تھا اللہ سے ڈرنے کے سوا

برباد کیا اجل نے مجھ کو کیا ہے بہت کہیے　　اشک رواں سے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا

جانتے ہیں کہ اجل سر پہ کھڑی ہے لیکن
محو ہیں انجمنِ دہر میں خوش بیٹھے ہیں

عقل حیران ہے پروانوں کی اس حالت پہ
شمع کو جس نہیں یہ جان دیے دیتے ہیں

جانتا ہوں میں کہ خواہش موت کی اچھی نہیں
زندگی بے لطف ہے جا سے مگر تو کیا کروں

کتنی باتیں پیہم اس دورِ فنا میں ہو چکیں
ابتدا میں تھی داخل [illegible] ہو چکیں
[illegible] دل میں تو سے [illegible] صبح و شام
[illegible] ہو چکیں [illegible] فنا میں ہو چکیں

کسی کو یاں بقا نہیں کوئی سدا رہا نہیں
یہاں انکار تک ہی یہ ہو نہیں تو کچھ گلا نہیں
غرور تھا نمود تھی ۔ ہٹو بچو کی تھی صدا
اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتا نہیں

آرزوئے مرگ کی تم کرتے ہو اکبر لیکن
سوچ لو قبر میں آرام ملے گا کہ نہیں

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا
اس لیے مجھ سے کم رکھتے ہیں ملنا [illegible]

بیہودہ زندگی سے کرو تم مقدمے
دکھلا ہی دے گی موت نتیجہ نکال کے

[illegible]ن صدائے صور تو ایسی نہ تھی مگر
تعظیم حشر کے لیے سب اٹھ کھڑے ہوئے

رفتار ہوا اس قدر سے موج فنا
تجھ میں کچھ قطرے ہوا سے ہیں ابھر [illegible]

دم بھر میں جسم و روح کا قصہ تمام تھا — مٹی میں مل گیا وہ اپنے وطن گئی

دنیا میں بھی مست اثر نغمہ کن ہے — پردیس میں ہو روح مگر دیس کی دھن ہو

دنیا کیلئے ہنگامے تھے خلق ایک طرف آپ ایک طرف — اب شہر خموشاں عالم ہو مٹی ہے لحد کا کونا ہے

رو رہے ہیں دوست میری لاش پر بے اختیار — یہ نہیں دریافت کرتے کس نے اسکی جان لی

اب خاک میں ہیں کل تخت پہ تھے اک زیست کی حالت یہ بھی تھی — اللہ کی قدرت یہ بھی ہے اللہ کی قدرت وہ بھی تھی

حیرت میں ختم ہوگئی افسانۂ زندگی — حل ہو سکا نہ ہم سے معمائے زندگی
اس زندگی نے خود ہی کیا ہے تجھے اسیر — تجھکو یہ کیوں ہے شوق و تمنائے زندگی

سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو — حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

مفتوں ہوگئے ہم اس بے بقا چمن کے — آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی نے پھول بن کے
ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دیکھیں — اٹھے جو ہیں بگولے برباد ہوں گے تن کے
گونجی بہت ہے اس میں فریاد بیکسوں کی — ٹکڑے اڑیں گے اک دن اس گنبد کہن کے

نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جان — حشر کہتا ہے منا لی جائے گی
زندگی کی کل ہے پیچیدہ تو ہے — سانس لے لیکر چلا لی جائے گی

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقیں آیا — اُسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی — موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

ہر ایک کو موت کا اک دن پیام آئے گا — خدا کا نام لیتے جاؤ کام آئے گا

غالباً خاتمہ بالخیر سمجھ لو اس کا — جسکے مرنے کا نئی روشنی نے غم نہ کیا

قبروں سے دوستوں کے بھرے ہیں سوادِ شہر — لوں کتنے نام روؤں میں کس کس کو شانہ پر

ہر قطرہ اور ذرہ ہے موردِ حوادث — دفتر ترا کہاں تک دورِ رقم کہاں تک
شخصی ہوں خواہ قومی سب حالتیں ہیں فانی — کبر و غرور کب تک جاہ و حشم کہاں تک
کہتے ہیں دوست اکبر کو دیکھ کر بہ حسرت — ہے دین کا دم غنیمت لیکن یہ دم کہاں تک

غافلوں کو جلوۂ ہستی بہارِ عید ہے — چشمِ بینا میں مگر یہ عمر کی تمہید ہے

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے — کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے
یہ دیکھتے ہو جو کاسۂ سر غرور و غفلت سے کل تھا مملو — یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے نظر ہو جس کی وسیع دیکھے — ابھی یہاں خاک بھی اڑے گی جہاں یہ قلزم ابل رہا ہے

اکبر یہ لطف ہے کہ دعا بھی اسے سکھاؤ — ایسا نہ ہو کہ صرف دوا ہی کا ہو رہے

نقش ماضی منظرِ بے معنی و مفہوم ہے — مصلحت فطرت کی ہو یا ذہن کا مقسوم ہے
یہ رہا لاکھوں ہی موجوں میں یہ بحرِ فنا — ورد کے قابل فقط یا حیّ یا قیّوم ہے

نہ پھیلا پاؤں تو اتنا حیاتِ چند روزہ میں — سمجھ لے قبر میں تیرے لئے جا صرف دو گز ہی

ابھاری رنگ سودا دیوانگی بھری ہے — ہے جوشِ موسمِ گل جو پھول ہے پری ہے
شمع اور پتنگ سے ہے ہر صبح وعظِ عبرت — یہ بھی مرے پڑے ہیں وہ بھی بجھی دھری ہے

روح کا پہچاننا سب سے بڑا سائنس ہے — اسلئے ہادیِ دین مطلوب جن و انس ہے

یہ جو ہنگامۂ تزئینِ عیش و کامرانی ہے — تماشا غافلوں کا آج ہے کل اک کہانی ہے

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے — قوم ہی کو دیکھئے مردہ ہے اور موجود ہے

موجودہ زمانہ میں خود مختار بادشاہ صرف چار تھے۔ اور ان چاروں کی عزت آسمان کا تارہ بنی ہوئی ساری دنیا میں چمکتی تھی۔ مگر خدا تعالیٰ نے دکھا دیا کہ اس عزت کو بھی موت آیا کرتی ہے۔ اور عزت کے طلبگاروں کو اس انجام سے ڈرایا کہ جن کی عزت میں کروڑوں آدمی جھکے ہوئے تھے [illegible] آن میں ملیامیٹ ہوگئی

جسکو بقا نہیں ہے وہ دلکشا نہیں ہے　　جسکو فنا نہیں ہے اسکا پتا نہیں ہے

مسرت ہوئی ہنس لیے دو گھڑی　　مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا روز زیست　　سلایا شب گور نے سو رہے

دوزخ کے داخلہ میں نہیں انکو عذر کچھ　　فوٹو کوئی لگائے جوان کا بہشت میں

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے　　بی۔اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

سنتا ہوں قبر مری ریل میں آجائیگی　　خود مٹا ہوں جب اسی راہ میں مدفن بھی ہی

زندگی تھی ہی مصیبت موت بھی برباد ہے　　کس قدر اس دور میں بگڑا ہوا ہی دین ہائے
ماسٹر ہیں نزع میں لڑکوں کی شامت دیکھئے　　اُن کا فوٹو لیتے ہیں پڑھتے نہیں یٰسین ہائے

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا　　پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ہوا آج خارج جو میرا سوال　　کہا میں نے صاحب سے باصد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ　　وہ جھنجلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سن کر بہت طبع غمگیں ہوئی　　مگر اس تصور سے تسکین ہوئی
کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے　　تو بیشک جہنم بھی ہے کوئی شے

تیسری بے عزتی چین کے حکمران کی ہوئی جو ہزاروں برس سے کروڑوں
آدمیوں پر گویا خدائی کر رہا تھا۔ مگر اس عزت کی اجل بھی آئی اور انقلاب نے
اس کو گور میں دفن کر دیا۔

چوتھی عزت زار روس کی تھی جو یورپ و ایشیا کے وسیع عظیم الشان حصول
پر نہایت دبدبہ اور خود مختاری سے سلطنت کر رہا تھا اور جسکی عزت کا آفتاب انقلاب
کے بے شمار گھٹاؤں سے بھی کبھی چھپا نہ تھا کیونکہ عزت کی موت کا وقت نہ آیا تھا۔
لیکن مارچ سنہ ۱۹۱۷ء میں یہ منحوس گھڑی آگئی۔ اور اس نے ذراسی مہلت بھی علاج کی
نہ دی جس میں وہ اپنی عزت کے مرض کا علاج تو کر سکتا۔ مرگ ناگہاں جسکا نام ہے وہ اس
شہنشاہ اعظم اور اسکی بیگم کو برداشت کرنی پڑی۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ مملکت وسیع روس کا
ایسا شہنشاہ تھا جسکے اشارہ چشم پر سر قلم ہوتے تھے۔ اور اشارہ ابرو پر جانیں اڑا دی
جاتی تھیں جسکی ہاں اور جسکی ناں پر لاکھوں کروڑوں روپے کے فوری فیصلے منحصر
تھے اور جسکی طرف بڑے بڑے بادشاہوں کی آنکھیں لگی رہتی تھیں مگر ایک گھنٹہ کے
بعد وہ ایک قیدی بن گیا۔ اور مجرموں کیطرح اپنے غلاموں کا حکم سننا پڑا۔ اس کی
شہنشاہ بیگم نے نہایت بے کسی اور غریبانہ عاجزی سے پاسبانوں سے یہ جملے کہے۔
"آپ یہ سمجھیں کہ میں ایک ماں ہوں۔ اور بیمار بچوں کی حفاظت کر رہی ہوں" یہ اس
عورت [illegible] جس نے ظلم سے لاکھوں بچوں کو یتیم کرا دیا تھا جسکی مرضی سے بے شمار
[illegible]

[illegible] زار روس اور اسکی بیگم کی خوابگاہ میں درانہ چلا جاتا مگر
آج ان [illegible] قیدیوں کی طرح قبل از وقت بیدار کیا جاتا ہے اور جانوروں کی
شکل [illegible] نظر بندی میں پہنچایا جاتا ہے اور یہ غریب کچھ نہیں بول سکتے۔
[illegible] کہ ہم تمہارے ہر حکم کی تعمیل کو تیار ہیں۔

تو تم اس فانی عزت کی طلب میں آخرت کے اعزاز باقی کو کیوں بھولے جاتے ہو۔

موت ہر چیز کو آتی ہے۔ اور عزت کی موت سب موتوں سے بڑھ کر دردناک ہے کیونکہ عزت کی خاطر انسان جان دینی گوارا کر لیتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے

حشمت مٹے جلال مٹے کر و فر مٹے ۔ مال و منال سارا مٹے یا کہ زر مٹے

سب جائیں مٹ بلا سے نہ عزت مگر مٹے ۔ اور آبرو کے جینے پہ انسان مر مٹے

لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ عزت فقط خدا کی ذات کو سزاوار ہے آدمیوں کی حرص جاہ و مرتبت محض ہیچ ہے۔

دیکھنا ان دو چار سالوں میں لگاتار کیسی کیسی۔

عزتوں کے تاج تاراج

ہوئے ہیں سب سے پہلے سلطان عبدالحمید خاں والی ترکی معزول ہوئے ان سلطان کی وہ ہیبت اور شوکت تھی کہ تمام دنیا انکے نام سے کانپتی تھی اور یورپ میں اس تاج وار نے تہلکہ ڈال رکھا تھا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں اس ایک پیکر خاک کے ہاتھ میں تھیں۔ مگر جب خدا نے اپنی قدرت کا تماشہ دکھانا چاہا اور عزت کی روح سلب کرنے اور عزت طلب لوگوں کو عبرت دلانے کا ارادہ کیا تو پلک جھپکاتے ادھر کی دنیا ادھر کر دی۔ اور سلطان عبدالحمید خاں تاجور سے ایک معمولی قیدی بنا دیے گئے۔ جو آج تک گمنامی اور بے عزتی کی قید میں چپ چاپ پڑے ہیں۔

دوسرے عزت دار تاج پوش شاہ ایران تھے۔ انکی عزت بھی خاک میں مل گئی اور چند پرجوش نوجوانوں نے انقلاب کر کے بادشاہ کو نکال دیا اور انکے بیٹے کو جانشین کر کے پارلیمنٹ قائم کر دی۔

جنکو غرّہ تھا۔ وہ سب حیران رہ گئے جب انہوں نے اخباروں میں یہ پڑھا کہ ٹیٹانک جہاز ایک برف کے ٹکڑے سے ٹکرا کر آناً فاناً میں ڈوب گیا۔ اور اسکے بڑے بڑے نامور مسافر موت کے گھاٹ اتر گئے جنہیں انگلستان کے مشہور انشاپرداز مسٹر اسٹیڈ ایڈیٹر ریویو آف ریویوز بھی تھے۔

سمندر میں قدرتی برف کی ایک چٹان تیرتی پھرتی تھی۔ رات کے وقت جہاز اس سے ٹکرایا۔ مسافر بے خبر پڑے سوتے تھے۔ انکو جگایا گیا کہ اٹھو جہاز ڈوبتا ہے اور موت آتی ہے تو انہوں نے جھلا کر جواب دیا۔ جھوٹے ہو۔ یہ جہاز قیامت تک نہیں ڈوب سکتا۔ اسمیں اس قسم کے آلات لگے ہوئے ہیں جو کمالات سائنس کی بہترین یادگار ہیں۔ اس جہاز کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ تم بکومت۔ جاؤ سونے دو۔

مگر وہ پھر ایسے سوئے کہ اب شاید قیامت کو بیدار ہونگے۔ ٹیٹانک چند منٹ میں غرقِ آب ہوگیا۔ اور عقل پر گھمنڈ کرنے والے اپنے بستروں پر پڑے ہوئے دم گھٹ گھٹ کر مر گئے۔

جب موت آگئی تو انہوں نے دیکھا کہ زندگی اور موت خدا کے قبضہ میں تھی انسان بالکل بے بس تھا۔ اور ہماری بڑی بھول تھی جو ہم نے خدا کو چھوڑا اور اسبابِ مادی پر بھروسہ کیا۔

قدرتی برف سمندر کے کھاری پانی میں غوطے کھاتی تھی۔ اور وہ آدمی جو بجلی کی روشنیوں میں ہوٹلوں کے اندر بیٹھ کر شیشہ کے گلاسوں میں سوڈا برف ملا ملا کر پیا کرتے تھے۔ آج وہ خود سمندر کے گلاس میں برف اور سوڈا واٹر آب سمندر میں تنکا (؟) تنکے کی طرح جھٹکے کھا کھا کر دم توڑ رہے تھے جنکو کبھی انہوں نے گلاس میں دیکھا تھا اور خان سامان پر خفگی ظاہر کی تھی۔

حسن نظامی

اے انسان عبرت پکڑ اس انجام سے۔ اے آدمی ڈر خدا کی گرفت سے غرور نہ کر۔ عزت پر اترا نہ جا کہ ایک دن ہر عزت کو موت آیا کرتی ہے اور ایک وقت سب جاہ و جلال مٹ جایا کرتے ہیں۔

اونچے اونچے مکاں تھے جنکے بڑے — آج وہ تنگ گوریں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانہ بوم
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی انکے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے
بسجدہم طائراں خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

ٹائٹانک جہاز کی اجل

کئی برس ہوئے یورپ میں ایک جہاز بنا تھا جسکا نام ٹائٹانک تھا۔ اس جہاز میں ایسے آلات اور ایسی چیزیں لگائی گئی تھیں جو پانی میں ڈوب نہیں سکتیں۔ اور یورپ کے ہر عاقل شخص کو یقین تھا کہ یہ جہاز کسی طوفان میں غرق نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سے بڑا جہاز تھا۔ اس میں دنیا کے عیش کا سب سامان فراہم کیا گیا تھا۔ اسکو اہل عقل کی کاریگری کا سب سے بہتر نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جسکے گھمنڈ نے انسانوں کو دریا کے خطروں اور موت کے اندیشوں سے بے پروا کر دیا تھا۔

حضرت نوحؑ کے طوفان پر جنکو یقین نہ تھا حضرت نوحؑ کی کشتی کی نجات پر جو ایمان نہ لاتے تھے۔ عالم اسباب کی مدد سے موت کا مقابلہ کرنے اور اسپر فتح پانے کا

ہوش سنبھالا تو شاہزادہ جہانگیر ابن اکبر شاہ بادشاہ کی محبوب نظر ہوئی اسی وجہ سے شیر افگن خاں گورنر بنگالہ سے بیاہ کر کے پایہ تخت سے دور رہیدی گئی۔

اکبر مرا۔ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ تو نور جہاں شہنشاہ بیگم بنی۔ ہند میں سونے چاندی کے سکے اسکے نام پر چھپے۔ اور شہنشاہ نے دو کباب اور ایک پیالہ شراب کے عوض سلطنت اسکے ہاتھ فروخت کر ڈالی۔

یہ وہی نور جہاں ہے جو ایک چپ چاپ کوہستان میں پیدا ہوئی تھی اور ماں نے اسکو جنگل میں اکیلا ڈال کر آگے کو راستہ لیا تھا۔ یہ ہی نور جہاں ہے جو اکبر کے شاہی باغ میں کھڑی تھی۔ جہانگیر سے اسی کی نگاہ لڑی تھی بھول پن سے اسی نے کبوتر ہاتھ سے اُڑا دیا تھا۔

یہی وہ عورت ہے جسکی خاطر شیر افگن خاں جہانگیر کے ہاتوں مارا گیا۔ اسی دم توڑنے والی نے سلطنت ہند کے داعیہ داروں کے دم خم توڑ کے رکھ دیے تھے طوطی کی طرح چہکنے والی بلبل کی شکل بولیاں بولنے والی بزم شاہانہ کی شمع رزم رستمانہ میں شیروں کی مانند آگے بڑھ کر گرجنے والی۔ اسی کی تدبیروں نے بڑے بڑے عالی دماغ حکمرانوں کے جوڑ توڑ کو نیچا دکھایا تھا یہی دریا کے کنارے ایک عظیم الشان لشکر سے تیر کمان ہاتھ میں لیکر لڑی تھی یہی ہے جسکے گلے میں سونے کا طوق اور ہاتھ پاؤں میں طلائی ہتکڑیاں بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ پھر وہی یہ ہے جس نے تلوار کے منہ سے اپنی جان بچا کر حریفوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔

آج اسکی موت آئی ہے

آج اس نے سفر آخرت پر کمر باندھی ہے۔ اب کوئی تدبیر کوئی لطیفہ کوئی شعر کوئی نگاہ ناز کوئی سخن۔ کچھ بھی اسکی جان کو بچا نہیں سکتا

لہذا تم سب کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اپنے بندوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کریگا لیکن بعالم ظاہر فرزندوں پر لازم ہے کہ مخلوق خدا اور مسلمانوں کے کشت وخوں کا باعث نہ ہوں فرزند زادہ بہادر کو آخری دعا کہو۔ رخصت کے وقت نہ دیکھنے کا اشتیاق باقی رہا بیگم اگرچہ بظاہر رنجیدہ ہے لیکن دل کا حال خدا جانتا ہے۔ عورتوں کی کوتہ اندیشی سوائے ناکامی کے کوئی ثمرہ نہیں رکھتی۔ رخصت رخصت۔ رخصت۔

ترجمہ رقعہ عالمگیر بادشاہ بنام شاہزادہ محمد کام بخش۔ بوقت نزع فرزند جگر بندمن۔ جہاں تک میرا اختیار تھا میں نے نصیحت اور وصیت کی لیکن چونکہ خدا کو منظور نہ تھا کسی نے نہ سنا۔ اب کہ میں بیگانہ جاتا ہوں تمہاری بے بضاعتی پر رحم آتا ہے لیکن بے سود ہے میں نے جو کچھ عذاب و گناہ کیا اس کا پھل اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں دنیا میں آیا تو تنہا تھا لیکن جاتا اس قافلہ کے ساتھ ہوں۔ سوائے خدا کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ لشکر اور لشکریوں کا خیال اور بھی موجب ملال اور وبال آخرت ہے۔

مجھے اپنی کچھ خبر نہیں ہے میں نے بہت سے گناہ کئے ہیں نہیں معلوم کس عذاب میں مبتلا ہوں گا۔ مخلوق کی نگہبانی اگرچہ رب العالمین خود کرے گا لیکن مسلمانوں اور فرزندوں پر بھی واجب ہے۔

جو کچھ ضروری تھا تمہارے حق میں کہا گیا اس کو دل وجان سے منظور کر دلیبا نہ ہو کہ مسلمانوں کا کشت وخوں ہو اور اس کا وبال میری گردن پر عائد ہو۔ تمہیں اور تمہارے بیٹوں کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور خود رخصت چاہتا ہوں۔ اضطراب کی حالت ہے۔

سعید احمد مارہروی

شاہنشہ مجھ جیسی دم توڑنے والی نورجہاں کو دیکھنا۔ یہ فلاکت زدہ ایرانی امیر کے مرزا اعتقت ہیٹھ ہوئی۔ وہ بیابان کا ... (باقی ناخواندہ)

محل میں کیسی کیسی خوشیاں میں نے دیکھیں۔ یہ اجل ان سب کو ختم کرنے آئی ہے باہر
جاؤ کیا سب باغ اجڑ گئے۔ کیا سب نہریں سوکھ گئیں۔ کیا تمام بلبل خاموش ہو گئے۔ شمع کو دیکھو
کیا وہ بھی گھل چکی۔ پروانہ پر نظر اٹھاؤ اس میں کچھ دم ہے یا وہ بھی جل بسا۔ اف اس زندگی کی
داستان کیسی ادھوری رہ گئی۔ میں نے تو ابھی کچھ بھی نہ سنا تھا۔ داستان گو کیوں خاموش ہو گیا

مجھے لٹاؤ پنکھا جھلو پسینہ پونچھو۔ ذرا سہارا دو میں ایک بڑی منزل طے کرنے چلی
ہوں۔ بتاؤ کون کون میرے ساتھ چلیگا۔ قبر کی تنہائی میں کون میرا جی بہلانے ہمراہ جائیگا
کوئی نہیں بولتا۔ کوئی نہیں کہتا بی بی ہم چلیں گے۔ ملکۂ عالم ہم حاضر ہیں۔ ارے کیا تم
سب بے وفا ہو گئے کیا تم نے انکار کر دیا مجکو اکیلا جانے دینے پر راضی ہو گئے

لا الٰہ الا اللہ۔ الملک للہ۔ الحیات للہ۔ موت بہت جلدی آگئی۔

میں نے تو ابھی دنیا میں کچھ بھی نہ دیکھا۔ اسکا نقارہ اسی جلدی بج گیا کفن منگاؤ میں اسکو
دیکھوں۔ ایسا نہو موٹا کپڑا ہو۔ ایسا نہو میرے بدن پر ٹھیک نہ آئے۔ کیا تم کافور میں اس کو
بساؤ گے ؟ کیا مجکو معمولی تختے پر لٹاؤ گے اور کھینچ کھینچکر نہلاؤ گے ؟

اف! میرا دم کھنچتا ہے۔ میرا سانس رکتا ہے کیا موت اسی کا نام ہے ؟
مجھے چکر آتا ہے۔ میرا سر پھرا جاتا ہے۔ میرے دل پر کسی چیز سے چوٹ لگی۔ ہلی ہے
اور وہ ان دھاکوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی رگیں دماغ کی طرف سمٹ
رہی ہیں۔ میرے سینے سے کوئی چیز سانس کے ساتھ حلق میں آکر ٹکراتی ہے۔ بدن میں سن
سن کی آواز آتی ہے۔ مجھے جماہی لینے دو مجھے انگڑائی آتی ہے۔ اس جماہی نے اس انگڑائی
نے میرا جسم مردہ کر دیا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور نیند کا سا غلبہ آنکھوں پر چلا آتا ہے۔
ذرا لٹینا۔ ذرا لٹینا میں چلی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ وصی رسول اللہ

یہ کہتے کہتے ہندوستان کی یہ مشہور تاریخی کتاب مشہور اشعار کی کتاب مشہور فلسفہ
حیات کی کتاب مشہور تمدن و معاشرت کی کتاب اور حسن و عشق کی پتلی۔ مگر انکے جذبات کا

میں آئی۔ شاہ نے پیام نکاح بھجوایا۔ میرے دل نے غم بھلایا۔ مگر زبان پر پھر یہی آیا۔
کہ لونڈی غمگین ہے۔ اس سے یہ چھیڑ خلاف آئین ہے۔

وقت بدلا۔ بستر شاہ تک پہنچی۔ محل کی ملکہ بنی۔ فرمانوں اور سکوں پر نور جہاں درج ہوا۔ تلواریں قدموں پر سر ٹیکنے لگیں۔ سرکش امرا گردنیں جھکا کر سلام کرنے لگے۔ اور میرے سوا اتنے بڑے ہندوستان میں کوئی عزت والا عیش و راحت والا اقبال و قسمت والا نہ رہا
شوہر تاجدار۔ یا شوہر تاج نثار کی حالت آخری دیکھی تو اپنی اولاد کی حکمرانی کا خیال سامنے نکلا آیا۔ فکر و تدبیر کو آگے بڑھایا۔ کانٹے توڑے۔ ٹیلے اکھیڑے۔ میدان برابر کئے۔ مگر قسمت میں یہ نہ تھا۔ شاہ جہاں بڑھ گیا۔ میرے منصوبے گر پڑے۔ بادشاہ کے مرتے ہی رانڈ قیدی بنی گولائق شاہجہاں نے ہر آسایش کا سامان مہیا کر دیا۔

اب میں وہی نور جہاں زندگی موت کو دیتی ہوں اپنی بھول بھلیاں کہانی دل سے کہتی ہوں اور مرتی ہوں

آہ میری اجل آئی ہے جسکا طفلی جوانی اور شہنشاہی کے ایام میں خیال بھی نہ آتا تھا۔
مر جاؤں گی غریبوں اور محتاجوں کی طرح گور میں جاؤنگی۔ وہاں نہ کافوری شمع ہوگی نہ پھولوں کے انبار۔ نہ بلبل ہوگا۔ نہ پروانہ۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ سوچتے سوچتے کروٹ لی۔ شال کو سمیٹا چپ چاپ لونڈیوں کو دیکھا جو پلنگ کے آس پاس سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ اور بولی شہنشاہ کچھ بول نیک قدم زبان کھول۔ ورو اللہ تو ہی کچھ کہہ۔ ارے میں مرتی ہوں۔ دیکھو میرا وقت آخر آپہنچا کیا موت سب کو آیا کرتی ہے کیا مرنا ہر جاندار کو لازم ہے کل نفس ذائقۃ الموت میں کیا میرا نفس ہو مر دو تھا مجھے اٹھاؤ۔ تکیہ سے لگاؤ۔ شربت لاؤ۔ دو گھونٹ دو جان لبوں پر آئی ہے۔ اس

دنیا جو سوگواری کا لباس پہنے رہتی ہے۔ یہ تیری توبہ کا نتیجہ ہے قصبہ یا شہر جو ویران نظر آتا ہے وہ تیرے ہی التفات کا ثمرہ ہے کیسی کیسی ہستیوں کو تو نے خاک میں ملا دیا۔ اپنے پنجۂ الم میں گرفتار کیا۔ آج ہم جنکے دردناک افسانے کان لگا کر سنتے ہیں عبرت و بصیرت کے سبق حاصل کرتے ہیں وہ تیرے جور و ستم سے نالاں سدھارے ہیں اور اپنے اپنے دلوں میں کیسے کیسے حسرت و ارمان لے گئے ہیں۔ تیری منحوس اور مجرب اخلاق باتیں قابل بیان نہیں تو غریب الوطنی کی حالت میں بھی رحم نہیں کھاتی۔ کوئی بیچارہ بھائی بہن۔ عزیز و اقارب سے دور ہے وہ منتیں اور التجائیں کر رہا ہے کہ چند دنوں کی تو مہلت دے کہ آخری دیدار کر لوں مگر تو ایسی بے رحم و سنگ دل ہے کہ کسی کی کوئی بات سماعت ہی نہیں کرتی۔ تو انکے بھی دربار میں نہیں آئی اور انکو بھی تخت شاہی سے اتار کر فنا کا لبریز جام پلا دیا جنکا راج پاٹ مشرق سے مغرب تک تھا اور جنکو خورشید خاور بھی خراج دینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اب نہ رستم کا نشان ہے نہ اسفندیار کا پتہ۔ نہ افلاطون و بقراط ہیں۔ نہ نیوٹن اور بیکن۔ نہ شکسپیر کا وجود ہے نہ ایڈیسن کا۔ نہ وہ عظیم الشان سلطنتیں باقی ہیں۔ نہ ان حکماء و فلاسفر کا قابل رشک جماو ہے غرضکہ تو نے کسیکو نہ چھوڑا اور انکی کسی تدبیر کو نہ چلنے دیا۔

پیر فلک کی نظروں میں یہ دلچسپ نظارہ ہے۔ اسکو وہ ابتدائے آفرینش عالم سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے یاس و نامرادی اور ارمان و حسرت کی خطرناک لڑائیاں دیکھی ہیں اس نے موت و حیات کی باہمی کشمکش کو دیکھا ہے اس نے روح و جسم کی مفارقت کے آخری اضطراب کا تماشا دیکھا ہے اس نے آخری دم کی تکلیف و غنودگی۔ ایڑیوں کی پٹک اضطرار و اضطراب غرضکہ انسان و حیوان کے آخری سفر کے تمام جگر خراش تماشے دیکھے ہیں جب یہ تمام واقعات اسکی خونخوار آنکھیں دیکھ چکی ہیں تو یقیناً وہ سنگدل ہوگا اور سنگدل کسی پر کیوں رحم کھانے لگا اے موت۔ بہت سے مصیبت زدوں کو دیکھا ہے کہ وہ تیری دید کی تمنا رکھتے ہیں۔ جو بدنصیبوں اور فراق کے ماروں نے تو تجھ پر اپنی پیاری جانیں قربان کر دی ہیں۔

بولتا ہوا نوشتہ۔ غم و ہجر اور شہ چور کائنات کی بے نظیر بہار دکھانے والی ملکہ مرگئی۔ اور کہ گئی
کہ مرنا سب کو ہے۔ اور مرنا ہی وہ چیز ہے جس سے راحت ابدیہ اور نعمت دوامی میسر آتی ہے۔

حسن نظامی۔

موت

زندگی ہر شخص کو نہایت عزیز ہوتی ہے۔ دنیا میں کون ایسا بشر ہے جو اسکے وجود کی
خیر نہیں مناتا۔ بوڑھا ہو یا جوان کمسن ہو یا بچہ۔ ہر شخص طویل عمر کا طالب ہے اور دنیا کی لذتوں کا
مزہ چکھنا اور اسکی آرائشوں میں پھنسا رہنا اہل دنیا کا ایک خاص مذاق ہے۔ باری تعالیٰ
نے گلشن عالم میں ایسی ایسی مختلف النوع چیزیں خلق فرمائی ہیں جنکو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور
اسکی صناعی و حکمت کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے منجملہ ان تمام چیزوں کے ایک ایسی خوفناک
چیز بھی جاندار کے لئے پیدا کی ہے جس سے ہر متنفس پناہ مانگتا ہے۔ اور اس کا نام سنتے ہی
آبدیدہ اور رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کانپنے لگتا ہے۔ لرزنے لگتا ہے۔ وہ کیا ہے؟ موت جو زندگی
کی لذتوں اور مسرتوں کو خاک میں ملانے والی ہے اس سے بڑھ کر خطرناک و دل آزار دنیا
میں کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بہادر سے بہادر دلیر سے دلیر شخص کو آنکی آن میں پچھاڑ دیتی ہے
کسی کا اس سے زور نہیں چلتا اور آجتک کوئی اس سے جیت نہ سکا۔

اے موت تجھ سے ایک زمانہ نالاں ہے اور دنیا میں کون ایسا ہے جو تیرے
تیر کا نشانہ نہیں بنا اور نہیں بنے گا۔ روز ازل سے تیرا طریقہ تیرا ڈھنگ۔ تیرے تیور۔
تیرے مزاج قاتلوں کی مانند ہے۔ تو جہاں کی رونق کو برباد کر دیتی ہے۔ اے موت تیرا اسکہ
بحر و بر پر بیٹھا ہوا ہے۔ سارا جہان تیرا لوہا مانے ہوئے ہے تیری کوئی برابری نہیں کر سکتا اے
موت تیری تیغ فنا سے کسی کو امان نہیں طفل ہو۔ پیر ہو۔ جوان ہو کسی میں تو امتیاز نہیں کرتی
تیرے دل میں رحم نہیں ہمدردی نہیں مروت نہیں۔ تو نے غنچہ ہو یا گل کچھ بھی نہیں چھوڑا
جس بار اگر کسی نونہال پر تیری قہر و غضب کی بجلی گری تو پھر اسکی ہستی خاک سیاہ ہو جاتی ہے

اور گرم محسوس کرنے کا وہم ہوتا تھا چند سانس کیلئے فراموشی سے بچانے اور کسی سہل کے
ایک نظر دیکھ لینے کیلئے کتنے طریقے کیسی کیسی ترکیبیں نہ کیا کیا صنعتیں اختیار کی گئی ہیں۔

یہ قاعدہ ہی کہ دوست و احباب چند روز سے جدا ہوتے ہیں تو خود بخود بنائے ہوئے مکان
لگتے ہیں وحشت اور اسی قسم کی ہزاروں چیزیں جنکا ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ مکان سے
اسی قدر محبت ہو جاتی ہے جبکہ ہمارا اور ان کا ساتھ رہے اور ہماری نظر کے سامنے
رہیں۔ ایک دوست جس سے الفت و محبت کے پینگ بڑھ جاتے ہیں۔ اسی قسم کی طرفین
میں مغائرت نہیں رہتی۔ اسکی صاف وجہ یہی کہ ہمارا ان کا بہت ساتھ رہتا ہے ہم دو ہر
وقت اٹھتے بیٹھتے اور ہم صحبت رہتے ہیں۔ ایک مکان میں جو شخص مدت دراز تک اپنی زندگی
بسر کرتا ہے۔ تو اسکو در و دیوار سے الفت ہو جاتی ہے جب وہ اسکو چھوڑا جاتا ہے تو دلیں
اسکے ایک قسم کا درد ہوتا ہے۔ اور جدائی شاق ہوتی ہے۔ اسکا فراق [illegible] نظر آتا ہے
اسکا چھوڑنا بہت برا معلوم ہوتا ہے کبھی مکان کو [illegible] سال [illegible] ہوں اور اسکا [illegible]
سے دیکھتے چلے آتے ہوں اگر اسکو گرتا دیکھیں تو ہم کو رنج ہوگا۔ اور ہمارا ایک خاص
کیفیت دل پر طاری ہو جائیگی۔ ان چیزوں سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی ہے کہ یہ بات
ہمارے خمیر میں موجود ہے کہ جس چیز کو ایک عرصہ تک دیکھتے رہتے ہیں اس سے دلی انس ہو جاتا
ہے یہی وجہ ہے جو ہمکو ترقی عمر کی خواہش میں غلطاں و پیچاں رکھتی ہے کیونکہ زندگی کا بڑا حصہ
دنیا میں بسر ہوا اسلئے طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ اس سے الگ ہو جائیں عاشق دنیا کی
چیزوں نامانوس چیزیں اور وہاں جا کر ہیں جہاں کے حالات و واقعات سے ناواقف
طرز معاشرت سے بے خبر رسوم و رواج سے نا آشنا ہیں۔

دنیا کی ہر شے میں گو رفتار زمانہ کیساتھ انہدام کے آثار نمایاں ہیں مگر اس شکستگی
پر بھی موثر اور دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اسی سبب سے ہم دنیا میں زندہ رہنے کے آرزو مند ہیں
اور موت سے پناہ مانگتے ہیں۔

پروانوں کو دیکھو کہ وہ اپنی جانوں کو بلا خوف و خطر تیرے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ باتیں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں مگر اکثر دیکھا گیا کہ تجھ سے ہر شخص بھاگتا ہے اور تیرے نام آتے ہی آدمی کی روح قبل از وقت پرواز کر جاتی ہے۔

انسان کی عمر کا جسقدر حصہ ترقی کرتا جاتا ہے آرزوؤں۔ امیدوں اور مسرتوں میں کمی ہوتی جاتی ہے لیکن باوجود ان نامرادیوں کے اُسکے دل میں جینے کی ہوس روز افزوں ترقی کرتی جاتی ہے اور اسکی یہی آرزو ہوتی ہے کہ جیتی عمر دراز ہوا تنی ہی مسرت کا باعث ہو تاکہ کچھ دن اور باغ زندگانی کی خوشگوار ہوائیں کھائیں۔

ضعیفی کی زندگی نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے اعضائے جسمانی کمزور ہوش و حواس میں نمایاں فرق اٹھنے بیٹھنے میں مصیبت۔ ذرا ذرا سے کاموں کے لئے دوسروں کے محتاج اور ہر ایک خواہش میں دوسروں کے دست نگر ہیں۔ انہی وجوہات سے سکندر نے دوامی زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ آب حیات کی خواہش ترک کر دی اور صاف کہدیا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے سکندر کے سوا دوسرے سے یہ امر غیر ممکن تھا اسلیئے کہ وہ عالم شباب کے جوش میں تھا کسی بوڑھے سے پوچھو جو ضعیفی کی تنگ سختیوں اور تلخیوں کا مزہ چکھ رہا ہو وہ بھی اپنی زبان سے یہ نہ کہیگا کہ مجکو موت آجائے کیونکہ باوجود ان تمام مصائب کے وہ زندگی کو نعمت سمجھتا ہے اور اسکی افزونی کی آرزو رکھتا ہے

مرنے کے بعد بھی انسان اپنا نام زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ انسانی ہوس کا یہ تقاضا ہے کہ بقائے نام کیلئے قبر پر کتبہ ہے۔ لوگ تو ہمارے بعد بھی ہمکو یاد کریں۔ ذکر گزشتہ کو دلمیں تازہ کریں باوجود دنیا سے رخصت ہو جانیکے انسانی طمع کی خام خیالی اور خود داری پر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ وہ سب لوگ جنکو زندگی میں بڑی بڑی سلطنتیں تسکین نہ دے سکیں زیر زمین دبے پڑے ہوتے ہیں۔ خاک میں وہ کلاہ و ایوان کہاں۔ اوڑھ دو گز کی زمین پر عوام کیطرح لیٹے ہوتے ہیں مگر بظاہر اپنے نام کو جو ایک مدت تک تمام عالم کو محو خیال

غالب مرحوم

ﷺ

جسنے اردوئے معلےٰ یعنے رقعات غالب کو پڑہا ہے۔ وہ شہادت دے سکتا ہے کہ انکے خطوط کی اوسط نکالی جائے تو ساٹھ فیصدی خطوط میں موت کا ذکر ہے کہیں وہ موت کی آرزو کرتے ہیں کہیں انہوں نے موت پر سرور ابد کا انحصار رکھا ہے کہیں اپنے مرے کی پیشگی تاریخ لکہی ہے غرض موت یاد ہر وقت انکے قلم کی زبان پر رہتی تھی۔

غدر ۱۸۵۷ء میں انکی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے انقلابات ہوئے اور شرفا و امرا پہانسیوں پر لٹکے اسکے اثر سے انکے ادبی جذبات ہر وقت مرگ آلود رہتے تھے۔ رقعات غالب پڑہ کر بے اختیار رونا آتا ہے کیونکہ غالب نے اپنی سادہ اور بے مثل بولتی ہوئی تحریر میں لا جواب کمال سے ان حالتوں کا نقشہ کہینچ کر دکھا دیا ہے میں اس کتاب کے ناظرین سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ رقعات غالب اکثر اوقات پڑہا کریں اگر انکے دلکو انقلاب ایام کی بہار دیکھنے کا شوق ہو اسوقت انکو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کا یہ سب سے بڑا فلسفی شاعر کس قدر موت کو یاد رکہتا تہا اور نجات آخرت کی اس کو کس قدر فکر تھی۔ اکثر خطوط میں دستخط کرتے وقت بہی لکہا ہے۔ نجات کا طالب غالب۔

وقت وفات کیحالات میں نے جناب نواب سعید الدین احمد خان صاحب طالب خلف جناب نواب ضیاء الدین احمد خانصاحب نیر دہلوی سے دریافت کئے تھے انہوں نے جو تحریری جواب بہیجا ہے وہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ دیکہو جسنے موت کو یاد رکہا وہ باوجود شرب مدام خدا کی رحمت سے بخشا گیا حسن نظامی

جناب طالب دہلوی کا مکتوب

ترحیم غالب کی نسبت

دہلی گلی قاسم جان

۱۵ اپریل ۱۷ء

مکرم فقیر

جو لوگ دنیا و مافیہا کو فانی سمجھتے ہیں جو حقیقت میں فانی ہی ہے وہ دنیا سے
تنی لبستگی نہیں پیدا کرتے کہ موت کا خیال انہیں سوہان روح ہو۔ وہ دنیا کی خواہشوں
ں اس قدر محو نہیں ہو جاتے کہ موت سے غفلت ہو جائے یہ اہل اللہ ہیں ابرار و احرار ہیں
موت سے ڈرتے نہیں اور خوب جانتے ہیں کہ آنے کے وقت یہ آکے ہی رہے گی۔ موت کا
قت انکے اطمینان کا وقت ہوتا ہے۔ وہ رضی برضا رہتے اور جان مستعار بخوشی جان آفریں
کے حوالے یہ کہتے ہوئے کر دیتے ہیں کہ۔

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

وت کا ڈر ان ہی کو زیادہ ہوتا ہے جو لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور لہو و لعب میں اپنی
مر عزیز کو گنوا دیتے ہیں۔ موت کا خیال کر کے نیکیوں کیطرف متوجہ نہیں ہوتے جب موت کا وقت
جاتا ہے تو سراسیمہ ہو جاتے ہیں کہ افسوس ہمنے توشۂ آخرت کی کچھ فکر نہ کی۔ منزل دشوار گذار
ہے کیونکر طے ہوگی۔ برائیاں سامنے آکر انہیں موت کا خوف دلاتی ہیں کہ دیکھو تم اپنے ساتھ
کو لئے جاتے ہو۔ دنیا میں رہتے سہتے۔ کھانے پینے پہننے۔ آرام و آسایش پانے کا تم
رح خیال رکھا۔ کوشش کی۔ مگر اب جہاں جاکے رہوگے وہاں کے آرام کا کوئی خیال
کیا۔ اب تمہارے ساتھ نہ تمہاری بیوی ہوگی نہ بچہ۔ نہ کوئی عزیز نہ دوست اکیلے قبر کے
نگ و تاریک حجرے میں پڑے رہوگے۔ جو لوگ دم بھر کو تم سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے تھے
ب تمہیں کبھی پوچھنے فاتحہ خوانی کے لئے بھی نہ آئیں گے افسوس تمام زندگی یوں ہی برباد
کی اور مرنے کے بعد کچھ فکر نہ ہو سکی دیکھو کیسے کیسے شاہان اولوالعزم فنا ہوگئے۔ نہ وہ رہے
انکے ایوان و محل نہ انکے مزار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ہوش بلگرامی

از رسالہ ترجمان لاہور   ایڈیٹر رسالہ ذخیرہ   حیدرآباد دکن

صرف (اللہ) زبان مبارک سے نکلتا تھا اور کبھی کبھی (اللہ موجود) اسکے سوا میں نے کوئی اور لفظ انکی زبان سے نہیں سنا۔

نامی مسلمانوں کے اقوال

موت سے متعلق

یہ کتاب کم ٹوموتا ہیں سے اس نیت سے لکھی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو آخرت کی زندگی یاد دلاؤں۔ یا موجودہ زندگانی کا انجام فنا سامنے لاؤں تاکہ وہ عقبیٰ اور موت سے غافل نہ رہیں۔ کیونکہ بعض اثراتِ مغربی نے انکو شوق زیست کا اس قدر دیوانہ و متوالہ بنا دیا ہے کہ آخرت کا خیال بھی کبھی انکے ذہن میں نہیں آتا۔

ذیل میں آخر زمانہ کے ان نامور مسلمانوں کے اقوال فنا نیہ درج کئے جاتے ہیں جو بہت ہی مشہور ہیں۔ اور جنکو نئی روشنی والوں کا پیشوا سمجھا جاتا ہے اور اسلئے عام طور سے انکی دنیا پرستی اور آخرت فراموشی کی شہرت ہے لیکن جب انکی باتوں کی کیفیت پڑھی جائیگی تو ہر نئی روشنی والے کو غیرت آئیگی کہ جنکی تقلید اور پیروی میں اسنے وقت اجل کو دل سے دور کیا تھا وہ سب کے سب خدا اور موت کو ہر وقت یاد رکھنے والے تھے اور ہم لوگوں نے خواہ مخواہ انکو منکر آخرت تصور کرکے اپنے الحاد و انکار کا بار انکے ذمہ لگایا ہے۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم

کا نام نامی کون مسلمان نہیں جانتا۔ ہر پڑھے لکھے عورت مرد کی زبان پر انکا نام ہے اور ہر تعلیم یافتہ کے دل میں انکا احترام ہے۔ انکی قومی۔ علمی۔ دینی خدمات نے ذکور و اناث دونوں کو دماغی۔ ذہنی فائدے پہنچائے ہیں۔ مگر بعض خود غرض لوگوں نے لگاتار کوششوں سے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ملحد۔ منکر آخرت۔ اور مخالف اسلام ہیں اسکے برعکس میں کھلتے ہیں

حضرت - السلام علیکم جناب غالب مرحوم کی نسبت جو کچھ وقتاً فوقتاً سنا اور دیکھا تھا
لکھ کر مفصل خط لکھا ہے اور کچھ مجھکو علم نہیں - والسلام ہاں ایک نقل مولوی اعون بہاں صاحب
مرحوم ولی تخلص جو ارشد تلامذہ غالب مرحوم سے تھے کی زبانی لکھتا ہوں - وہ مجھ سے
فرماتے تھے کہ بعد انتقال مرزا صاحب مرحوم میں پانی پت میں جناب مولانا غوث علی
شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں گیا ایک روز میرے جی میں آیا
کہ میرزا صاحب کے انجام کی بابت حضرت سے دریافت کروں سو قبل اسکے کہ میں کچھ
پوچھوں حضرت صاحب نے بوقت ملاقات میرے خدشہ باطن کو دریافت فرماکر خود بخود
حاضرین کیطرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھئی غالب مرحوم بھی اپنے فن میں یکتائے روزگار
تھا اور غالباً اللہ جل شانہ نے بخش دیا کیونکہ دم باز پسیں وہ بارگاہ جناب الٰہی میں عرض
کررہا تھا کہ اے پروردگار عالم جس کام پر تو نے مجھے مامور کیا تھا جس طرح انجام دینا مجھ سے
ہو سکا میں نے انجام کو پہنچایا اب میری مغفرت تیرے ہاتھ ہے - سو وہ ارحم الراحمین
ہے سب کی سنتا ہے اور دعا قبول کرتا ہے -

احقر العباد طالب

یادداشت شیخ

غالب مرحوم نے انتقال سے چند روز پہلے مولوی بہاء الدین صاحب مرحوم کے ہاتھ
پر توبہ کی تھی - مولوی صاحب مرحوم معروف حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کے خاندان کے اتا
تھے حکیم غلام رضا خاں صاحب مرحوم نے مولوی صاحب کو اپنے ہمراہ لاکر توبہ کرائی تھی
میں بذات خود اس وقت موجود نہ تھا مگر یہ واقعہ میں نے انکے قریب ہی سنا تھا حضرت
غالب مرحوم پر انتقال سے دو تین روز پہلے غش طاری ہوگئے تھے - اس حالت میں اکثر
میں انکی خدمت میں حاضر رہا کبھی مگس رانی کرتا کبھی اور کچھ جو تیمارداری سے متعلق ہوتا
اسی غشی کی حالت میں باجب دوا و غذا کے لئے حضرت کو بیدار و ہوشیار کیا جاتا تھا تو اکثر

وہ چلے گئے تو میں نے کہا عبدالرحمٰن بہت ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ فرمایا یہ بھی تو کہو کہ نذیر احمد جان ہار نظر آتا ہے کیونکہ یہ دنیا جب ابتدا دکھاتی ہے تو انتہا بھی یاد دلاتی ہے میں بولا پھر ہونہار جان ہار ہے اسکا ذکر بیکار ہے۔ کہا ہونہار وہی ہے جسکو جان ہاری یاد رہتی ہے

ایک روز تزکیہ نفس و صفائی باطن پر گفتگو ہونے لگی۔ بولے۔ ہم باطنی احوال کی صفائی میں ایسے لگے کہ سلطنت و دولت ظاہر پر جھاڑو پھر گئی میں نے عرض کیا نتیجہ منطق یہ نکلے گا کہ دولت و ثروت ہمکو ملیگی تو حکومت باطن پر جھاڑو پھر جائیگی سنجیدہ تبسم سے جواب دیا۔ رونا تو اسکا ہی کہ نہ خدا ملا نہ صنم کا وصال۔ اب تو دونوں حالتوں میں زوال ہے۔

آخر زمانہ میں انہوں نے چند اشغال سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مجھ سے دریافت کئے میں نے بتائے تو اس طرح جرح و تحقیق کی گویا انہیں پہلے سے معلوم تھے فرماتے تھے میں نے عاقبت کے خیال کو کبھی جی سے دور نہیں کیا یہ نہ سمجھنا اب بڑھاپے میں موت کو یاد کرتا ہوں۔

ترجمہ قرآن شریف کا تذکرہ تھا کہنے لگے خدا نے قرآن میں فرمایا ہے۔ ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمکو آخرت کے سخت عذاب سے بچائے میں نے ہدایت ربانی کی بموجب قرآن کا اردو ترجمہ کیا تاکہ آخرت کی تجارت سے نفع حاصل ہو مگر اب لوگ دنیاوی تجارت کیلئے ترجمے کرتے ہیں اور میرے ترجمہ کو اسلئے برا کہتے ہیں کہ وہ انکی تجارت کے سد راہ ہے میں نے کہا حسد بھی دنیا کا عذاب الیم ہے انکو آخرت کے عذاب سے ترجمہ کی برکت کے سبب سے نجات ملیگی اور دنیاوی تاجر دنیاوی حسد کے عذاب الیم میں مبتلا ہوگئے اسکا خیال ہی نہ کیجئے۔ بولے مسلمان کو دوسرے مسلمان کی آخرت کا بھی خیال رکھنا چاہئے آخر میں مسلمان ہوں کیونکر اسکا خیال نہ آئے

بارہا یہ ہوا ہے میں گیا ہوں اور ڈپٹی صاحب نے میرے ہاتھ پکڑ کر اور رو رو کر فرمایا ہے۔ دعا کرو دعا کرو کہ موت کی منزل آسان ہو اور اعمال کی پرسش میں خدا کامیابی دے ڈپٹی صاحب کے صاحبزادہ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے معلوم ہوا کہ انتقال کے

اور اسی شہرت سے ابتک لوگوں میں یہ بات جاری ہے۔ ہٰذا میں ڈپٹی صاحب کا ذکر
چند الفاظ میں سناتا ہوں اس سے معلوم ہو جائیگا کہ جو لوگ عداوت سے انکو منکر آخرت کہتے
تھے وہ بھی جھوٹے۔ اور جن نوجوانوں نے ڈپٹی صاحب کی تقلید کی آڑ لیکر حیات عقبیٰ سے
انکار کیا ہے وہ بھی احمق ٹھیرائے۔

ڈپٹی صاحب کی رحلت سے چند ماہ پہلے کا ذکر ہے۔ راقم الحروف انکی خدمت میں اکثر
جایا کرتا تھا۔ اور گھنٹوں بیٹھتا تھا۔ اس زمانہ میں انکی زبان پر آیات قرآنی کے سوا اور کچھ نہ تھا
اور آیات بھی فنا۔ بے ثباتی کائنات۔ اور موت و عاقبت کی نسبت پڑھتے تھے۔ اور زار و قطار
روتے تھے۔ ایکدن میں نے کہا جناب اسقدر مضطرب ہونا اور ہر وقت موت کے خیال سے
دل کو بے قرار رکھنا اصول جدید کی بموجب صحت جسمانی کو مضر ہے۔ فرمایا صحت جسمانی کس
مردود کو درکار ہے صحت روحانی اور صحت ایمانی خدا سے۔ اور وہ یاد آخرت کے بغیر ہوتی نہیں۔
ان کا تکیہ بہت میلا تھا میں نے ازراہ بے تکلفی و شوخی عرض کیا میرے ایک
دوست ہیں خدا نے انکو دولت دنیا سے مالا مال کیا ہے مگر وہ اپنی جان کو آرام نہیں پہنچاتے اور
میلے کچیلے بستر میں آرام کرتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس اشارہ کو سمجھ گئے۔ پہلے ہنسی کا تھا
مگر وہ رونے لگے۔ اور فرمایا۔ تمہارے دوست کو اگر اجلے میلے بستر کی پروا نہیں ہے تو کچھ
حرج نہیں۔ انکی قوم کا بڑا حصہ میلے بچھونوں میں مفلسی کے سبب آرام کرتا ہے۔ خیال آخرت
سے بسر کیا کرنا چاہیے۔ دیکھیے وہ کیسا ملتا ہے۔ لحد کے خاکی فرش پر سونا ہو گا یا خدا اپنے
فضل سے کوئی اچھا بچھونا دیگا۔ یہ کہکر وہ اسقدر روئے کہ میں شرمندہ اور بے خود ہو گیا
کہ ناحق میں نے ایسی بات کہی اور انکا جی دکھایا۔

مسٹر عبدالرحمٰن بی اے وکیل دہلی ایام خردسالی میں ان سے کچھ پڑھا کرتے تھے اور خلقت
نے مشہور کیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ان سے تعلق عشق رکھتے ہیں۔ ایکدن میں گیا تو مسٹر عبدالرحمٰن
پڑھ کر جا رہے تھے میں نے دیکھا ڈپٹی صاحب نے ایک خاص انداز محبت سے انکو رخصت کیا

اخبار وکیل اور مولانا حالی ایک جگہ جمع تھے میں نے کہا مولانا کا تخلص ایک درویش کا سا ہے نواب محسن الملک ہنس کر بولے آپ انکو بھی فقیر بنا لیجیے۔ مولانا نے فرمایا۔ فکر آخرت کو استقبال کا زمانہ سمجھتے ہیں۔ حال خیال کیا جاتے تو ہر شخص حالی اور فقیر بن جائے میں نے کہا۔ تو پھر نواب صاحب کو چندہ کون دے۔ فرمایا دل کہا اور بلا خواہش خود چندہ اسی وقت آنے لگا اور اتنا آئیگا کہ نواب صاحب سے لیا بھی نہ جاتے۔

اسی موقع پر دوسری صحبت میں ایک شخص نے کہا آپ کے مسدس نے قوم کو زندہ کردیا وہ بولے۔ زندہ ہو کر مرنے کو نہ ہوئے تو بات ہے۔

پانی پت میں ایکدن میں حاضر خدمت تھا حضرت قلندر صاحب کا ذکر آگیا فرمایا جنکو موت عزیز ہوتی ہو انکی زندگی بھی شان دار رہتی ہے اور مرنے کے بعد بھی وہ زندوں کی طرح ہر دل عزیز رہتے ہیں۔

ایک دن دہلی کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی کہیں جا رہے تھے میں نے کہا علالت میں اور ضعیفی میں سفر بہت دشوار ہے فرمایا ریل میں کچھ مشکل نہیں البتہ آخرت کا سفر ذرا کٹھن ہے جوانی کی طاقت میں مرنا ہو تو حسرت تو زیادہ ہوتی ہے مگر جسم کی قوت موت کو آسان کردیتی ہے بڈھا مرتا ہے تو تیمار داروں کا وبال جان ہو جاتا ہے۔

انکے صاحبزادے مولوی سجاد حسین صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ وقت آخر مولانا کی کیا حالت تھی تو انہوں نے جواب میں کہا غفلت کی حالت زیادہ تھی سوائے آہستہ آہستہ خدا کا نام لینے کے اور کوئی بات انہوں نے رحلت کے وقت نہیں کی۔

نواب محسن الملک مرحوم

علی گڈھ میں ایک جلسہ میں مہمان تھے اور لڑکوں کا دینی امتحان ہو رہا تھا۔ نواب صاحب کمرے سے باہر آئے اور دروازہ پر مجھ سے ملے میں نے کہا کہئے آج کیا ہو رہا ہے بولے

پہلے زبان بند ہوگئی تھی جبتک بولنے کی طاقت رہی ذکر خدا زبان پر رہا اور عبرت خیز
جملے فرماتے رہے۔ انکی صاحبزادی نے علاج کیلئے دریافت کیا تو کہا تمہیں اختیار ہے

مردہ بدست زندہ

شمس العلماء مولانا حالی مرحوم

انتقال سے چند سال پہلے کا ذکر ہے مولانا دہلی میں نواب محمد کرم اللہ خاں
رف ننھے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔ جو مٹیا محل میں واقع ہے میں نے عرض کیا
ہی دن درگاہ شریف کی زیارت کو چلئے اور مٹی کے محل دیکھئے۔ مٹیا محل میں کبتک رہیگا
ہاں کی حاضری میری سعادت ہے وہاں مٹی کے محل نہیں ہیں ظاہر میں بھی سنگ مرمر اور
ملائی نقرئی عمارتیں ہیں اور باطن میں بھی ایکدن میں نے کہا مولانا شبلی آپ کی تصویر
یکھکر کہتے تھے کہ جیسی تصویر مولانا حالی کی کھچی ہے اور اس سے انکی فلسفیانہ شان معلوم
وتی ہے ایسی آجتک میں نے کسی مسلمان کی نہیں دیکھی۔ فرمایا انکی عنایت ہے جو ایسا
یال کرتے ہیں مگر میں بعض قبروں کو دیکھتا ہوں تو ان سے میرے دل پر خود بخود یہ
ثر ہوتا ہے کہ یہ شخص زندگی میں فلاں مرتبہ کا ہوگا حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر جاکر
مجھے انکی زندہ تصویر محسوس ہونے لگتی ہے

ایک دن خواجہ تصدق حسین صاحب ڈسٹرکٹ جج دہلی کے مکان پر ٹھیرے
وئے تھے جو بلاقی بیگم کے کوچہ میں ہے میں نے کہا اس محلے کے سامنے سنا ہے بہت سے
محلے آباد تھے جو غدر ۱۸۵۷ء میں ڈھا دئے گئے۔ فرمایا۔ ہاں بڑی گنجان آبادی تھی پھر
دیر چپ رہ کر ایک شعر پڑھا جو مجھے یاد نہیں مگر مطلب اسکا یہ تھا کہ آدمی اپنی آبادی
پھر آخری ویرانی کو سوچتا رہے تو باہر کے انقلابات اسکو دنیا اور آخرت میں مفید ہوں
علی گڑھ میں کانفرنس تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم اور شیخ غلام محمد رحیم مالک

آجتک کسی تکلیف کی اطلاع نہیں دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے خبری میں تکلیف ہو تو اس کا حس کم ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موت تکلیف کی چیز نہیں ہے ورنہ اسکی اطلاع بندوں کو نہ ملتی۔ شملہ جا رہے تھے اور یہ میری آخری ملاقات تھی کیونکہ اسی سفر میں شملہ پر انکا انتقال ہو گیا۔

ایک گستاخ نوکر نے آکر کہا۔ سرکار میں ہمراہ نہ جاوں گا۔ مجھے گھر جانے کی اجازت دیجے۔ کہنے لگے۔ جا۔ پوچھتا کیا ہے میں بھی اپنے گھر جاتا ہوں تو بھی اپنے گھر جا۔

میں نے کہا۔ آپ کا گھر شملہ پر ہے یا قبلہ پر مسکرا کر بولے۔ قبلہ والے کی اطاعت کروں تو قبلہ ہی گھر ہے۔ یہ نوکر بڑا شریر ہے۔ روز ستاتا ہے مگر میں جب سوچتا ہوں کہ اپنے آقا کی نافرمانیاں کرتا ہوں اور وہ رزق دینے سے ہاتھ نہیں کھینچتا تو ان مجازی غلاموں کی شوخیاں ناگوار نہیں ہوتیں

میں نے کہا آپ کا آقا یہاں کچھ نہ کہے۔ آخرت میں تو اعمال کا اور نوکری کا حساب لیگا۔ یہ سنکر نواب صاحب رونے لگے اور کہا۔ ہاں بے شک سچ کہتے ہو۔ مجھے ہر خوشی کے موقع پر مرنے کا خیال ضرور آجاتا ہے اور میں خدا کے حساب سے ڈر جاتا ہوں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خوشی پر گھمنڈ اور تکبر پیدا نہیں ہوتا۔

شمس العلما خان بہادر مولانا ذکاءاللہ مرحوم

ایک دن دہلی کی پبلک لائبریری میں مولانا تشریف رکھتے تھے میں اور مسٹر شنکر لال بیرسٹر دہلی انسے باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں غدر ۵۷ء کا ذکر آگیا۔ مولانا نے کہا غدر میں اسی کمپنی باغ کے اندر میں نے ایک انگریز کی لاش دیکھی جو دھوپ میں پڑی تھی اور چربی پگھل پگھل کر زمین پر بہ رہی تھی۔ مجھے اس سے بڑی عبرت ہوئی اور موت یاد آگئی

شنکر لال نے ہنس کر کہا۔ اوہو۔ آپ کو بھی موت یاد آگئی۔ مولانا کو یہ فقرہ ناگوار

ہیں وقت دعا ہے امتحان سے ۔ سہمیں ایسا نہ ہو لڑکے رعب میں آکر الٹا سیدھا جواب دیدیں
اس وقت نواب صاحب بہت پریشان اور سراسیمہ تھے میں نے کہا جو لوگ ۔ دعا کے قائل
نہ ہوں انکو یہ بات نہ کہنی چاہیئے ۔ بگڑ کر بولے ۔ واہ تمکو ہنسی سوجھی ہے یہاں دم پر بنی ہے
میں دعا کا منکر کب ہوں یا تم بھی عوام کیطرح مجکو بے دین تصور کرتے ہو ۔

میں نے کہا خدا نہ کرے میں تو ہنستا تھا میں تو یہاں ہمکو دعا کرتا ہوں کہ خدا آپکو
آخرت کے امتحان میں بھی کامیاب کرے ۔ یہ سن کر نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے
اور رو کر مجکو لپٹ گئے ۔ اور کہتے رہے آمین آمین ۔

انتقال سے ایک مہینہ پہلے بمبئی میں مقیم تھے اور میں روزانہ ان سے ملا کرتا تھا ۔ شام
کے وقت ہوا خوری کو ساتھ جاتے تھے ۔ ایک دن چوپاٹی پر نواب زادہ نصر احمد خاں کے بنگلہ
پر گئے ۔ انسے ملکر باہر نکلے تو ان کی فقیر دوستی کا ذکر کرنے لگے ۔ میں نے کہا آج کل کی اصطلاح
میں تو یہ احمق قرار پائیں گے جو خلاف عقل باتوں کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔ کہنے لگے ۔ حاشا
وکلا ۔ میں انکو بڑا عاقل سمجھتا ہوں اور دانشمند وہی ہے جو عقبیٰ کو یاد رکھے اور اسکے لئے کچھ
سامان جمع کرتا رہے ۔

بمبئی میں ایک دن سمندر کے کنارے پہاڑی بنگلہ پر انہوں نے میرے ساتھ
مغرب کی نماز پڑھی میں نے سورہ الہٰکم التکاثر اول رکعت میں تلاوت کی اور دوسری
میں انا اعطینا ۔ نماز کے بعد کہنے لگے ۔ آپنے مقابر کو مقدم اور کثرت حیات کو موخر رکھا
مجھے اس سے بڑی تقویت ہوئی ۔ جو شخص آخرت کو مقدم رکھیگا اسکو حیات دنیا لازما
ملے گی میں نے کہا زرتم المقابر پر آپ کا عمل کم دیکھا کہنے لگے ہمت میں نکالنا ہی تو اب کم ہے
انیکس وٹن ہوٹل بمبئی میں بیٹھے تھے ۔ نواب صاحب کے سر میں کوئی زخم تھا
جراح نے اسکا کھرنڈ چھیلنا چاہا ۔ تو کہا ۔ اب میں کھرنڈ صاف کرتا ہوں ۔ بولے پوچھا کیا
سے چھیل ڈالو ۔ میں نے کہا تکلیف کی اطلاع دیتا ہے ۔ کہنے لگے خدا نے موت کے سوا

کا نام لیا۔ بولے۔ موقع ہوا تو خود حاضر ہونگا۔ میں نے کہا آپ مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ سب سے بڑی اصلاح باطن کی ہے اگر کام ایمان اور دیانت سے ہو۔ چشم پر آب ہو کر بولے یہی خوف تو ہے کہ پیرانہ سالی نے کمزور کر دیا ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور عاقبت برباد ہو۔ لوگوں کو بڑا بننے کا شوق ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ بڑائی میں بڑے بڑے خطرے ایمان کے لئے ہیں۔

ایک دن حاذق الملک صاحب کے ہاں دہلی میں ملاقات ہوئی میں نے ایک تسبیح تحفہ میں دی۔ فرمایا دعا کیجئے اسکے پڑھنے کی توفیق بھی ہو۔ میں نے کہا آپ پڑھیں یا نہ پڑھیں مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔ اسکو روز دیکھ لیا کیجئے کہ اسکا امام سب دانوں کی شیرازہ بندی کا ذمہ دار ہے۔ یہ سنکر خاموش ہو گئے اور دیر تک نہ بولے میں نے کچھ اور ذکر چھیڑا تو اسکا جواب بھی نہ دیا اتنے میں حکیم صاحب آگئے اور نواب صاحب انکے ہمراہ سوار ہو کر اور سلام کر کے چلے گئے۔ مجھے خیال ہوا نواب صاحب نے میرے کہنے کا بُرا مانا۔ دوسرے دن پھر ملا تو فرمایا آپ کی بات مرتے دم تک یاد رہیگی کل مجھ پر اس قدر اثر ہوا کہ میں اپنی موجودہ ذمہ داری سے ڈر گیا میں نے کہا مبارک ہو ڈرنے والے کی عاقبت بخیر ہے۔

نواب صاحب کے صاحبزادہ مشتاق احمد بیمار تھے۔ اور نواب صاحب ان کے ساتھ کالکا قریب درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں ٹھیرے ہوئے تھے میں مزاج پرسی کو گیا تو چلتے وقت فرمایا بچہ کی صحت حیات اور میری صحت ممات کیلئے دعا کیجئے

ایک دفعہ ریل میں ساتھ ہوا۔ نواب صاحب کے ہمراہ جانماز اور وضو کا لوٹا ضرور رہتا تھا میں نے کہا اگلے زمانہ میں مسلمان مسافر کفن بھی ساتھ رکھتے تھے۔ اب بڑوں میں صرف آپ باقی ہیں جو جانماز اور لوٹا مسواک تو کم سے کم ساتھ رکھتے ہیں۔ کہنے لگے یہ تو اللہ کا حق ہے اور کفن بندہ کا حق ہے خدا کا حق ادا ہو جائے تو بندگی کے حق کا وہ خود سامان کر دیگا۔

ایک مسلمان کی سفارش لیکر علیگڈھ میں انکے پاس جانا ہوا تو انہوں نے پہلی نہیں

ہوا اور چپ ہو گئے۔ شنکر لال چلے گئے تو مولانا نے مجھ سے فرمایا یہ لوگ آزادی کے نشہ
میں ہم بڈھوں کو سرکار انگریزی کا خوشامدی سمجھ کر ہنسی میں اڑاتے ہیں لیکن تو ایک بات
کبھی بھی موت کا یاد کرنا تو مسلمانی کی نشانی ہے میں ہر روز ایک مرتبہ مرنے کا تصور
ضرور کرتا ہوں۔ اور اس سے مجھے دنیاوی کام کاج میں بڑی مدد ملتی ہے میں نے کہا
یہ کیونکر فرمایا جسکو مرنے کا وقت خیال رہے تو وہ وقت بیکار نہیں کھوتا۔ اور جلدی جلدی
کام کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ کرنا ہو آج ہی کر لینا چاہیے کل خبر نہیں زندگی رہے یا نہ رہے

مولانا کا آخر وقت آیا تو انھوں نے دہلی کے ایک مشہور چشتی نظامی درویش
جناب میاں عبدالصمد صاحب کو بلایا اور انکے ہاتھ پر توبہ کی اور انکے بتائے ہوئے
اوراد و اشغال پڑھتے پڑھتے جان دیدی۔

نواب وقار الملک مرحوم

کی نسبت تو کچھ لکھنا عبث ہے ہر شخص انکی مذہبی مشغولیت اور عبادت گزاریوں سے آگاہ ہے۔
تاہم چند مقولے دلچسپ یاد ہیں انکا ذکر اس سلسلہ میں موزوں معلوم ہوا۔

ایک دفعہ علی گڈھ میں ان کا مہمان تھا اور تار والے بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا اس
بنگلہ پر چھپر پڑا ہوا ہے میں نے باتوں باتوں میں کہا۔ اس بنگلہ کا نام تار والا ہے۔ مگر یہاں
تار کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ آپ چونکہ خدا سے تار برقی باتیں کیا کرتے ہیں اس واسطے اسکا
نام تار والا مشہور ہوا ہوگا۔ یا چھپر کے جتنے مکان ہوتے ہیں انہیں خدا کے تار آیا کرتے ہیں

نواب صاحب نہایت متین اور خشک مزاج تھے۔ فرمانے لگے معاذ اللہ میری کیا ہستی
ہے جو خدا کے تار مجھ تک آئیں مجھے تو اپنے تار نفس کا کھٹکا لگا رہتا ہے دیکھیے یہاں کیونکر رسائی پائیگا۔

ایک دن اسی بنگلہ میں فرمانے لگے کسی کامل درویش کا پتہ بتاؤ جس سے باطن کی
اصلاح کراؤں۔ میں نے حضرت مولانا شاہ بدرالدین احمد صاحب چشتی سجادہ نشین پھلواری شریف

ڈر ہوا۔ مگر بام پر چڑھ کر تو نور ایمان کی صفائی بھی دشوار ہوتی ہے میں نے کہا جناب بھی آجکل بالا خانہ پر ہیں ہنسکر بولے۔ ملحد کے مردوں کیساتھ بالا خانہ پر چڑھے تو کچھ ڈر نہیں عرض کی۔ یہ تو صحیح نہیں۔ ملحد کا مردہ تو ازبس آلودہ تربت ہوتا ہے۔ فرمایا عشاق کی تربت قفس خاک نہیں عالم پاک ہے۔

اسی زمانہ میں میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ درگاہ کے مکان میں تھیں اور مولانا دہلی کے مکان میں۔ میت کو دفن کرتے ہی میں دہلی گیا۔ اور مولانا کو کھانا کھلانے لگا انہوں نے پوچھا کہو بیوی کیسی ہیں میں نے کہا اچھی ہیں۔ کھانا تناول کیجے۔ فراغت ہوئے تو میں نے مرنے کا ذکر کیا۔ بے اختیار آنکھیں بھر آئیں کہکر بولے بھئی کمال کیا تمہیں بیوی کا کچھ غم نہیں میری بیوی مری تھیں تو اسی دن مولانا ابوالکلام ملنے آئے اور مجھ سے سیدھی طرح بات بھی ان سے نہ ہو سکی۔

پھر فرمایا موت بھی عجب چیز ہے بعض اموات انسان پر اچھا اثر کرتی ہیں بعض برا خود اپنی موت کے خیال کا بھی یہی حال ہے۔ خوشی میں ناگوار ہوتا ہے اور رنج میں بھلا معلوم ہوتا ہے میں نے کہا اپنی کیفیت فرمایئے کہ آپ موت کی نسبت کیا تصور کرتے ہیں۔ کہنے لگے زندگی ندوہ ہے اور موت ہمارا گھر وہاں رات دن کے افکار ہیں۔ یہاں ہر وقت کی مسرت

بمبئی میں ایک دن ملا۔ شگفتہ مزاجی کی بے تکلفانہ گفتگو تھی میں نے کہا چوپاٹی کے حسن کو آپ نے کلام میں بقا۔ دے دوام دیکر برج خاموش کو شاکی بنا دیا ہے۔ فرمانے لگے کیونکر میں نے کہا۔ پارسی مرتے ہیں تو برج خاموش میں رکھ دئے جاتے ہیں عارضی زندگی کی بہار چوپاٹی پر دیکھ کر آپ نے غزلیں لکھ دیں۔

اب برج خاموش کو شکوہ ہے کہ جہاں یہ حسین دوامی عمر بسر کرنے جاتے ہیں مولانا نے ہنکا فور کچھ نہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا یہ آپکے لیئے چھوڑ دیا۔

میں بولا۔ تو حسن آخرت کے آپ قائل نہیں۔ فرمایا یہ حسن آخرت ہی کیلئے حیات متحرک کے

سے انکار کیا مجھے سو کہا جواب ناگوار گزرا۔ اور میں نے بے ساختہ کہا ڈریئے موت کا وقت قریب ہے آپ ایک بیکس مسلمان کی مدد سے انکار کرتے ہیں ایسا نہ ہو مرنے کی بیکسی میں خدا بھی آپ کی مدد سے منہ پھیر لے۔ میری درشت کلامی سے ناراض نہ ہوئے اور فرمایا آپ نے بہت خوب ارشاد کیا خدا میں مدد کرنے کی طاقت ہے وہ کبھی اپنے بیکس بندے سے منہ پھیرے گا اور مجھ میں طاقت نہیں تو کیونکر اقرار کروں

اس کے بعد انہوں نے انکار کی وجوہات کو مفصل بیان کیا۔ اور میں نے مان لیا کہ بے شک نواب صاحب کے اختیار سے وہ کام باہر تھا۔

مسٹر آرچبولڈ پرنسپل کالج لیسے نواب صاحب کی ان بن ہو رہی تھی اسلامی ملکی اخبارات نواب صاحب کی حمایت میں دھواں دھار مضامین لکھ رہے تھے اسی زمانہ میں ایک دفعہ ملاقات ہوئی میں نے کہا ان دنوں آپ کو بہت مصروفیت ہے مجھ میں نہیں آتا کہ حق پر آپ ہیں یا فریق ثانی۔ فرمانے لگے لوگوں۔ نے مخالفت سمجھ رکھی ہو حالانکہ محض اختلاف رائے ہے وہ فرد حاکم ہیں فرد محکوم۔ میرا ان کا مقابلہ کیا یہ غرض مذہبی کی کشمکش تو زندگی کا لازمہ ہے مجھے تو فکر نفس و شیطان کا رہتا ہے جو ہر وقت آخرت اور عاقبت کی بربادی پر تلے ہوئے ہیں اور ہم ان سے بے خبر ہیں۔

شمس العلما مولانا شبلی مرحوم

دہلی میں ایک دفعہ مولانا فقیر خانہ پر تشریف فرما تھے۔ بازار میں کوئی شخص گاتا جاتا تھا۔ فرمایا اسکو یہاں بلانا چاہیے۔ بلا لیا گیا۔ اس نے گایا۔

بام پر نکلا نہ کرا اے ماہ رو

چاندنی چھو جائیگی۔ میلا بدن ہو جائیگا

محظوظ ہوئے۔ گانے والا گیا۔ تو فرمانے لگے۔ چاندنی سے بدن میلا ہونے کا شاعر کو

گل و بلبل کی موت

از جناب منشی عبدالخالق صاحب خلیق دہلوی

خاص رسالہ کم ٹو سونت کیلئے

بہاروں سے بنا تھا باغ صد رشک پریخانہ — کہیں گل محو آرائش کہیں بلبل تھا دیوانہ
نسیم عیش اپنی چل رہی تھی چال مستانہ — گلوں کا بادۂ شبنم سے تھا لبریز پیمانہ
شمیم روح پرور اڑ رہی تھی مشکبو ہوکر
کنول دل کے کھلاتی تھی بہار آرزو ہوکر

گل خوش رنگ اپنی تازگی پر ناز کرتا تھا — غرور حسن سے انداز پر انداز کرتا تھا
نسیم جاں فزا ہمدم و ہمراز کرتا تھا — ترانہ ساز بن کر بلبلوں سے ساز کرتا تھا
فدا سو جان سے بلبل تھا گل کی بات کے اوپر
کبھی اس ڈال کے اوپر کبھی اس پات کے اوپر

رجھانے کیلئے معشوق کو نغمے سناتا تھا — کبھی ٹپہ کبھی ٹھمری کبھی دہرپت اڑاتا تھا
خوشی سے پھول کر پھولا نہ جامے میں سماتا تھا — وصال گل سے پروانہ کو محفل میں جلاتا تھا
کہ واصل ہونا معشوق سے ہم سے سیکھ پروانے
فراق شمع میں کب تک جلے جائیگا دیوانے

اگر عاشق بنا ہے عاشقی کی شان پیدا کر — دل پرغم میں حسرت آرزو ارمان پیدا کر
نگاہوں میں مزاج یار کی پہچان پیدا کر — اگر منزل کٹھن ہے راستہ آسان پیدا کر
در جاناں پہ سر گھسنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا
کہ جل جانے سے کوئی عاشق کامل نہیں ہوتا

غرض یوں طعنہ زن تھا عاشقوں پر بلبل گلشن — کبھی کھٹ پٹ تھی پروانے سے قمری سے کبھی ان بن

حسن کا قائل ہوں، آخرت نہ ہو اور اسکو دوام نہ ہو تو جینے اور چند روزہ بہار کی اتنی زیادہ ہوس نہ
میں نے کہا مجھے تو حسن دیکھ کر مرنیکا خیال آتا ہے اور اس سے بھی عجب لطف اٹھاتا ہوں فرمایا مجھے
آپ کی حالت پر ترس آتا ہے۔

مدراس کے سفر میں ایک دفعہ ساتھ ہوا۔ وہ سکنڈ میں تھے اور میں تھرڈ میں، مسافروں کی کثرت ہوئی
تو انہوں نے نوکروں کے درجہ میں بیٹھ جانے کی صلاح دی میں بیٹھ گیا، سکنڈ اور نوکر خانہ کی درمیانی
دیوار میں ایک کھڑکی تھی، مولانا نے کچھ مٹھائی کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر مجھکو دی میں نے ہنس کر کہا
جنت والوں پر دوزخیوں کو کچھ دینا حرام ہے۔ بولے۔ آپ تو اعراف میں ہیں گاڑی مدراس پہنچی تو
استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا میں نے مولانا کے کان میں کہا۔ کہہ دوں، مولانا تھرڈ میں سفر کرتے ہیں
اور میں سکنڈ میں۔ فرمایا کہہ دو عاقبت دونوں کی ایک ہے، یہ تو دنیا کی منزل تھی طے ہو گئی آخرت
آ گئی تو دنیا کی تھرڈ و سکنڈ کے امتیاز اٹھ گئے۔

لکھنؤ میں مولانا کا مہمان تھا۔ انکے ہاں ان دنوں ایک عرب لڑکا خدمت کرتا تھا۔
اور دروازہ پر بیٹھے رہنے کی اسکو ہدایت تھی۔ میں نے اندر جانا چاہا تو لڑکے نے روکا۔ میں نے
آواز سے کہا شبلی فقیر اسم کے دروازے پر دربان۔

ابھی میری امان۔ خود باہر آکر اندر لے گئے۔ اور معذرت کرنے لگے میں نے کہا اگر عزرائیل
آئے تو یہ دربان روک سکیگا؟ فرمایا ان ہی کے لئے تو بٹھایا ہے۔

وہ عربی بولتے ہیں۔ ہندی دربان کی بات نہ سمجھتے۔ اسکے بعد سرسید کا ذکر آگیا کہ وہ موت کی نسبت پورا
یقین رکھتے تھے یعنی موت کے بعد حیات دوامی کے قائل تھے میں نے پوچھا آپ کا موت کی
نسبت کیا خیال ہے۔ فرمایا سبحان اللہ میری کیا بساط ہے جو اس پر کچھ خیال کروں۔ تغیر عالم شاہد ہے
کہ موت آئے گی مگر میں موت کو افسوس کی چیز نہیں سمجھتا اور اسی قوم کو زندہ مانتا ہوں جو موت سے
خوف نہ کرتی ہو، اس زمانہ میں سوائے مسلمانوں کے کوئی دنیا میں بسنے والی قوم موت پر اس قدر
مطمئن نہیں ہے جتنے مسلمان ہیں اور خدا کا احسان ہے کہ میں اسی برگزیدہ قوم کا ایک دھیلا حسن شبلی

"ایلزبتھ آپ تھک گئی ہونگی"

کرمویل "جتنی جلدی ممکن ہو میرا ارادہ چلے جانے کا ہے"

لوئیس پانزدہم (اپنے تیمارداروں سے)

"تم کیوں روتے ہو کیا تمہارا یہ خیال ہے میں ہمیشہ زندہ رہوں گا"

"میرا خیال تھا کہ مرتے وقت زیادہ تکلیف ہوتی ہوگی"

لوئیس شانزدہم بادشاہ فرانس (جلاد کے سامنے)

"فرانس میں جو جرم مجھ پر لگائے گئے ہیں میں ان سے بےگناہ مرتا ہوں"

"خدا سے دعا ہے میرا خون فرانس کے ذمہ نہ ہو۔ اگر ایسا ۔۔۔۔۔"

چارلس اول "یاد رکھو"

چارلس ثانی "بیچاری نیلی کو بھوکا مت رکھنا"

جیمس پنجم والی اسکاٹ لینڈ مرتے وقت ایک لڑکی کے تولد کی خبر سنکر

"یہ تاج ایک لڑکی سے آیا تھا اور لڑکی کو ہی جائیگا"

(پیدا ہونے والی لڑکی ملکہ میری اسکاٹس کے نام سے مشہور ہوئی)

ملکہ وکٹوریا کے شوہر "مجھکو دولت مرتبہ اعلیٰ اقتدار حاصل ہوا لیکن اگر مجھ کو صرف یہی تین چیزیں نصیب ہوتیں تو میں کیسا مصیبت زدہ ہوتا"

ملکہ الزبتھ "میرے تمام مقبوضات ایک لمحہ کے لئے"

ولیم سوم "کیا یہ درد زیادہ دیر تک رہیگا"

چارلس نہم "کیا قتل، کیا خون ہے، ارے میں نے غلطی کی، خدا مجھے معاف کرے"

رچرڈ سوم "بغاوت بغاوت!!"

گیری بالڈی دو پرندوں کو اپنے کمرہ کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا دیکھ کر انہیں اپنے مرحوم بچوں کی روحیں سمجھ کر

ر اروں میں جہاں میں یوں تو کہنے کیلئے کانٹ — نہ لیلے میں یہ خوبی ہے نہ شیریں میں ہی یہ جوبن

حسیناں جہاں گل کی برابر ہو نہیں سکتے

جو عاشق ہیں وہ بلبل کی برابر ہو نہیں سکتے

ں و بلبل میں جاری تھیں ابھی اسرار کی باتیں — محبت میں مزے سے ہو رہی تھیں پیار کی باتیں

ہی تقریر موسم کی کبھی گلزار کی باتیں — گلے میں ہاتھ ڈالے یار سے تھیں یار کی باتیں

بلا آئی غضب ٹوٹا ستم ایجاد آپہنچا

ادھر گلچیں ادھر بیداد گر صیاد آپہنچا

وں کو لیگیا چن چن کے گلچیں اپنی جھولی میں — حسیں گلہا زیاں کرتے رہے پھولوں کے ہولی میں

سب عشرت کسی نے رکھہ دیا شوخی سے چولی میں — خلیق راز نے یہ شعر لکھا اپنی بولی میں

قفس میں مرگیا بلبل ہوئی پھولوں کی پامالی

گل و بلبل کی باقی رہ گئی ہے داستاں خالی

بادشاہوں و نامور لوگوں کے آخری کلمے

یعنی وہ کلمات جو دم نکلتے وقت انکی زبان سے نکلے، جنکے بعد وہ اور کچھ نہ کہہ سکے

در ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے

جان رچرڈ گرین (ایک مشہور مورخ) اپنی انگلی نبض پر رکھہ کر ڈاکٹر سے متبسمانہ لہجہ میں کہا

"نبض بند ہوگئی لو الوداع"

فیلپ (ایک مشہور ایکٹر) "الوداع تمام میری عظمت کو الوداع"

شہنشاہ رچرڈ اول (برٹرنڈ ڈی گوردان سے کہا جسکے تیر سے وہ ہلاک ہوا تھا)

"اے جوان میں تجھکو معاف کرتا ہوں"

الگزینڈر اول بادشاہ روس (اپنی ملکہ سے)

مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں!

جینا ہے تو دو گھڑی ہنس بول۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ دُنیا میں جو چند سانس لیکر آیا ہے چاہے رو دے میں کاٹ۔ چاہے ہنسی خوشی میں گزار، خدا یہ نہیں چاہتا کہ تو ایسا مرے کہ مرنیکو بھول جائے۔ نہ اُس کی یہ مرضی ہے کہ موت کو یاد کرتے کرتے جینے سے ہاتھ اُٹھالے۔ جینا بھی فرض ہے، مرنا بھی فرض ہے۔ جی تو خوش باش جی۔ مر تو خوش باش مر +

کم۔ ٹو۔ موت کے مضامین غم دیکھکر موت کو یاد کیا تو کتاب

چُٹکیاں اور گُدگُدیاں

بھی پڑھ۔ اس سے ہنسی آئے گی۔ دل کی مُردہ اور افسردہ کلی کھِل جائے گی۔ کم ٹو۔ موت بھی میں نے لکھی اور غم یاد دلایا۔ اور چٹکیاں اور گدگدیاں بھی میری ہی تحریر کردہ ہیں۔ اسمیں مذہبی ہنسی کی باتیں ہیں، تمدنی ہنسی کی باتیں ہیں۔ ادبی اور انشاپردازی کی ظرافتیں ہیں ہر مضمون کچھ یاد دلاتا ہے، چٹکیاں لیکر چوکنا کرتا ہے، پھر گدگداتا ہے اور بے اختیار ہنسی چہرہ اور دل پر لاتا ہے +

جسنے کم۔ ٹو۔ موت کو پڑھا، اور چٹکیاں گدگدیاں بھول گیا اُسنے جینا نہ جانا۔ جو چٹکیوں اور گُدگدیوں میں رہ گیا اور کم ٹو موت تک ہاتھ نہ بڑھایا۔ اُسکو مرنا نہ آیا +

اے بیخبر! جبتک جینے ہنسی دل لگی سے جی۔ میری چٹکیوں کیلیے بازو جھکا میری گدگدیوں کے واسطے بغل کھول۔ کہ میرا نام حسن نظامی ہے +

یہ بھی کر نارہ۔ اور موت کو بھی دھیان میں رکھ۔ کم ٹو موت آخرت یاد دلاتی ہے۔ اس واسطے بیش قیمت ہے ایک روپیہ ہوتی ہے چٹکیاں گدگدیاں دُنیا کی ہنسی و تفریح کے خزانے ہیں لہذا انکی قیمت فقط بارہ آنے ہیں

کارکن خواجہ ڈپو دہلی سے منگائی جائے

"محبت سے دونوں اپنے باپ کو مرتا ہوا دیکھنے آئے ہیں میرے مرنے کے بعد ان پر مہربانی کرنا اور دانہ کھلاتا"

امیر البحر نیلسن (ملاحوں سے)

"انگلستان اپنے ہر ایک فرزند سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض پورے طور سے ادا کریگا"

لوئیس ہشت وہم بادشاہ فرانس

"بادشاہ کو کھڑے ہو کر مرنا چاہئے"

شہنشاہ جارج دویم

"بوس یہ کیا ہے مجھے لڑکا معلوم ہوتا ہے موت آرہی ہے لیکن لوگ مجھے ٹھگ رہے ہیں"

ولیم سویم

"یہ تکلیف مدت تک رہے گی"

ملکہ این بولین (جس وقت انکی گردن پر قتل کرنیکے لئے کلہاڑا چلایا گیا)

"میری گردن نہایت چھوٹی ہے"

ملکہ ایلزبتھ

"اگر مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک منٹ اور مل جائے تو میں اپنی تمام دولت دیتی ہوں"

شاہ ہنری ہشتم

بڑھے جاؤ۔ بڑھے جاؤ

خاتمے کے بیان کا خاتمہ ہوا

حسن نظامی
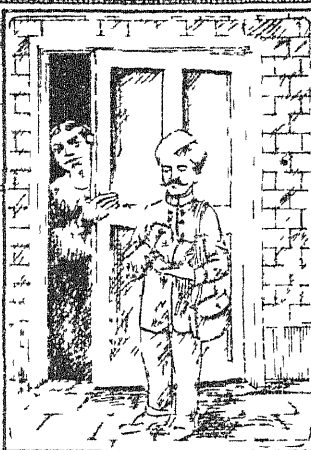
آتالیق خطوط نویسی

پہلا حصہ استانی کی عینک
اور
دوسرا حصہ نامی مسلمانوں کے خطوط

جس میں حضرت خواجہ حسن نظامی مولانا شبلی۔ مولانا ابوالکلام آزاد میرزا
غلام احمد قادیانی۔ نواب محسن الملک۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی
کے خطوط جمع کئے گئے ہیں

کارکن خواجہ ڈپو یعنی حلقۃ المشائخ دہلی نے تیسری بار
عزیزی پریس آگرہ میں بماہ اگست سنہ ۱۹۲۰ء چھپوا کر شائع کیا
صرف ٹائیٹل دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں طبع ہوا

قیمت ۱۲/ - کاغذ کی گرانی کی وجہ سے قیمت میں دو آنے کا اضافہ ہو گیا

قبروں کے غیبی نوشتے

اچھی قبر اور بری گور کے دلی نظارے اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔ ہر قبر اپنا نوشتہ اپنے اوپر رکھتی ہے۔ مگر آنکھ پڑھنے کی صلاحیت کہاں سے لائے۔ عجیب و غریب قبرستان امیروں کے مقبرے۔ اولیاء اللہ کے مزارات پیغمبر حضرات کی الواح مختلف سے گوناگوں ہیں۔ ہر مرد و زن کے سرہانے ہر نیک و بد کا اعمال نامہ لکھا ہوا ہے۔

مجھکو بھی ایسی نگاہ کی تلاش تھی جس سے کتبات مقابر کو پڑھتا۔ مگر آہ اب تک نہ ملی لاچار قوت ذہن اور طاقت خیال سے کام لیا۔ اور پہلے سرور کائنات حضور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مزار اطہر کے سرہانے ایک تصوری لوح قائم کرکے دیکھی اور اس کی عبارت ظاہر کے کاغذ پر نقل کرلی پھر سیدۃ عالم بی بی خدیجہ رض اور بی بی فاطمہ رض کے مزارات کی الواح نقل کیں پھر سیدنا حضرت علی رض۔ حضرت امام حسین رض حضرت علی اکبر رض حضرت علی اصغر رض۔ حضرت بلال رض۔ حضرت زینب رض حضرت شہر بانو رض کے کتبات قبور تحریر کیے۔ اس کے بعد ابولہب۔ ابوجہل۔ یزید۔ شمر۔ ابن زیاد کے کتبے لکھے۔ اور آخر میں اپنے استقبال پر نظر کرکے حسن نظامی کی قبر کو دیکھا تو اس کی لوح بھی دیکھ لی۔ اس سب کے مجموعہ کا نام "قبروں کے غیبی نوشتے" رکھا۔

اس کتاب کو پڑھکر کم ٹو موت کے پڑھنے کا لطف آئیگا۔ کم ٹو موت اسکی شرح ہے۔ اور یہ کتاب اگر غور کرو تو کم ٹو موت کی تفسیر ہے، دونوں کا اثر مذہبی ہے۔ تمدنی ہے۔ قومی ہے۔ ملکی ہے۔ ہر کتاب انسان کی ضروریات حیات و ممات کو مفید ہے۔ کم ٹو موت پڑھنے کا مزا جب ہی آئیگا کہ قبروں کے غیبی نوشتے بھی پاس ہوں +

میں یہ تعریف کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں کرتا، بلکہ مقصود اصلی کی خاطر۔ اور وہ یہی ہے جو مجھکو رات دن مصروف رکھتا ہے کہ اولاد آدم کو مرنا بھی آجائے اور جینا بھی سیکھ جائے۔ قیمت اسکی آٹھ آنے ۸؍ ہے +

کارکن خواجہ ڈپو دہلی سے ملے گی

۷۸۶   ھُوَالکل   یامعین

اُستانی کی عینک

یعنی پہلے حصہ تالیف خطوط نویسی

کا

دیباچہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خدا رکھے میری اکلوتی بیٹی حورباؔنو جس نے خط و کتابت کا طریقہ سیکھنے کے لیے میرے خطوط کو جمع کرنا شروع کیا۔ ایک دن اس کو بھائی مرحوم کے کاغذوں میں وہ خط مل گئے۔ جو میں نے ۱۳ برس کی عمر میں لکھے تھے۔ ان کو دیکھکر پہلے تو وہ خوب ہنسی کہ اماں جب میری عمر کے تھے تو مجھ سے بھی خراب خط لکھتے تھے۔ مگر برابر لکھتے رہنے سے آج انکی عبارت ہر ایک کو پسند آنے لگی۔ لہذا میں محنت کرتی رہونگی تو اماں سے بھی اچھا لکھنے لگونگی۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر زور ڈالا کہ خط لکھنے کی ترکیب پر کوئی رسالہ لکھدوں۔ جس سے اس کو اور اسکی عمر کی دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کو خط و کتابت کرنی آجائے۔

میں نے اسکو اردو کے کئی رسالے لاکر دئے۔ جن میں چھوٹوں کی طرف سے بڑوں کے نام۔ اور بڑوں کی جانب سے چھوٹوں کے نام خطوط نویسی کے مضمون تھے۔

حورباؔنو نے جس کی عمر ماشاء اللہ بارہ برس کی ہے اور اردو عبارت اچھی طرح

حاشیہ مارچ ۱۹۱۸ء سے حورباؔنو اکلوتی نہیں ہیں۔ اور اُن کا سوتیلا بھائی امر اللہ حسین نظامی پیدا ہوا۔ اور مارچ ۱۹۱۹ء میں دوسرا بھائی علی ہلال دنیا میں آیا۔

لیٹر بکس کے نام کھلا خط

جناب عالی! تمہاری شکل تو لال اور ڈراونی ہے۔ مگر عادت بہت اچھی اور دل پسند ہو
کیونکہ تم کسی کے بھید کو کھلنے نہیں دیتے۔ سب کے راز سینے کے اندر مخفی رکھتے ہو۔ سردی میں
لحاف کے اندر نہیں جاتے۔ اور گرم گرم فقروں کے خطوط چھاتی سے لگائے رات کی اوس میں
چُپ چاپ سے لئے کھڑے رہتے ہو۔ گرمی کی دھوپ سے بھی نہیں گھبراتے۔ برقی پنکھے اور خس کی
ٹٹی میں نہیں جاتے۔ سورج سے تپتے رہتے ہو۔ اور دل کے اندر کی آتش خطوط سے پریشان
نہیں ہوتے۔ برسات کے دھواں دھار مینہ تم پر برستے ہیں۔ مگر تم برساتی یا باران کوٹ نہیں
اوڑھتے۔ اور اپنے اندر کے کچی سیاہی سے لکھے ہوئے مکتوبات کو بھیگنے نہیں دیتے۔

میرے سرخ رخسار دلدار! تمہاری انہی پرسبق و پرمحبت رازداریوں کا خیال کرکے
میں یہ کھلا خط تمہارے نام "اتالیق خطوط نویسی" میں شائع کرتا ہوں تاکہ اسرار کائنات
سے غافل ہستیاں تم پر غور کرکے سرآہی کی حفاظت میں ایام دہر کی جفاؤں کو برداشت کرنا
سیکھیں۔ اور سمجھیں کہ اس کتاب کے اندر جو خطوط جمع کئے گئے ہیں وہ دیکھنے میں ظاہر
کی دنیاوی خط و کتابت ہو مگر حقیقت میں اسکے اندر کسی اور عالم کے اشارے ہیں کوئی انسے
خط لکھنے کا سبق سیکھتا ہو۔ کوئی اردو زبان کو دیکھتا ہو کوئی لکھنے والے پر طعن کرنے اور اسکے
عیب نکالنے کی کوشش کرتا ہو اور کسی کو اسکے اندر کی مخفی اور باطنی باتوں کی تلاش ہوتی ہو
مگر جس طرح تم ہر موسم اور ہر تکلیف میں امانت اسرار کی حفاظت کرتے ہو اور چپ چاپ سب کچھ
سہتے ہو ایسا ہی میں بھی چاہتا ہوں کہ خدا مجھکو دوسروں کا خدمتگذار بنائے اور میں انکے لئے
دنیا کی جفائیں برداشت کروں۔

حسن نظامی

اگست ۱۹۲۰ء

بچے ذرا دیکھیں۔ کہ ایک دن سب بڑے نہ بچے ہوا کرتے ہیں۔ اور ان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ مگر رات دن محنت کرنے اور اپنی عبارت کو صاف کرنے کی کوشش میں لگے رہنے سے سب کچھ آجاتا ہے۔

خیال کرو۔ کہ میرا پہلا خط جو اس کتاب کے بارہویں صفحہ پر ہے کیسا بھدّا ہے نہ اسکی املا درست ہے نہ فقروں کی نشست موزوں ہے کیا ایسا برا لکھنے والے سے یہ امید ہوسکتی تھی کہ چند برس میں وہ من بھاتی عبارت لکھنے لگیگا۔

سنو بچو! محنت اور شوق سے آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ آج اگر تمہارا خط برا ہے یا تم کو اچھا خط لکھنے کا سلیقہ نہیں ہے یا تم اپنے دل کا مطلب لکھنا چاہتے ہو مگر وہ لکھا نہیں جاتا۔ تو میرے شروع کے اور بعد کے خط دیکھ کر یقین مانو کہ کل تم کو سب کچھ آجائے گا۔

میں نے اس چھوٹی سی کتاب میں اپنے وہ خط جمع کئے ہیں۔ جو لڑکوں یا عورت کو لکھے گئے تھے اس واسطے انکی عبارت اور مضمون اتنا صاف ہے جسکو تم فر فر پڑھتے چلے جاؤ گے۔ کہیں تو تم کو نصیحت کی باتیں نظر آئینگی کہیں ہنسی کی چٹکیاں اور گدگدیاں دیکھو گے۔ اس سے تمہارا جی کتاب میں لگ جائے گا۔ اور تم خوشی خوشی اسکو پڑھو گے اور پڑھ چکو گے تو اسی طرح کے خط لکھنے کی امنگ پیدا ہوگی۔

اس کا نام میں نے اتالیق خطوط نویسی اور ہوربا نو نے چار آنکھ کی استانی رکھا ہے جن بچوں کو اردو کی ندا بھی شدہ بدھ ہے وہ اس کتاب کو جو چار دفعہ پڑھ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کو خط لکھنا آجائے گا۔

خط لکھنے کے طریقے

دیکھو! اس کا خیال رکھنا۔ کہ جب کسی کو خط لکھنے بیٹھو تو پہلے کاغذ کی پیشانی پر بسم اللہ یا اس کے عدد ۷۸۶ لکھنا۔ اس کے بعد جس مقام پر یہ خط لکھنا شروع کیا ہے۔

لکھنی پڑھتی ہے۔ یہ رسالے دیکھے اور ان کو پسند کیا مگر اس نے لکھا۔ کہ ان رسالوں میں جھوٹ موٹ کے خط ہیں۔ اور ان میں ہمارا جی نہیں لگتا تم اپنے وہ خط جو تم نے باہر کے لوگوں کو لکھے ہیں کسی کے پاس ہوں۔ تو منگوا دو۔ ان کے پڑھنے سے نئے زمانہ کی چٹ پٹی عبارت لکھنی آجائے گی۔

مجھے معلوم ہے کہ بعض احباب کے پاس میرے سینکڑوں مکتوب ہیں اُن کا جلدی فراہم کرنا آسان نہ تھا۔ اور حُور کو اس کی ازحد جلدی تھی۔

خدا کی قدرت تین مہینے ہوئے۔ دہلی کی ایک نہایت لائق خاتون محمود فاطمہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ جن کے پاس میرے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور حور بانو کو یہ معلوم تھا۔ اس نے چاہا کہ میں یہ خط مرحومہ کے والدین سے مانگ لوں۔

میں نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ کیونکہ اسمیں بیچاری مرنے والی محمود فاطمہ کے نام کی سلامتی اور یادگاری بھی ہوتی تھی۔ اس واسطے میں نے مرحومہ کے والد جناب مولوی محمد حسین صاحب تاجر کوچہ فراش خانہ دہلی سے اجازت لیکر انکی اہلیہ سے یہ خط مانگے اور انہوں نے خوشی سے انکے شائع ہونیکی اجازت کیساتھ سارا ذخیرہ خطوط کا دیدیا۔

اس کے بعد کچھ اور خطوط بھی ہاتھ آئے جو میں نے بعض احباب یا ان کے لڑکوں کو لکھے تھے یہ خط محمود فاطمہ کی خط وکتابت سے بہت پہلے کے تھے اس لیے مجموعہ کی ترتیب یوں رکھی۔ کہ سب سے پہلے اول تو وہ خط درج کئے جو میں نے بچپن میں اپنے بڑے بھائی سید حسن علی شاہ مرحوم کو لکھے تھے۔ پھر انشا پردازی کے ابتدائی خطوط شریک کئے اور اسکے بعد محمود فاطمہ کے نام کے خطوط لکھے۔ کیونکہ وہ زمانہ حال سے تعلق رکھتے تھے۔

اصل میں مقصود تو حور بانو کی تعلیم تھی۔ مگر یہ تخیل اچھی نہ معلوم ہوئی۔ کہ صرف میری لڑکی اسکو پڑھے اور قوم وملک کے بچوں تک اسکو نہ پہنچایا جائے۔ اس واسطے میں نے ان کو چھاپنے کا ارادہ کیا۔ اور اس مختصر سی تمہید کی ضرورت پیش آئی۔

[illegible]

لندن

یکم مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

میاں ہاشم! جیتے رہو۔ تم نے اپنی ماں کے خط میں اپنے ہاتھ کا جو پرچہ رکھا تھا مجھے مل گیا۔ اور مجھے اسکے دیکھنے سے بہت خوشی ہوئی۔ اسکول ناغہ نہ کرنا اور اپنی ماں کے کہنے پر چلنا۔

راقم تمہارا یاد کرنے والا
قاسم

[illegible]

دہلی ترا ہا بہرام خاں

۱۲ر مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

اباجی! اداب

پہلی مارچ کا لکھا ہوا خط ملا۔ میرا دل اسکو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ ابا میں اسکول برابر جاتا ہوں۔ اور اماں جی کے کہنے پر چلتا ہوں۔

راقم اپنے ابا کا لاڈلا
ہاشم

[illegible]

لکھنؤ قیصر باغ یکم فروری سنہ ۱۹۱۶ء

آپا جی! سلام۔ تم خط نہ لکھو۔ جی کو ترساؤ! اور الزام مجھ پہ رکھو کہ خط نہیں لکھتی مجھے اسکول سے فرصت کہاں ملتی ہو ابا حضرت گونڈہ سے ابھی نہیں آئے۔ اماں جی اچھی طرح ہیں۔ تم کو دعا کہتی ہیں۔ دولہا بھائی کو آداب کہنا۔

راقمہ تمہاری سکینہ

[illegible]

علی گڑھ بالائے قلعہ ۸ر فروری سنہ ۱۹۱۶ء

میری بہنا! شاد رہو۔ آباد رہو۔

پہلی فروری کا لکھا ہوا تمہارا خط قیصری کو مل گیا تھا۔ مگر تمہارے دولہا بھائی دورے میں تھے۔ اور ان کے خانگی کام بھی مجھ ہی کو کرنے پڑتے تھے۔ اس وجہ سے دیر ہوئی۔ ہاں بہن سچ کہتی ہو۔ مجھے خط لکھنے کی بہت کم فرصت ملتی ہے جب تم گھر بار کی

اس کا نام، ضلع اور ڈاک خانہ کے ساتھ تحریر کرنا پھر اسکے نیچے تاریخ اور سنہ درج کرنا۔ جب یہ لکھ چکو۔ تو چھوٹا سا القاب آداب لکھکر مطلب کی بات شروع کر دینا۔ یہاں خیریت اور آپ کی خیریت مطلوب لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ذرا غور سے دیکھو چند خطوط کا نمونہ تم کو بتاتا ہوں:۔

نمونہ

از بمبئی تاج محل ہوٹل

۲۷۔جنوری ۱۹۱۶ء

بیوی صاحب! سلام علیکم۔

میں خدا کے فضل سے آج دوپہر کو بمبئی پہنچ گیا۔ تاج محل ہوٹل میں ٹھیرا ہوں جہاز پرسوں روانہ ہوگا۔

اس وقت تک میری صحت اچھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم سب لوگ بھی اچھے ہوگے اور تمہارا خط حسب وعدہ مجھ کو عدن میں ملے گا۔

راقم تمہارا وفادار شوہر

قاسم

نمونہ

دہلی ترا ہا بہرام خاں

۲۹ر جنوری ۱۹۱۶ء

صاحب! وعلیکم السلام

آپ کا بمبئی والا خط مجھ کو اس وقت ملا جبکہ میں عدن کا خط تیار کر چکی تھی مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ تندرستی کے ساتھ بمبئی پہنچ گئے خدا کی مہربانی سے امید ہے کہ آپ کو اس نے جہاز میں بھی آرام سے رکھا ہوگا۔ مگر اپنے بشری دل کو کیا کروں کہ وہ طرح طرح کے وہم سامنے لاتا ہے۔ خبر نہیں سمندر کی کیا حالت ہو۔ آپ کہیں چکر تو نہیں کھا گئے۔

راقمہ تصور میں ہر وقت آپ کے ساتھ

سلیمہ

اگرچہ میرے خطوط کے پڑھنے ہی سے تم کو مہارت ہو سکتی ہے لیکن میں نے احتیاطاً یہ نمونے بھی اور بڑھا دیئے

اپنے خطوط کے آخر میں محمودہ فاطمہ صاحبہ ماہ بانو مرحومہ کے بھی چند خطوط لگا دئے ہیں۔ تاکہ تم معلوم کرو۔ کہ انہوں نے عورت ذات ہونے کے باوجود کیسی اچھی لیاقت پیدا کی تھی۔ اور کیسی بے تکان لکھتی تھیں۔

یہ بڑی عابدہ پارسا خاتون تھیں۔ قرآن شریف اور حدیث شریف کا بڑا علم رکھتی تھیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ شوہر ان کو ان کی مرضی کے موافق نہ ملا۔ یعنی جیسی یہ نیک تھیں ویسا ہی وہ جاہل اور بدچلن تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپس میں اَن بن ہوئی اور اسی صدمہ سے یہ بیچاری جل جل کر بیمار ہو گئیں۔ بیماری دق کی تھی۔ جس میں ان کا انتقال ہو گیا۔

خطوط میں ان کی تحریر بہت آزاد ہے لیکن عمل میں وہ بہت بالحاظ اور پردہ کی پابند تھیں۔ میرا ان کے والدین سے قدیمی ملنا جلنا تھا۔ مگر ساری عمر میں نے اُنکی آواز تک نہ سُنی۔ اللہ ان کو بخشے اور ان کی اس تحریری یادگار سے انکی قوم کے بچوں کو علمی فائدہ پہنچائے۔ جو انکی زندگی کا سب سے بڑا ارمان تھا۔

اور اسی کو زیادہ تر میں نے بھی ملحوظ رکھ کر یہ کتاب شائع کی ہے۔

راقم **حسن نظامی**

مقام رین بسیرا
درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
محبوب الٰہیؒ دہلی

۲۶ جنوری ۱۹۱۷ء

ہوگی۔ تو قدر جانوگی۔ کہ عورتوں کو خانہ داری کے کتنے کام کرنے پڑتے ہیں۔ بڑاں ہونے کو بہت سی آرام طلب ایسی بھی ہیں جو کچھ کام نہیں کرتیں اور پلنگ پر بیٹھی نوکروں پر حکم چلایا کرتی ہیں۔ مگر پھر ان کے گھر میں بھی ایسی ابتری ہوتی ہے۔ کہ خدا کی پناہ۔ میں سب کام خود دیکھتی ہوں۔ نوکروں پر بھروسہ نہیں کرتی۔ ابّا حضرت تشریف لائیں تو میرا آداب کہنا۔ اور امّاں بیوی کو تسلیمات۔

راقمہ تمہاری چاہنے والی
رقیہ

۲۸

اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۶ء

بھائی صاحب۔ تسلیم!

اب میرے بخار کو آرام ہے۔ دوا برابر پیتا ہوں۔ اور روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں یہ دس روپے کافی ہیں۔

راقم آپ کا خرد
نعیم اللہ

۲۹

پانی پت محلہ انصاریاں۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء

میرے بازو کی قوت سلامت رہو۔ تمہارا خط مرقومہ ۱۰ اکتوبر آج گیارہ کو وصول ہوا۔ اس سے خوشی ہوئی کہ تم کو اب آرام ہے۔ دوا کچھ دن اور پیو اور پرہیز کرتے رہو۔ بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔

شاباش یہ تمہاری بڑی لیاقت ہے کہ تم نے اور خرچ نہ منگا۔ طالب علم کو کفایت شعاری پر ہر وقت قائم رہنا چاہیئے والسلام

دعاگو سلیم اللہ

یہ فرضی خطوط کے نمونے اس وجہ سے لکھے گئے ہیں۔ کہ تم ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا ڈھنگ سیکھ جاؤ۔ اس کو سمجھ لو گے تو تم کو خط و کتابت کرنے میں آسانی ہوگی۔

ڈوبے ہوئے چاند اور ٹوٹے ہوئے ستارہ

کے نام

اس کتاب کو پیش کرتا ہوں جسکو وجودِ خاکی کو محمود فاطمہ کہتے تھے۔ اور ماہ بانو خطاب دیتے تھے۔ آج وہ قبر میں مٹی کی چادر تانے بے خبر سوتی ہیں مگر ان کی روح بیدار ہے اور اس ہدیہ کو قبول کر سکتی ہے۔

قفس ہستی کا محبوس

حسن نظامی

اس دیباچے میں خیالات سب حور بانو کے ہیں اور کچھ فقرے بھی اسکی قلم سے نکلے ہیں باقی عبارت میں نے درست کردی ہے۔ حسن نظامی

چار آنکھ کی استانی

میں بڑی بوڑھیوں سے سنتی تھی۔ کہ جو لڑکی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتی ہے۔ اس کی آنکھیں چار ہو جاتی ہیں۔ میں نے لکھنا بھی سیکھا اور پڑھنا بھی۔ مگر آنکھیں چار کیا سوا دو بھی نہیں ہوئیں۔

یہ کتاب میں نے ابا سے تقاضا کرکے چھپوائی ہے۔ انہوں نے اس کا نام اتالیق خطوط نویسی رکھا ہے۔ میں تو اس کو سہیلی نامہ کہا کرونگی یا چار آنکھ کی استانی۔

علم و ہنر کی دو آنکھیں دل میں اس کتاب کی بدولت پیدا ہو جائینگی تب تو دو چہرہ اور دو دل کی ملاکر چار آنکھیں بن جائینگی۔ اور یہ کتاب تو استانی ہے ہی۔ بس تو اس کا نام چار آنکھ کی استانی ہو بہو پورا ہو گا۔

اور میں نے تو اس کو خود ہی جمع کیا ہے۔ ابا جی نے بھی دیکھا ہے۔ اور کچھ کمی بڑھتی اس میں سے کیا ہے۔ اور میرا جی تو اس سے بہت خوش ہوا کہ خدا خدا کرکے یہ پوری تو ہوئی۔

راقمہ خاک کی پتلی۔ ذرہ سے بہت بڑی
سورج سے بہت چھوٹی
بحر و بر بانو
عرف
حور بانو بنت خواجہ حسن نظامی

۲۷ جنوری ۱۹۱۶ء

۵۴ے جناب برادر مکرم و معظم حضرت سید حسن علی شاہ صاحب زید مجدکم۔
بعد ادائے آداب کے گذارش یہ ہے۔ کہ یہاں پر خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ کی
درگاہ کریم سے نیک مطلوب ہے۔ مولوی صاحب نے قربانی کے بارہ میں فرمایا۔ کہ
تین حصے کرو۔ ایک حصہ فقیروں کو دو۔ اور دو حصے آپ رکھو۔ اور جو چاہو کرو۔ اور
کھال چاہے کسی فقیر کو دو۔ چاہے آپ رکھو۔ تب آپکے فرمانے کے بموجب میر صاحب کے
واسطے لے گیا تھا لیکن وہ قطب صاحب گئے ہوئے تھے اسلئے رحمت اللہ کے ہاتھ
چار کو بیچ دی۔ اور دام میر صاحب کو دے دیئے۔ اور کبوتر کے نیچے اڑنے لگے اور
بچے نکلے ہیں۔ زیادہ حد ادب۔

الراقم علی حسن یعنی حسن نظامی۔ المرقوم یکم محرم ۱۳۲۱ھ یوم پنجشنبہ

۵۵ے

بخدمت برادر مکرم و معظم حضرت سید حسن علی شاہ صاحب زید مجدکم
بعد ادائے آداب کے گذارش یہ ہے کہ یہاں پر خیریت ہے اور خیر و عافیت آنجناب
کی درگاہ الٰہی سے نیک مطلوب۔ عرض یہ ہے کہ جس طرح آپ فرماویں اسی طرح کیا جائے
دریا اب اتر گیا ہے۔ لیکن کم سڑک سے بہت پرے ہے۔

۵۶ے

بخدمت برادر مکرم و معظم حضرت سید حسن علی شاہ
بعد ادائے آداب کے گذارش یہ ہے کہ یہاں پر خیریت ہے اور خیر و عافیت آنجناب
کی درگاہ الٰہی سے نیک مطلوب ہے۔ عرض یہ ہے کہ خط آپکا مرقومہ ۱۰ [illegible] آج
۱۵ صفر کو وصول ہوا۔ حال معلوم ہوا۔ کل غلام حسن خاں آئے تھے۔ اور میں نے
بہت کہا۔ لیکن نہیں رہے۔ صبح کے وقت آئے تھے۔ بہت کہا کہ کھانا کھا کر
جائیے گا۔ لیکن نہ رہے۔

حسن نظامی کے عہد طفلی کا نمونہ تحریر

یہ نمونے آج سے ۴۴ برس پہلے کے ہیں۔ اس خط کی املا اور طرز خطاب کو پندرہ برس بعد کے نمونہ سے ملا کر دیکھنا چاہیے جسکی تصویر یعنی بعینہ چربہ اس کتاب میں ہے دونوں کا مقابلہ کرنے سے عجیب دلچسپ فرق معلوم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۷۸۶

مکرم و معظم جناب برادر حسن علی شاہ صاحب زاد مہربانہم
آداب آداب لکھنا کہ ذریعہ سعادت کا جانکر
معروض خدمت ہوں کہ یہاں پر ہمہ وجوہ خیریت
ہے اور خیر عافیت آنصاحب کی درگاہ الہی سے
ہمیشہ نیک مطلوب ہے نوازشنامہ حضور کا
آیا حال معلوم ہوا اسیوقت بھائی محمد صادق
صاحب نے جواب لکھا کر روانہ کیا مولوی محمد جمال
کا کوئی بار [illegible] نہیں آیا جناب ماموں صاحب علی
صاحب آج آگئے مقدمہ دائر کر دیا ابھی
پیشی نہیں ہوئی اور [illegible] محمد عمر [illegible]
کو دیتے ہیں لوں یا نہ لوں فقط الراقم [illegible]

دیکھنا! لکھنا آگیا۔ مگر پندرہ برس کے بعد

۸۶

۲۳ مئی ۱۹۰۸ء

یہ ریل کلکتہ جاتی ہے جس میں سوار ہوں۔ تم نے بے انصافی کی۔ ظلم کیا۔ جو میری بات نہ مانی کیسے نادان اور ناسمجھ آدمی ہو۔ اچھا خیر اب ہمیشہ کے لئے اپنے شوق کو خاک میں ملاتا ہوں۔ مگر دیکھو تم نے میری خاطر ایکدن سٹی میں ملنا گوارا نہ کیا۔

راقم پردیسی

۸۷ دہلی ۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء

کیوں جناب! ان ڈاک خانہ والوں کا کیا علاج جو آپ جیسے بزرگوں کے خط بھی گم کر دیتے ہیں۔ خدا کی شان ہے ان کم بخت ڈاکیوں پر کسی آنکھوں والے کی بجلی نہیں گر پڑتی۔ صاحب کیسا کارڈ اور کیسا لفافہ۔ یہاں تو جس دن سے سرکار سدھارے ہیں صفا چٹ میدان ہے۔ سمجھ لیا تھا۔ کہ یا حفیظ کا وظیفہ پڑھنا چاہئے

۸۸ دہلی ۱۸ مئی ۱۹۰۸ء

سرکشی کی حد ہو گئی۔ بڑے بھائی آئے تھے ملے اور میرے پاس ٹھیرے ان کو بھی انتظار رہا کہ آتے ہو۔ مجھ کو بھی بھروسہ رہا کہ میرے خط کی تعمیل کرو گے اور آنکے سب شکوے مٹے ہو چکے شکایتیں ختم کر دی گئیں پھر کیا معنی کہ تم نہیں آئے اور مجھ کو دو روز ریل پر حیران پریشان رکھا۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔

۸۹ دہلی ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء

صاحب یہ گرمی کا موسم۔ دھوپ۔ لو۔ کاروبار کی کثرت مگر جی چاہتا ہے کہ سب تکلیفیں دل سے محو کر کے آپ کو خط لکھوں۔

عبدالسلام کے بیٹے ساتھ تھے۔ لیکن میں ان کا نام نہیں جانتا۔ اور ایک لڑکا تھا۔ عرصہ سات آٹھ روز کا ہوا کہ محبوب خان آئے تھے۔ لیکن میں نہیں بھتا بھائی محمد صادق حسین بروز شنبہ آ گئے ہیں۔ اور برسی والد کے واسطے خرچ کی ضرورت ہوگی۔ لے آویں گا۔ جب پارسل روانہ کرونگا۔ تو اس میں خط رکھوں گا چچی اماں سے دریافت کر کر کہ کب ہوگی۔ نقلوں کے واسطے لکھا ہے بھائی محمد صادق کی تو باری ہے۔ بھائی ولدار علی جاینگے تو لے جاؤں گا۔ نہیں تو رحمت علی جو جائیگا اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ اور جوڑا نیا بنے گا۔ ایک جوڑا تو محرم میں دیا تھا اب اور دیا جائیگا تو بنا بنے گا۔ یہ لکھیے کہ نیا بنے گا یا نہیں دیا جائے گا۔

المرقوم ۱۵ر صفر یوم دوشنبہ ۱۳۱۲ھ

۲۵۴

بخدمت برادر مکرم معظم حضرت سید حسن علی شاہ صاحب زید مجدکم

بعد ادائے آداب کے گذارش یہ ہے کہ یہاں پر خیریت ہے اور خیر و عافیت آنجناب کی درگاہ الٰہی سے نیک مطلوب۔ عرض یہ ہے کہ خط آپ کا نہیں آیا نہایت فکر ہے۔ اور آج یہ ہوا کہ بہور علی آج پڑھنے گیا تھا مولوی صاحب تو تھے نہیں وہاں جا کر دنگا کیا۔ عبدالرحیم نے مارا۔ اور وہ روتا ہوا گھر گیا۔ ظفر علی نے جا کر عبدالرحیم کو خوب مارا۔ وہ روتا ہوا احمد خاں کے پاس گیا۔ احمد خاں نے ظفر علی کو خوب مارا خوب ہی پر آخر ملاپ ہو گیا۔ ماموں ضامن علی دعا کہتے ہیں۔

المرقوم ۲ر ربیع الاول ۱۳۱۲ھ

۱۵۹ے ریاست ریواں ۲۳ اگست ۱۹۰۸ء

ننگ سرے شاہ خاموش کو سلام

پورے دو کارڈ وصول ہوئے۔ بنارس سے رسالہ زمانہ ارسال کیا تھا۔ اس کی رسید بھی آئی۔ اول تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے کسی بندے کو کارڈ پر تصویر بنانے کا ہنر دیا جس کی بدولت زیارت غائب حاضر ہو گئی۔ اسکے بعد آپکا احسان مانتا ہوں یہ دوسرا کارڈ بس واہ۔ صدری کی جیب میں رکھ لیا۔ فیروزی لباس ابر کے نیچے رہنے والے آسمان کا رنگ ہے

"راقم مسافر"

۱۶۰ے دہلی ستمبر ۱۹۰۸ء

ایک مضمون "روحوں کی بارش" رسالہ زمانہ کانپور میں بھیجدیا گیا۔ دوسرا "قبر کا سہرا" کل ہی لکھ کر زبان کو دے دیا ہے۔ مگر افسوس وہاں بھی جولائی کا پرچہ تیار ہو چکا تھا۔ اب اگست میں درج ہو گا۔

ایک لفافہ جسمیں آپکے بھائی صاحب کی نظم و نثر اور آپ کا مضمون تھا پہنچا۔ مخزن میں تو اگست تک کی گنجایش نہیں۔ کیونکہ اگست کا پرچہ بھی تیار ہو چکنے کے قریب ہے۔ زمانہ کو پہلے ہی آپکا مضمون بھیج چکا تھا۔ "شہر خموشاں" اور "اداس بستی" کا عنوان دیکھکر دل پر بڑا اثر پڑا۔ کیا ہی درد انگیز مضمون تجویز کیا ہے۔ مگر تمھیں ان خیالوں میں نہ پڑنا چاہیئے۔ بہر حال اسی عنوان کا تصور باندھکر میں نے دیکھا۔ کہ تم ایک قبرستان میں کھڑے ہو۔ اور کسی قبر پہ پھولوں کا سہرا دیکھکر غمگین ہو رہے ہو۔ بس پھر کیا تھا ایک مضمون تیار ہو گیا۔[۱]

۱؎ چند ہی روز کے بعد یہ خیال اصل واقعہ بن گیا۔ کہ مکتوب الیہ اپنے نوجوان بھائی کے مرگ ناگہانی سے غمزدہ ہوئے اور قبرستان میں ایک سہرا لیکر قبر برادر پر گئے۔ اور شادی کی یادگار میں وہ سہرا چڑھایا۔

دوسری شب سنا ہے۔ کہ دہلی میں اور بسر ہوئی۔ کاش میں جان سکتا کہ آپ قیام کرینگے۔ تو درگاہ کے مکان پر نہ آتا۔ افسوس ہوا۔ کہ آپ کو میری عدم موجودگی میں بے آرامی پیش آئی۔

دیکھئے یہ بے خبری ٹھیک نہیں: آپ کیوں بھائی کی طرف سے ایسے بے پرواہ ہیں کہ اب تک یہ بھی نہ معلوم کیا۔ کہ وہ کہاں ہیں پنجاب۔ گرمی کی طپش۔ اور وبائی امراض میں مشہور ہے۔ خدا بچائے آجکل کے سفر سے۔ ہوسکے تو اس ناوان ناتجربہ کار کو بلا لو۔

نمونہ تحریر خاص و دستخط حسن نظامی

بادل کڑکتا ہے ابر آتا ہے مگر مینہ نہیں برستا ہے بجلی چمکتی ہے مگر بے سود جن قطروں سے پیاسی زمین سیراب ہوتی وہ گھٹا کی چادر سے نیچے نہیں گرتے۔ چاندنی کی رونق دار راتیں آگئیں۔ آجکل آگرہ کے تاج محل میں بہار ہوگی۔ سفید موتی سا مقبرہ چاندنی میں دمکتا ہوگا اور گوری رنگت کے تماشائیوں کو یاد کرتا ہوگا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو آگرہ کی سیر تاج کی سیر اور جمنا کی لہر بہر دیکھنے کا ارادہ رکھتے تھے آئیں اور قدرت خدا کا جلوہ دیکھیں۔

یہ چاند۔ یہ موسم۔ یہ زمین یہ آسمان یہ تمام ساز و سامان صرف اسلئے پیدا ہورہے کہ لوگ دیکھیں اور عرفان الہی کی منزلیں طے کریں تاکہ انکا ریکارڈ یادگاری ہے۔

[illegible]

پیارے — درگاہ شریف — ۱۸۔ نومبر ۱۹۰۸ء

کئی دن کے بعد آج گھر آیا ہوں۔ خطوں کا انبار سامنے ہے۔ وہ دو سطروں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ لیجئے آپ کا بیسنی خط بھی آگیا جس کا دلی میں انتظار تھا بیسنی اس لیئے ہے۔ کہ خوشی اور خفگی دونوں آٹے ملے ہوئے ہیں۔

اچھا صاحب آجکل جو چنے کی روٹی بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ تم بیمار ہو تو میں بھی تندرست نہیں۔ گو ظاہر میں کچھ مرض نہیں۔ مگر ہر موسم کے شروع میں حالت بگڑتی ہے میں نہیں جانتا کہ وہ اب کیسے ہیں۔ کیونکہ عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی میں ہر حال میں آپکے اور ان کے لیئے اچھی دعا کرتا ہوں۔ دشمنی بھی ہو تو نیک دعا سے پہلو تہی نہ کرنا چاہیئے وہ مسلمان ہی کیا جو ایسا کرے۔ خدا تمہارے اور ان کے بخار کو کھوئے دل کا بخار تو یوں نہیں نکلے گا۔ خیر جسم کا بخار تو جائے۔

پیارے — ۲۷ دسمبر ۱۹۰۸ء

آج بہت راہ دیکھنے اور غصہ آجانے کے بعد آپ کا خط آیا۔ اُفوہ بیگ کا افسوس بھائی تولیہ گیا بلا سے۔ مگر وہ چیزیں گم نہ ہوتیں۔ مجھ غریب کا قدم اس جگہ بھی نحس ثابت ہوا تولیہ کا لفظ سیلینے کا ہو کر چھوڑتا ہے۔ دیکھو کتنی چیزیں غارت ہوئیں۔ خیر صبر کیجئے۔ ارے کیوں رے شریر! تو اب تک باز نہیں آیا خبردار یہ لفظ زبان پر نہ آئے میں تیرا خیر خواہ ہوں۔ بدخواہ نہیں ہوں۔ آنکھوں دیکھتے بلا میں پھنسا دوں یہ مجھ سے امید نہ رکھو۔

پیارے — ۲۴ محرم ۱۳۲۶ھ

پیارے! یہ پہلا موقع ہے کہ میں تم کو پیارا لکھتا ہوں۔ آج میں تم کو وہ باتیں لکھنی چاہتا ہوں۔ جو شاید تم کو ناگوار ہونگی۔ اور تم خفا ہو جاؤ گے۔ لہذا پیار سے۔ محبت سے اور چمکار کر یہ خط لکھتا ہوں۔

۷۸۶ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۸ء

بابا۔ سلام علیکم طبتم۔ مرادآباد سے لکھا ہوا مراسلہ پہنچا۔ آپ اس زمانہ میں بھی نامہ نویسی نہیں چھوڑ سکے جبکہ سارے زمانے نے مجھ کو چھوڑ دیا ہو اور میں نے اسکو ترک کر دیا یہ آپ کا ایسا احسان ہو جس کی زیر باری ہمیشہ قائم رہے گی۔

آپ محبت کے حروف سے کبھی میرے لوح دل کو بے نقش نہ دیکھیں گے جس طرح میں نے آپ کو سراپا نوازش و عنایت پایا آپ مجکو بھی دلی نیاز مند پائیں گے۔

صاحب یہ ملک تو بخارستان بن گیا ہو۔ حیران ہیں۔ کہ اسکو چھوڑ کر کہاں جائیں۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ میں بچارا تو جلاوطن ہوں اسلیئے بخار سے محفوظ ہوں۔ جو لوگ اس ملک میں واقعی رہتے ہیں انکے بخار و نکی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ آپ تعجب کرینگے کہ میں جلاوطن کیونکر ہوں یہ تو علانیہ بات ہو۔ تعجب نہ کیجئے "رہنا" جس کو زندگی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دل بستگی سے مراد ہے۔ میں نے اس ملک سے دل اٹھالیا تو سمجھہ لیجئے کہ گویا میں یہاں نہیں ہوں۔ مگر جیسا آفتاب کے سامنے شمع کی روشنی چھپ جاتی ہو۔ سوزش نہیں جاتی۔ دن کے وقت دیکھئے شمع کی روشنی بے نور ہوگی لیکن ذرا اسکی لو کو ہاتھ لگائیے۔ تو آبلہ ڈال دے گی۔ یہی عالم ان لوگوں کا ہے۔ جو دنیا کو روشن کرنے آئے ہیں۔ مگر نور آفتاب سے ماند ہو کر تاریکی شب کے منتظر ہیں۔ یہ خط نیند میں لکھا ہے۔

آپنے سنا رمضان اور عید میں صرف ایک دولائی کا پردہ رہ گیا ہو غور سے دیکھئے تو عید کا چہرہ جھلکتا نظر آتا ہو۔ میں نے تو سوچا ہے کہ اس دلائی میں اور روئی ٹھونسوا دوں شاید یہ روزن بند ہو جائیں۔ اور ابھی عید کا چہرہ نظر نہ آئے۔

ہاں یہ تو بتائیے آپ کا مزاج کیسا ہو۔ اگلے زمانہ میں پہلے یوں لکھا جاتا تھا کہ یہاں خیریت ہے اور آپکی خیریت مطلوب۔ اور میں آخر میں مزاج پرسی کرتا ہوں۔

بالفعل دو کام شروع کرو (۱) وقت کی پابندی یعنی صبح کے وقت ہوا خوری کرو کھانا کھاؤ۔ اور جو محلہ میں نیک اور بزرگ آدمی ہوں ان کے پاس جاؤ اردو کتابیں پڑھو لائبریری میں اخبارات دیکھو۔ شام کے وقت انگریزی سبق لو وغیرہ وغیرہ۔
(۲) آہستہ آہستہ بدکار آدمیوں سے صاحب سلامت کم کرو۔ اور پھر بالکل چھوڑ دو۔ گھر کے کام کاج کو دیکھو۔ اور ایک نیک شریف لڑکے بن جاؤ۔
اگر تم نے میری کڑوی کسیلی باتیں دوا کے گھونٹ کی طرح پی لیں تو چاروں ہیں۔ نانی کا مرض جاتا رہے گا۔ اور [illegible]

لدھیانہ　　درگاہ شریف　　۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء

پیارے اب تو ماشاء اللہ آپ خود تسکین بخش خط لکھنے لگے ہیں۔ کل صبح بڑی مزے دار نماز پڑھ کر آپ کے اور اپنے لیے دعا مانگ رہا تھا۔ کہ مقبول نے ڈاک بھجوائی۔ خطوط و اخبارات کے انبار کی چوٹی پر آپ کے دو لفافے نظر آئے۔ اٹھا لیے۔ بڑی دلداری سے یہ خط لکھے ہیں۔ خدا اس کے لکھنے والے کو بہت ہی دیر تک زندہ رکھے۔ آمین۔

ایک ایک لفظ اس خط کا بڑی بڑی تفسیریں لکھنے کے قابل ہے۔ میں نے شرحیں اور حاشیے لکھ کر دل کی بستی میں رہنے والے مولویوں کو بانٹ دیئے ہیں کبھی اس ویران آبادی میں گذر ہو۔ تو دیکھ لینا تجلیوں کے مالک دل و جان سے زیادہ پیارے۔ اس مہمان کی خاطر کرو۔ جو تمہارے خانۂ دل میں جلوہ افروز ہے اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہوگی۔ کہ ذات الٰہی کا خاص ظہور ایک خاکی انسان میں ہو۔ تم مٹی کا پتلا ہو۔ تم نقش خاک ہو۔ تم ایک وجود بے وجود ہو۔ مگر نور مٹی کے نشان میں چمک رہا ہے۔ اس نے تمہارے نشان اس قابل کر دیئے ہیں کہ آنکھوں والے تمہارے آگے سر کو جھکاتے ہیں اور جب تک جھکاتے رہیں گے۔

لڑکے! میری نصیحت غور سے پڑھ - اور اکیلے میں سوچ کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں - وہ سچ ہے - یا جھوٹ ،

زندگی کے یہ دن چند روزہ ہیں - اس وقت کو غنیمت سمجھ کر کوئی بات ایسی حاصل کرو - کہ بُرے وقت میں کام آئے - آوارہ اور بے کار رہنے کا زمانہ نہیں ہے - کچھ پڑھ - کوئی ہنر سیکھ - اور ان لوگوں سے ملنا ترک کر جو بدنام ہیں - اور تیرے خاندان کو جنکی ملاقات سے بٹہ لگتا ہے - تیرا خاندان بڑا شریف خاندان ہے - عزت دار خاندان ہے - ذی علم خاندان ہو - لیاقت اس میں ہے کہ باپ دادا کا نام روشن کرو - کوئی ایسی خوبی اور علمیت حاصل کرو - کہ مفتیوں کا نام دوبارہ زندہ ہو جائے -

مگر میری جان افسوس کہ تم ایسا نہیں کرتے - مجھے سخت صدمہ ہوا جب میں نے شہر میں تمہارے دشمنوں کو کہتے سُنا - کہ تم اور وہ خراب آدمیوں سے ملتے اور بدنام صحبت میں جاتے ہو - اگرچہ میرا یقین ہے - کہ وہ باتیں فقط دشمنی کے سبب بیان کی گئیں لیکن تم کو اسپر بھی احتیاط کرنی مناسب ہو - اور آوارہ لوگوں سے میل جول ترک کرنا ضروری ہے -

اس زمانہ میں نقصان نہ پرانی تعلیم سے ہے - نہ نئی روشنی سے ہے - نہ اس کی جہل بہل سے - بلکہ بے کار کاہل وجود فضول خرچ آدمیوں کی صحبت سے نوجوان بگڑتے ہیں -

اگر انسان اچھے اور کام کے آدمیوں کے پاس بیٹھے اور کُچھ پیسے کمانے کی تدبیر کرے تو اسکے فیشن سے ڈر نہیں - چار پیسے خرچ کرنے میں بھی مضائقہ نہیں کیونکہ چار پیسے تو اسکی جیب میں باقی رہینگے -

یہ نہیں کہ کمائی تو ایک کوڑی کی نہ ہو - اور خرچ چار پیسے کا -

باپ حسینؑ کو کربلا میں ذبح کر ڈالا تھا۔ سارا عالم ان کے غم میں رو رہا ہے۔

میں صبح غمگین بیدار ہوا تھا۔ اور عاشورہ کے اعمال میں مصروف ہونا چاہتا تھا کہ آپ کا قاصد خط لے کر آیا۔ پہلا کام یہ کیا۔ کہ گریبان نامہ کو بھی چاک کر کے ماتمی بنایا۔ بار بار پڑھا۔ اور ایام غم میں مسرور ہوا۔

کل دہلی میں تھا۔ اور اختر بابا کو خط لکھ رہا تھا۔ آج مکان پر ہوں اور تم کو غم نامہ بھیج رہا ہوں۔ زخمی اختر کی خیر۔ کس کا علاج ہے۔

کیوں جناب وہ وعدہ یاد ہے کہ اب شہر جا کر پڑھنا شروع ہوگا۔ کیا پھر غفلت طاری ہو گئی۔ خیر جاہل رہو یا اجہل اب ہم کچھ نہ کہیں گے۔

۱۹۰۷ء　　　　درگاہ شریف　　　　۹ رمضان ۱۳۲۵ھ

اختر بھائی۔ کارڈ پہنچا۔ اور ایک تار بھی آیا۔ تقدیر آجکل گردش میں ہے۔ سب تعلقات ٹوٹتے جاتے ہیں۔ اہلیہ کے مرنے سے ننھے سے بچے حسن بصری اور اسکی بہن حور بانو کی پرورش کا بوجھ سر پر آگیا۔ حیران ہوں کیا کروں۔

۱۹۰۷ء

ارے کیوں رے بے خبر۔ اب تو ستاتا ہے۔ اور ہمارے خط کا جواب نہیں دیتا۔ اگر ایسی حرکتیں ہونگی تو سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہیں ہم بھی بے خبر ہو جائینگے۔ یہ کیسے غضب کی بات ہے کہ ہم روز خط لکھیں۔ اور جواب ایک کا نہ آئے۔ شیخ پورہ کے عرس میں اگر جانا منظور نہیں۔ تو صاف صاف لکھو تاکہ ہم کو اطمینان ہو جائے۔ ہم سے یہ امید نہ رکھو کہ اب دوبارہ خط لکھیں گے۔

راقم سلام رخصت

کہ مہمان آپ کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دنیا کا قاعدہ یہ ہے
کہ خالی مکان کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر مکان کی وہ قدر نہیں رہتی جو مہمان
کے وقت میں تھی مگر صوفی لوگ اس مکان کو ہمیشہ عزت سے دیکھتے ہیں جس میں ایکبار
جلوہ راز پر تو افگن رہا ہو۔ پس اگر پیارے مجھ کو صوفیوں کا نیاز مند اور صوفی منش
سمجھتے ہو۔ تو یقین رکھو۔ کہ میری محبت و عقیدت میں تا قیام زندگی حال فرق نہیں
آئے گا۔ حال کی زندگی کی قید اس لئے لگائی۔ کہ میرے مرنے کے بعد دوبارہ اس
دنیا میں آنے کا عقیدہ رکھتا ہوں۔ اور یقیناً جب میں مر جاؤں گا۔ اور موجودہ جسم
کو چھوڑ دوں گا۔ تو خدا تعالیٰ کی جانب سے مجھ کو دوسرا جسم عطا ہوگا۔ مگر اس جسم میں
چونکہ حالات و تعلقات کی عظیم الشان تبدیلی ہو جاتی ہے۔ نہیں معلوم یہ محبت کا
جذبہ باقی رہے یا بدل جائے۔

اس عقیدہ کو ہندوؤں کے آواگون سے تعلق نہیں۔ نہ میں ان کے آواگون
(تناسخ) کو درست مانتا ہوں۔ میرا خیال ان سے جداگانہ ہے اور اس کے واسطے
میرے پاس قرآن شریف کے ثبوت موجود ہیں۔ میرا تعلق اس زندگی میں ابدی
ہے بلکہ ممکن ہے (بشرطیکہ آپ کسی لائق بن گئے) کہ آئندہ جنم میں بھی آپ کا میرا تعلق
اس سے زیادہ ہو جائے۔ یا میرے بعد آپ کو وہ ورثہ ملے۔ جو اس جنم میں میں نے
حاصل کرنا شروع کیا ہے۔ اور جس کو انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہندوستان میں لاثانی
شان سے چھوڑ کر دنیا سے سفر کروں گا۔ اگر وہ ورثہ آپ کو ملا تو تمام دنیا کی دولتوں
سے زیادہ قیمتی چیز ہوگی۔ احباب میں رخصت۔

راقم طالب دیدار قایل وار

۱۰ محرم ۱۳۲۷ھ درگاہ شریف لاہیہ

بابا۔ آج کا دن۔ بس بالکل سراپا غم۔ دشمن نے ہمارے تمہارے بوڑھے

وہ خود میرے ہمراہ یہاں آنا چاہتے تھے۔ مگر تصویر کو بھیج دیا۔ خود نہ آئے۔ بار بار تصویر دیکھتا ہوں اور بے چین ہوتا ہوں۔

۱۵۵ے درگاہ شریف ۲۷ر مئی سنہ ۱۹۰۹ء

میری جان۔ اللہ کی امان! خط پہنچا۔ اس سے پہلے بھی لفافہ آیا تھا جس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ اس خط نے جی ہلا دیا۔ الٰہی پیارے کی خیر۔ یہ دن امتحان کے ہیں صبر کرو۔ اور دل پر غم نہ آنے دو۔ بڑے بڑے خواب دیکھتا تھا۔ آخر ظہور دیکھ لیا۔

۱۵۶ے میرٹھ ۲ر جون سنہ ۱۹۰۹ء

اجی حضرت آخر آپ نہ مانے اور لال کرتی میں کالا کرتا پہنا کل کا سارا دن گزرا ایک خط نہ لکھا جو تسلی ہوتی۔

۱۵۷ے دہلی ۸ر جون سنہ ۱۹۰۹ء

میاں! لفافہ دار خط پہنچا۔ خدا تم کو صحت دے۔ تمہاری روز روز کی بیماری سے فکر ہے۔ علاج کرو۔ اور روز دوا پی لیا کرو۔

اوفوہ واحدی بیمار اور خوب بیمار بغل کے دنبل نے ۳ رات بیقرار رکھا کل شگاف دلوایا ہے۔ چلنا پھرنا دشوار ہے۔ بیمار پرسی کر دی ہے۔ وہ بہت بہت احسان مانتے ہیں اور سلام کہتے ہیں۔ اپنے قاصد کو سلام کہیئے۔ بہت ہی نیک اور ملنسار ہیں۔ ہندی ضرور سیکھو۔ دیکھو یہ وقت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ آدمی بن جاؤ کہنا مانو۔

اب وہاں آؤں تو یہ سنوں کہ تم نے سچ مچ ہندی شروع کر دی ہے۔

۱۵۲ — میرٹھ دفتر توحید — جنوری سنہ ۱۹۰۹ء

سنتے ہیں اب دہلی کا پایہ تخت میرٹھ میں آگیا۔ اگر یہ سچ ہے۔ تو آپ کو اسکا تماشا دیکھنا چاہیئے ٹکٹ موجود ہیں شام کے چھ بجے ڈراپ گرجائے گا۔

اشتہار کے دیکھتے ہی شوقین لوگوں کو لال کرتی کی طرف قدم اٹھانا چاہیئے۔

منیجر کمپنی دہلی پایہ تخت

---

۱۵۳ — دہلی فروری سنہ ۱۹۰۹ء

بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی خیریت ملتی رہے۔ مگر مدتوں کے بعد ایک کارڈ آتا ہے شکایت سے لبریز۔ آخر اس کا سبب ؟

---

۱۵۴ — ریاست ریوان — ۲۳ مئی سنہ ۱۹۰۹ء

غمگین پیارے! افسر بابا کی جدائی کا غم تو تھا ہی آپ کی بے کلی و بیقراری نے اور تکلیف میں ڈال دیا۔ میری جان اس دنیا کا یہی دستور ہے۔ صبر کرو اور والدین کو تسلی و تسکین دو۔

آپ کا خط ملا۔ ایک ایک لفظ میں غم کا دریا بھرا ہوا تھا پیارے افسر کی یاد کو تازہ کر دیا۔ خدا کے واسطے میرے کمزور دل کو مطمئن کرو۔ اور ماتم چھوڑ دو۔

میاں! کچھ یاد ہے۔ رسالہ زبان میں قبر کا سہرا لکھا تھا۔ ذرا اس کو پڑھو۔ اور سوچو کہ الفاظ کس واقعہ کی خبر دے رہے ہیں۔ پیارے یوں ہی اشارے پورے ہوا کرتے ہیں نہ مجھ کو خبر تھی۔ نہ تم کو کہ قبر کا سہرا سچ مچ پورا نظر آئے گا۔

اختر کو سلام۔ مگر افسر بابا کو سلام کیونکر لکھوں۔ کیا تم اس خاکی چھپر کھٹ میں سونے والے کو جگا کر یہ پیام پہنچا دو گے۔ افسر کی آخری تصویر میرے پاس ہے

پھر تین برس کے بعد

بنام محمود فاطمہ صاحبہ بانو مرحومہ - ساکن لال دروازہ دہلی

۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء میرٹھ دفتر توحید

محمود فاطمہ صاحبہ! سلام علیکم - درگاہ میں آپ کا عالمانہ فاضلانہ مدبرانہ تسلی نامہ پہنچا تھا - مگر میں وہاں اپنے آپے میں نہ تھا - دو راتیں ایسے مزے سے آنکھوں میں گزریں - کہ اب تک دماغ قابو میں نہیں آیا -

دہلی میں آیا - تو مہمانوں نے مصروف رکھا - چاہتا تھا کہ لال دروازہ پر آؤں مگر ریل کے کالے دروازہ کی کشش غالب آئی -

تم نے ناحق فکر کیا - زندگی اسی کا نام ہے جو درپیش ہے جیتے ہیں تو ہارنا اور جیتنا لازمی ہے -

ذرا اپنے خط کی درستی کا خیال کرو - میری طرح نہ رہو - جس کا لکھا کاتب تک مشکل سے پڑھتے ہیں - جیسا تمہارا مضمون دلفریب اور نفیس ہوتا ہے - خط بھی ایسا ہی ہونا چاہیے -

اپنے مضامین کی ایک کاپی بھیجتا ہوں - فرصت میں جی چاہے تو دیکھنا کہ اس میں کیا لکھا ہے -

میں ایک سکون و سکوت کی زندگی چاہتا ہوں - ڈھونڈتا ہوں - مگر نہیں ملتی - کیا تم بتا سکتی ہو - کہ اس دور مضطرب میں خاموشی کہاں بکتی ہے -

ہر ایک آدمی ایک کام کے لیے دنیا میں آیا ہے - مگر اس سے منکر ہوں - مجھے کام کرنے سے ضد ہے - پھر خلقت مجھ کو کیوں گھیرتی ہے اور کام مانگتی ہے -

فاطمہ! حاکم و محکوم کی کش کش - قاتل و مقتول کی کش کش - جاہل و مجہول کی

(۱۵۵)　　　　دہلی　　　　۱۴ر جون ۱۹۱۰ء

واحدی صاحب کا زخم ہرا ہے۔ مرہم پاشی ہو رہی ہے۔ لکھ نہیں سکتے۔
مزاج پرسی کردی ہے۔ یہ معلوم کرکے کہ تم تعمیل احکام کو تیار ہو خوشی ہوئی۔

---

(۱۵۶)　　　　دہلی　　　　۱۵ر جولائی ۱۹۱۰ء

میرے دہقان! سلام　　اب خدا کے فضل سے زخم بھر چلا ہے۔ پرسوں علی گڈھ جانا چاہتا ہوں وہاں تمہارے پاس آؤں گا۔ اور دہقان کے گوشہ کلاہ کو دیکھوں گا۔

---

(۱۵۷)　　　　دہلی　　　　۷ر رمضان ۱۳۳۱ھ

میاں! تم اب بھی وہی ہو جو جب تھے۔ میں نے وعدہ کے ایفا میں دانستہ دریغ نہیں کیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ رمضان نے مضمحل کر رکھا ہے۔ اور کچھ اس کا ملال کہ تم نے پھر وہی عادات اختیار کرلیں۔

ایسی حالت میں ناممکن ہے کہ میں ذرا بھی ہمدردی تم سے کروں۔ باجہ تم پر سے قربان ہے۔ ابھی حاضر کیا جاتا۔ مگر میں جب خیال کرتا ہوں کہ وہاں بجایا جائے گا۔ جو تمہاری پریشانی اور بدنامی کا باعث ہے تو میرا دل دینے سے انکار کرتا ہے اس واسطے مجبور ہوں۔

یہ تمہاری زیادتی ہے۔ کہ مجھ کو تو گزری ہوئی باتیں یاد دلاتے ہو۔ اور خود غور نہیں کرتے۔ کہ تم بھی میرا کہنا مانتے تھے۔ اب کیا ہوا کہ جھوٹ موٹ وعدہ کرکے گئے تو پھر صورت تک نہیں دکھائی۔ میں تمہارا بدخواہ نہ تھا۔ نہ اب ہوں۔

ایسے خط لکھنے کی نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو بار بار لکھنا پسند کرتا ہوں۔ مگر آج کل کام کچھ نہیں ہے۔ اسلئے خواہ مخواہ تم کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہے کہ اس مشق خط و کتابت میں تم کو بھی اپنی انشا پردازی کے بڑھانے کا موقع ملے گا۔ گو میں جہاں تھا وہیں رہوں گا۔ کیونکہ بڈھے طوطے نہیں پڑھا کرتے۔

کل جو کتابیں بھیجی تھیں۔ ان میں غلطی سے دو کتابیں نہ جا سکیں آج ان کو روانہ کرایا ہے۔ رات کو کچھ دیر تک گراموفون باجا سنا تھا جس کی سزا میں صبح آنکھ دیر میں کھلی۔ سورج جھلک رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ قلب پر گرمی ہے۔ نوکروں سے چھت پر پانی کا چھڑکاؤ کرایا۔ اور اسپر پا برہنہ آدھ گھنٹہ چہل قدمی کی۔ حرارت دور ہوئی اور جی بشاش ہو گیا۔ اور کھانا اچھی طرح کھایا گیا۔

صبح کا کھانا آٹھ بجے کھاتا ہوں اور شام کا چار بجے عصر کے وقت، کھانا کھا اپنے معمولات پورے کئے۔ کیونکہ خدا آج کل کھانے کے بعد یاد آتا ہے۔ مگر فاطمہ یہ بھی غنیمت ہے۔ ڈاک میں بڑے درد انگیز خط آتے ہیں۔ افوہ خلقت اخبار توحید کی کس قدر شیدا تھی ان لوگوں نے شاید کچھ حد سے زیادہ محبت کا بوجھ اپنے سر پر لے لیا ہے ورنہ اخبار توحید میں دوسرے اخباروں سے زیادہ بات نہ تھی[1]۔

میرٹھ   دفتر اخبار توحید   ۲۹ ر ستمبر ۱۹۱۳ء   ۷ بجے

محمود فاطمہ صاحبہ! السلام علیکم۔ صبح ایک کارڈ مختصر بھیجا تھا اس لئے کہ آج بھی باوجود انتظار تمہارا خط صبح کی ڈاک میں نہ تھا۔ شام کی ڈاک میں ملامام کی

---

[1] اخبار توحید صرف پانچ مہینے جاری رہا مگر اس سے لوگوں کو اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ اب بھی کہ چار سال اسکی بندش کو گزر گئے بعض لوگ اسکا ذکر کر کے رونے لگتے ہیں یہ بات کسی اخبار کو نصیب نہیں ہوئی ۔۔

کش مکش۔ اس مقام سے پست ہے۔ جہاں زلفوں والے فقیر کا دھیان ہے
لوگ ناحق اسیری دو گھڑی کے دام بچھاتے ہیں۔

میں نے بائسکوپ کمپنی میں عجب رنگا رنگی دیکھی۔ جب تماشہ ختم ہوا۔ تو
سفید چادر پر ایک چھپکلی پھر رہی تھی۔ بڑی ہنسی آئی۔ اس جانور کو کیا خبر ہوگی
کہ جس چادر پر غلطت کو متحرک تصویریں نظر آتی ہیں۔ میں اسی پر ہوں۔

میں نے اس چھپکلی کو اپنے خیالات عمیق کا رہبر بنایا۔ اور ساری رات
جاگتا رہا۔ آج صبح سے نیند کا ہجوم ہے۔ آنکھیں خمار میں جھکی پڑتی ہیں لیکن خیال
دل سے نہیں جاتا۔

ہم تو یہ جانتے ہیں۔ کہ دنیا بھول میں ہے ناحق کائنات کے اضطراب سے
گھبرائی جاتی ہے۔

پھر میں تم سے کیوں نہ کہوں کہ اپنا جی[1] کے صدمہ میں سیلانہ کرو۔ معلوم
ہے کہ تم علم دوست ہو۔ اخباری حروف کے توڑ جوڑ کو پسند کرتی ہو۔ اور انکی جدائی
گوارا نہیں کر سکتیں۔ مگر جن آیات کو تم نے اپنے خط میں لکھا ہے۔ انہی پر غور کرو تسلی ہو جائیگی۔
شاید نیند کے نشہ میں آج کا خط بے سروپا ہو گیا ہو۔ مگر میں نے حتی الوسع
سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ تمہارے محبتی خط کا شکرانہ مجھ پر لازم تھا۔

تم نے اگر میری سب تصنیفات دیکھی ہیں۔ تو خیر۔ ورنہ لکھو کہ بھیجدی جائیں
مجھ کو خوشی ہوگی۔ کہ تم سی قدردان علم دوست ان کو پڑھے۔

---

۲۷ ستمبر ۱۹۱۳ء دفتر اخبار توحید میرٹھ ۴۷
اول سلام بعدہٗ کلام۔ کل بڑا طول طویل خط لکھا تھا میری عادت

[1] اخبار توحید میرٹھ کی ضبطی اور اس کے صدمہ کا اشارہ ہے

+ + + + + + + + +

مگر ایک دفعہ ہی اتنا لکھنا ٹھیک نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر روز خط آئے۔ مگر اتنا کہ تم لکھ سکو۔ اور میں پڑھ سکوں۔

اب میرا روزنامچہ سنو۔ رات کو خط پڑھا۔ گانا سنا۔ دوستوں کی بحث سنی اور سو گیا۔ پچھلی رات تین بجے بیدار ہوا۔ اور جو کام کرنے تھے کئے چھ بجے کی ریل میں دہلی جانا تھا۔ مگر نہ گیا۔ مینجر صاحب کو بھیج دیا۔

دہلی سے بلاوے آ رہے ہیں۔ بی جو بانو سنتا ہوں اپنے غافل باپ کو یاد کرتی ہیں۔ یہ لڑکی بڑی شریر اور نکتہ چیں ہے۔ باپ کو طعن سے نہیں چھوڑتی کہتی ہے ان کو ہماری کیا پروا۔ تو پھر ہمکو ان کی کیا پروا ہے۔

سچ ہے زمانہ ہی ایسا ہے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کیوں بی جب تمہاری شادی ہو جائے گی۔ اور ہم بوڑھے ہوں گے۔ تو ایک دن ہم کہیں گے جو بانو ذرا ہمارا فلاں کام کر دینا۔ اور تمہارا خاوند کہے گا۔ کہ پہلے میرا کام کرو۔ تو تم کس کا کام پہلے کرو گی؟ سوچ کر بولی۔ اچھا ابا تم شادی کر لو نا۔ میری ضرورت ہی نہ رہے۔ مجھے اس جواب سے بہت تعجب ہوا۔ نئی روشنی کی خود غرض فطرت اسکی زبان میں بولی۔

بمبئی سے آج پھر بلاوا آیا ہے۔ شاید ۲ ہفتے میں جانا ہو۔

آج ایک صاحب ملنے آئے تھے۔ سڑک پر گاڑی روکی اور وہیں ملنے کو بلایا میں نے کہا خانہ بے تکلف ہے۔ اندر آئیے۔ لکھا۔ کہ اگر آپ یہاں آ سکیں تو آئیے۔ میں نے جواب دیا۔ بگی چھت پر بھیج سکیے تو میں آ جاؤں۔ تم ضدی تو میں ہٹیلا چلے گئے۔

آج دسترخوان چپ چاپ تھا۔ ہنس مکھ مینجر دہلی گئے۔ جن کے دم سے ذرا خوش باشی تھی۔ شام کا کھانا بھی ایسا ہی نظر آتا ہے۔ وہ رات کو آئیں گے۔

میں دہلی صرف دو کام کے لیے جانا چاہتا تھا۔ ایک جو اور دوسری بائسکوپ جو کا خیال اتنا نہیں جتنا بائسکوپ کا ہے۔

برکت سے بارہ صفحے پہنچے۔ سرسری نظر سے پڑھ لیے۔ کھانے کا وقت قریب ہے اس کے بعد کہیں جانا ہو اسلیئے اطمینان رات کو ملے گا۔ اسوقت دیکھوں گا۔

عقل مندوہ ہے جو اپنی بات دوسرے کے اختیار میں نہ دے۔ دنیا میں لوگوں کا قاعدہ ہے۔ کہ پہلے تو کسی کا راز کہہ دیتے ہیں۔ پھر اصرار کرتے ہیں۔ کہ کسی اور سے نہ کہنا۔ ایسا ہی خط کا معاملہ ہے۔ اسمیں بہت احتیاط کرنی چاہیئے۔ کیا خبر ہے کہ ہاتھ سے نکلا ہوا تیر کہاں جاکر پڑے گا۔

ایک نئی کتاب کی ترتیب میں آج اندہیرے سے کام کرنے بیٹھا تھا اب کہ شام قریب ہو مشکل اٹھا۔ نیند آرہی ہو۔ بھوک لگ رہی ہے۔ لوگ تعویذ مانگ رہے ہیں۔ میں پناہ مانگ رہا ہوں۔

آج چند صاحب آئے تھے۔ کہنے لگے۔ آپ کا فوٹو درکار ہے۔ میں نے کہا اصل موجود ہے تو نقل کیا کیجئےگا۔ بولے اصل قابو میں نہیں آتی۔

تجھ سے تصویر تری پیاری ہو
گو کشیدہ ہو مگر پاس تو ہے

میں نے کہا بھائی مجھ کو اس شعر شاعری میں نہ ڈالو، سیدھا جواب ہے۔ نوکر سے بکس کھلواؤ۔ تصویر لو۔ اور جاؤ۔

دنیا کے عکس پرست لوگوں کے جھگڑے بھی بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔
فاطمہ تم خوب سمجھتی ہو۔

۲۸۷ میرٹھ توحید آفس ۳۰ ستمبر ۱۹۱۳ء

محمودہ فاطمہ صاحبہ! السلام علیکم۔ رات کو آپ کا یا ہمارا خط پھر غور سے پڑھا۔ پورا آدھ گھنٹہ صرف ہوا۔ اب مجھ کو شکستہ خط پڑھنے کی عادت ہوچلی ہے۔

تصویریں ایک ہیم سے بنوائی تھیں۔ ابن حسن نظامی بھی اس گروپ میں ہے۔
تم اگر اس کو منع سمجھو۔ تو میں تم کو مجبور نہیں کرونگا۔ کیونکہ اپنا اپنا عقیدہ ہے
کسی کو زہر دینے کا اس انگریزی راج میں حق نہیں۔ تعویذوں پٹیکس کی تجویز خوب ہے
مگر بزرگوں نے اسکی اجازت نہیں دی۔ میں تو عام فقیروں کی طرح نذرانے بھی کم
لیتا ہوں۔ ورنہ آج کو لال قلعہ کی برابر ایک شاندار حویلی کا مالک ہوتا۔ مگر اب
ایسا کرنا پڑے گا۔
کانپوری معاملہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ گھبراتی کیوں ہو۔ گرمائی کے سامان تو
اب پیدا ہوئے ہیں۔ دیکھنا اس سردی کے موسم میں کیسی گرمیاں رہتی ہیں۔
روزنامچہ یہ ہے۔ چار بجے کھانا کھایا۔ ہوا خوری کو گیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر
ایک سقہ کے گھر میں اسکی ماں کی زبانی آسیب کے افسانے سنے یہ بیچارے بڑے
وہم پرست ہوتے ہیں۔ ایک گھنٹہ تک اس سنے اور سارے محلہ کی عورتوں نے مسان اور
طرح طرح کی الا بلا باتوں کے حالات سنائے۔ ان سب کو انکی عقل کے موافق تسلی
دی تعویذ بانٹے ساڑھے سات بجے گھر میں آیا۔ دن کے تازہ اخبارات پر احباب
میں مباحثہ تھا۔ اسکو سُنا۔ ساڑھے دس بجے دہلی کے مسافر یعنی منیجر صاحب توحید
واپس آئے۔ دہلی کے دفتر کی ڈاک جو روز آیا کرتی تھی آج دستی آئی۔ اسکو دیکھا۔
پان کھایا۔ ساڑھے گیارہ بجے نماز سے فارغ ہوا۔ بارہ بجے لیٹا۔ پاؤں بولتے دبواتے سو گیا
۔ صبح کو ایک دوست کی عیادت تھی۔ وہاں کچھ پھیکے دودھ اور کونین کی گولی
کا ناشتہ کیا۔ واپس آکر ساڑھے آٹھ بجے کھانا کھایا۔ تازہ ڈاک دیکھی۔ نئی کتاب
انتخاب توحید کا ملاحظہ کیا۔ جو شیخ احسان الحق صاحب نے مرتب کی ہے اور اس
وقت نوکر سر کے بال سلجھا رہا ہے اور
میں لکھ رہا ہوں۔ بارہ بجے ہیں۔

تم کھوگی وہی بائسکوپ میں کیا ہے۔ جو لغت جگر سے زیادہ ہوگئی۔ سنو ہیں عام
تماشا ئیوں کی آنکھوں سے اسکو نہیں دیکھتا۔ مجھ کو ہر بات ان متحرک تصاویر
میں کوئی نہ کوئی نصیحت ہوتی ہے۔ تم نے شاید آجتک اسکو نہ دیکھا ہوگا۔ اب
مجھے امتحان دو کہ کتابوں میں کیا کیا دیکھا: باقی کل۔

۴۶ میرٹھ توحید خانہ یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء

انگریزی مہینہ کا نیا سورج مبارک چاند تو ہم غریبوں کا ہے۔ جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے
اور آجکل بحر ظلمات میں ہے۔ شاید کل یا پرسوں نمودار ہو اسلئے میں تم کو سورج کے
مہینہ کی مبارکباد دیتا ہوں۔ کیونکہ تم بڑی خیرخواہ سرکار اور وفادار انگلش ہو
اور اسکے بعد السلام علیکم کہتا ہوں۔ خط آیا بڑا ہی خوش ہوا۔ آخر وہی ہوا نا
جس کا خیال تھا پیکٹ نہ پہنچا۔ اسی لئے میں نے پہلا پیکٹ رجسٹرڈ بھجوایا تھا جسپر تم
نے اعتراض کیا۔ اور فضول خرچی کا الزام لگایا۔ خیر مضائقہ نہیں حزب البحر تیار ہو جائے
اور انتخاب توحید کی کتاب چھپ جائے تو چاروں کتابیں ساتھ بھیجدوں گا۔
خون ناحق کے نام میں بڑا لطف ہے میں نے ابھی تمہارے لیے اسکو مکتبہ قادریہ
سے خریدا۔ چلو دوبارہ کتابیں بھیجنے کا بہانہ مل گیا۔ رجسٹری بھیجتا ہوں۔
واحدی صاحب بیمار ہیں۔ اسلئے آج ناگہاں وہاں جانے کی ضرورت پیش
آئی ادھر بائسکوپ کمپنی کی کشش ہے۔ شام کو جاؤنگا۔ کل کا خط دہلی منزلگاہ
نظام المشائخ کے پتہ سے بھیجا۔
تصویر کی نسبت تم نے لکھا۔ یہ منع ہے۔ مسئلہ تو یہی ہے۔ مگر میرا عقیدہ اس مسئلہ
میں از روئے تحقیق اصول فقہ اس کے خلاف ہے۔ میں تصویر عکسی جائز سمجھتا ہوں۔
اس لیے میں نے اپنی سیکڑوں تصویریں کھچوائی ہیں۔ حور بانو اور اسکی والدہ ملک کی

بائسکوپ بھی تھی اور دو دن۔ مگر اب کے اس میں ایسی باتیں تھیں کہ تم کو
لکھنی مناسب نہ جانیں۔ گوروں کی بے غیرتیاں میں نہیں چاہتا کہ شریف
بہو بیٹیوں کو سنائی جائیں۔ بس یہ سمجھ لو۔ کہ سوڈانیوں کی ایک [illegible] آئی ہوئی ہیں
وہ بائسکوپ میں ایسے حیا سوز نظارے دکھاتی ہے جو شریف آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں

یہ قوال عبداللہ کون ہے۔ سلطان شاہ کا عرس ہونے ہمارے گھر میں رہتا
ہے دن عید ہے اور رات شب برات۔

پان کھاتے کھاتے جی اکتا گیا۔ اس کا تو اس وقت ذکر بھی نہ کرو۔

ماما عظمت اور سب کو سلام۔ زچہ نے خود بے احتیاطی کی گھی کھانے
دینے کو موجود ہوں۔

خواجہ خضر کی نانو خادمہ کو سلام۔

بدھ　　　میرٹھ　　　منزل توحید　　　۱۱ اکتوبر ۱۵ء

السلام قبل الکلام۔ سلطان فاطمہ کو پیار۔ ۱۰ [illegible] بہو بیٹیوں کو دعا۔
زچہ خانم کو چودہ [illegible]

درد سر گیا۔ خط آیا۔ آج صبح سے چہل قدمی کی۔ جی بشاش دماغ زور پر
ہے۔ لکھنے بیٹھا تو کاغذ نہ ملا۔ نوکر حاضر نہیں۔ آواز دیتا ہوں۔ کوئی نہیں بولتا
خود نوکر بنا کہیں تلاش کیا۔ مگر خبر نہیں کاغذات کے پیکٹ کہاں رکھ دیے
ہیں نہ ملے ناچار نواب وقار الملک والے کاغذ کو لکھنا شروع کیا۔ [illegible]
کو لکھنے بیٹھا تھا کہ چھوڑ دیا۔

ظل السلطان رسالہ کی کیا قیمت ہے۔ پتہ بتاؤ تو جاری ہو جائیگا۔
کج واحدی صاحب کی آمد گرما گرمی سے ہے۔ پوچھونگا کہ یہ تحقیقات والا معاملہ کیا تھا

۲۶ | دہلی | ۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

محمودہ فاطمہ صاحبہ! السلام علیکم۔ پرسوں سے دہلی میں ہوں۔ مگر ایسا کہ گویا نہیں ہوں واحدی صاحب کی علالت نے حواس باختہ کر رکھا ہے ایک وجود ہے جس پر اعتماد تھا۔ خدا اسکو سلامت رکھے۔ اس کے دم سے مجھے آزادی ہے۔

بخار۔ غفلت۔ کمزوری۔ اسپر نازک طبع، معالجہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلنے کی فرصت نہیں ملتی، امیر غریب کی بحث نہیں۔ میں آنکھوں سے آؤں گا۔

۲۷ | میرٹھ | بیت التوحید | ۱۸ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

صبح خط لکھ چکا ہوں۔ درد سر سے نڈھال ہوں۔ کرسی کے لیے وبال ہوں چکنی ہوگئی ہے۔ لیٹا ہوں۔ نوکر تیل مل رہے ہیں۔ زبان سے مضمون بولتا ہوں کاتب لکھتے جاتے ہیں۔ ذرا کے ذرا اٹھا تمہارا خط سب کو خاموش کر کے پڑھا۔ لڑکی تو اس قدر عمدہ کیونکر لکھ سکتی ہو۔ شکایت دور کرنے کے خوب ڈھنگ یاد ہیں اگر بولنا نہیں آتا تو مضائقہ نہیں مجھے کونسا بولنا آتا ہے۔ لکنت زبان میں ہی کوئی قرینہ درست نہیں۔

لکھنا اتنا زیادہ ہو کہ تندرست سرور کا رہے۔ اور وہ موجود نہیں۔ اب چاہے اس خط کو پھیکا سمجھو۔ یا میٹھا۔ کڑوا یا کھٹا تیل کا ملیدہ گھر کے پیروں کو دیتے ہیں میں تو باہر والا پیر تھا۔ والدہ صاحبہ لکھتی ہیں۔ تعویذ تمہارے لئے بھی۔ مگر ٹکٹ جب تک نہ آئے تعویذ دینا محال ہے۔

آج دہلی آتا تھا مگر رہ گیا۔ ایک کتاب فرام تصبلبؔشملہ لکھی ہو۔ وہ چھپ جائے تو اطمینان ہو۔

اس نے میری تصویر دیکھی تھی۔ شکل نہیں دیکھی۔ اور لکھا تھا کہ میں خاموش وجود کو

عشق کے خیال خاموش کی خاطر پسند کئے لیتی ہوں۔ ورنہ مجھے متحرک پیر ورکا ہو۔ میں بھی

اس کے تقاضے سے جاتا ہوں۔ دیکھو اس تقول کاناک نیچے گلے سے اترتا ہے۔ کہوں گا ورنہ

مجھے ٹرانسکوپ دکھا۔ اور سمجھ کہ چودھویں صدی کے بزرگ ایسے ہوتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے۔ تم نے میری کتابوں میں صرف عیدی کو پڑھا۔ بچہ بن گئیں

محمود مجموعہ مضامین کو دیکھا ہوتا۔ ہاں خونی داستان بھی پڑھی ؟

---

۴۷ میرٹھ بنام توحید ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء

محمود فاطمہ صاحبہ

السلام علیکم۔ سنا ہے آجکل دہلی والے ساڑھے آٹھ بجے تک سوتے رہتے ہیں۔

ان سے کہنا چاہیئے۔ سویرے اٹھنا تندرستی کے لیے اور مشغولی خیالات کے لیے ضروری ہے

میں عموماً بہت سویرے بیدار ہوتا ہوں۔ کبھی کبھی اس کے خلاف ہوتا ہے معمول

یہ ہے کہ پانچ بجے حوائج جسم اور فرائض خدا سے فراغت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد

ہوا خوری اور پیدل چلنے کے لئے ایک گھنٹہ صرف کیا جاتا ہے۔ اور پھر ہشاش

بشاش بیٹھ کر دوسرے مشاغل ہوتے ہیں۔

سنا ہے تم دہلی والوں کے خلاف بہت سویرے سے بیدار ہوتی اور قرآن شریف

پڑھتی رہتی ہو۔ جب تک اہل دہلی جاگیں۔

بہت اچھا معمول ہو۔ مگر ان کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے جنکے گھر میں قرآن

نازل ہوا تھا۔ اور شاید تم کو معلوم ہو۔ کہ میں اہل بیت میں ہوں۔

کہا جاتا ہے۔ شرم و لحاظ مستورات کے واسطے لازمی ہو۔ اس گروہ کا جز ال

ہوں مگر دور آزادی و حریت میں کوئی شخص مراسم قدیم کو اس قدر قائم نہیں رکھ سکتا جتنا

واحدی صاحب بہت صاف اور سادہ دل نوجوان ہیں معاملات تجارت میں بیباک اور مستعد ہیں انہوں نے اگر ایسا لکھا۔ تو اپنا فرض پورا کیا۔ برا نہ ماننا فاطمہ ہاں میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ لکھنے میں دل کی باتیں ادا ہو جاتی ہیں بہت سی پھانسیں نکل جاتی ہیں زبان میں اتنی قدرت نہیں لیکن بعض باتوں کا لطف گفتار بغیر ادھورا رہتا ہے۔ اور میں کہ آزاد وجود ہوں۔ قلندرانہ مشرب رکھتا ہوں۔ خدا تک کی ہم کلامی کا امیدوار اور موسیٰ نبی کی طرح ارنی کہنے کا مدعی۔

اتوار کی آمد یقینی نہیں جنکے لیے بیتابانہ وہ خود آتے ہیں۔ اصرار ہوا تو شاید چلا جاؤں حور کا دیکھنا لازمی ہے۔ آخر کو تو خدا نے اسکو میرا لخت جگر بنایا ہے، دیکھوں کس حال میں اور کس خیال میں ہے۔ اسکے فقرے کیسے غضب ہیں بیٹی ہے مگر باپ کے دوسرے تعلقات سے سوکن بنکر رہتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ میں ہنسوں یا ماتم کروں۔

مگر میں ناحق اپنے رنگیلے دماغ کو پریشان کروں۔ رنگیلے کے لفظ سے شبہ نہ کرنا پاکباز ہوں۔ ایک آستین کرتے کی برسوں سے پھٹ گئی ہے۔ میں نے اسکو اور چھیڑ ڈالا خوش ہوتا ہوں کہ دریدہ جامہ والا ہوں۔ خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ ہزار شکر۔ اسکی نعمتوں کا مگر کبھی اچھا پہننے کی حرص نہ ہوئی۔ یہ گویا رنگیلے پن کا پہلا رد ہے۔

سوائے بائسکوپ وتھیٹر کے کبھی ایک پیسہ کسی ناجائز کام میں خرچ نہیں کیا۔ کبھی کسی شرعی طریقہ نارو افعل کا ارادہ نہ ہوا۔ کرنا تو شئی دیگر ہے۔ مگر رنگینی کا یہ عالم ہے کہ بات تحریر یا سیل جول۔ ہر چیز میں لطافت کا خواستگار رہتا ہوں۔ ثقیل غذا دوا۔ ادا ہر چیز سے انکار ہے۔ تمہارے خطوط میں نزاکت۔ لطافت اور خیالات کی برجستگی پائی تم سے جی مل گیا۔ ورنہ سینکڑوں لکھنے والیاں خط لکھتی ہیں۔ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ند دانند سلیمہ البتہ خوب لکھتی ہے۔ شرارتیں کرتی ہے مرید ہے امیر کبیر ہے مگر سچے دل سے میری طلبگار ہے میں نے اسکو کبھی نہیں دیکھا خط کے ذریعہ بیعت کی تھی

ارادے خاموشی و گوشہ نشینی، صحرانوردی میں لطف کا نشان پاتا ہوں۔ ممکن ہے
کہ کل تک یہ دورہ ختم ہو جائے۔ اور میں تم کو مطمئن خط لکھ سکوں۔ اور تم بے اختیار
میری باتوں پر ہنسو۔ مگر اس وقت نہ ہنسنا۔ اور دعا کرنا کہ خدا تعالیٰ انجام بخیر کرے
اکثر اوقات موسم کی تبدیلی کے وقت میری یہ حالت ہو جایا کرتی ہے اسلئے
کچھ اندیشہ نہ کرنا۔ میرٹھ گیا۔ اور حالت درست ہو گئی۔ تو خط لکھوں گا۔ ورنہ آخری
سلام قبول ہو۔

---

۱۰۶ میرٹھ اشاعت گاہ توحید ۹؍ اکتوبر ۱۹۱۸ء

یا الفاطمہ علیک السلام و منک النظام
رنگین پوسٹ کارڈ ان عمارتوں کے جن کے مالک کبھی ہم تھے۔ انکو بھیجتی ہو جو کبھی کچھ ہوں گے
آج کے مختصر خط نے کل کے طولانی خط سے آدھا اپنی بساط کے موافق لطف دیا
رات کو ایک صاحب مزاج پرسی کو آئے تھے جن کے پاس میرے ڈیڑھ سو خط ہیں
کہنے لگے۔ جان کی برابر لگا رکھا ہے۔ مر جاؤ گے۔ تو چھپاؤں گا۔ میں نے کہا مرے
میرے دشمن نامعقول پیشگوئی کرتا ہے۔ کل جینے کیا لکھتا ہے۔ ہنسکر کہنے لگے کہ آپ کے
بزرگ تو زندگی میں کئی کئی بار مرتے تھے۔ آپ اتنا ڈرتے ہیں۔
میں نے کہا۔ دو بار میں بھی مر چکا ہوں۔ بھائی اب مجھے جینے دو۔ بائسکوپ
کمپنی دیکھنی ہے۔ دنیا کو زیر و زبر ہوتا دیکھنا ہے۔ کروڑوں آدمی کا خون بہتا دیکھنا
ہے۔ غرض بہت دیر لطف کی باتیں رہیں۔
ایسے بس دو چار آدمی ہیں۔ جنکو میں نے بہت زیادہ خط لکھے ہیں۔ مگر جب
تک میں ان خطوط کو دیکھ نہ لوں۔ چھاپنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لکھتے وقت
مجھے یہ خیال تھوڑی تھا۔ کہ یہ شائع ہونگے۔ خبر نہیں کیا کیا لکھا ہوگا۔ وعدہ کر گئے
ہیں کہ کل لاکر دکھاؤں گا۔

پرانے زمانے والے لکھنا چاہتے ہیں۔

واحدی صاحب کو تم پیار چھوڑا تھا۔ خدا پر جس کو چھوڑ دیا جائے تو فکر بہت کم رہ جاتا ہے۔ اور وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

بالاخانہ کے دو پھول تمہارے والد صاحب نے عنایت کئے تھے ان کی رنگت سے خوش ہوا۔

مجھے زیادہ یا کم لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں اس قسم کی تحریر و لکھا ہوا نہیں ہوں۔ نہ میرے دل میں ان واقعات کے غور کرنے کی گنجائش ہے میں قدرتاً نازک طبع و نازک دماغ ہوں۔ ذرا سے ناروا برتاؤ سے متاثر ہو جاتا ہوں حالانکہ یہ ایک بشری کمزوری ہے۔ والسلام۔

ظہیر | دہلی | ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء

فاطمہ! آج صبح سے میری حالت مجنونانہ ہے۔ بات کو ہنسی میں نہ ڈالنا۔ تمہارے ہاں جا کر خبر نہیں میں نے کیونکر جی کو سنبھالا۔ اور سمجھ داری کی باتیں کیں ورنہ ناممکن تھا۔ کہ میں بول سکتا۔

واحدی صاحب سے کہہ دیا۔ کہ میرا نام رسالہ نظام المشائخ کی نگرانی و سرپرستی سے نکال دیں۔ اب مجھے اس سے کچھ تعلق نہیں۔ خاص خاص دوستوں کو خط لکھ رہا ہوں کہ تمہاری دوستی ختم۔

قدم شریف گیا تھا۔ وہاں بھی جی نہ لگا۔ میرٹھ نہیں جاتا کل تک حالت درست ہوئی تو شاید چلا جاؤں۔ ورنہ نہیں۔ اجمیر شریف سے تار آیا ہے۔ جو ملفوف ہے۔ وہاں بھی انکار لکھ دیا۔ بمبئی کے بلاوے کو جواب صاف بھیجدیا۔

میرا خیال ہے کہ یہ کوئی مرض ہے۔ دل پر حرارت ہے اب میں اپنے قدیم

تم بامراد ہو۔ خدا بامراد کرے اور سب پریشانیاں دور کرے۔ ٹیکس ابن ہی ہے کہ قدردان بعنوان تعویذ گنڈوں کی۔

حوسبانو کی کوئی اطلاع نہیں آئی امید ہے کہ اچھی ہوگی اور نہ ہوگی تو امید ہے کہ اچھی ہو جائے گی۔ آدمی تندرست ہونے کو بیمار ہوتا ہے اس کی خوشی ہے کہ واحدی صاحب اچھے ہو گئے۔

احمدی — درگاہ شریف — دہلی — ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء

صاحب سلامت۔ دہلی کا خط آج ملا مگر میرے خط کا جواب تم نے نہ دیا جو پرسوں میرٹھ سے بھیجا تھا۔

رسالہ کی ایڈیٹری میں تمہارے واسطے بہت مفید پاتا ہوں۔ مگر معلوم نہیں تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہوگی۔ بہرحال جو کچھ ہو۔ جلدی لکھو۔ شاید کل جواب آ جائے یا کل کی ڈاک میں ملے۔

تم نے میری پرسش بہت مختصر الفاظ میں کی۔ حالانکہ حالت اس سے زیادہ تقاضہ کن تھی۔ بخار سے نجات مل گئی۔ مگر طبیعت کو سکون نہیں ملا۔

نظام المشائخ یا کسی اور اخبار رسالے میں اگر میرا نام نہ ہو تو تم کو اس کے چھپنے سے کیوں انکار ہوگا۔ میرے نام سے اسمیں کیا خوبی ہو جائے گی۔ یہ قطعیت تو انقلاب خیالات کے سبب ہے اب میں اخباری دنیا سے ناآشنا رہنا۔ ہر آشنائی سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مجھ کو اس میں لطف ہے۔ کہ کوئی مجھے نہ جانے۔ انگلی اٹھا کر نہ بتائے کہ یہ فلاں ہے۔ آج کل یہ بات نصیب نہیں۔

دیکھنا فلسفہ لے کر نہ بیٹھ جانا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا یہ خیال اصول زندگی اور فلسفیانہ طریق کے موافق نہیں ہے۔ مگر کیا کروں۔ خلجان۔ دل کو ویران کئے

آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ دیکھیں کیا کیا لکھا نظر آتا ہے۔

کل حزب البحر اور دو خط بھیجے ہیں۔ آج صحت تو درست ہے۔ مگر فرصت بیمار ہے پچھلی رات سے کتاب کو لپٹا ہوا ہوں۔ اب کہ دس بجے ہیں۔ فارغ ہو کر اطمینان و فراغت کا سانس لیا۔ پان کھایا۔ آٹھ بجے۔ کھانے کے بعد کام کے استغراق میں پان کھایا تھا۔ اس نے مزہ نہ دیا۔

آج جمعرات ہے ولایت کے خطوط لکھنے ہیں۔ مصر، شام، جاپان کی ڈاک تو ختم کر دی۔ استنبول کی رہ گئی ہے۔ بیچ میں اپنے دارالحکومت کا خیال آ گیا۔ اور تم کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

کبھی روزنامچہ نہیں بھیجا۔ دیوانی! اس کو روزنامچہ ہی کہنا چاہیے۔ باتوں باتوں میں سب کچھ تو کہہ جاتا ہوں۔

کل دفتر کے کئی کارندے موقوف کئے گئے۔ ہا۔ توحید کے بند ہونے سے کتنے آدمیوں کی روٹی گئی۔

پڑوس میں چار دن سے اودھم مچا رکھی ہے۔ رام لیلا کا گانا بجانا رات بھر رہا سحری کے وقت لکھنے بیٹھتا ہوں۔ تو ان کی آوازوں سے جی گھبراتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ کام میں محو ہو گیا۔ پھر نہ سنا کہ کیا آوازیں تھیں۔ آج دو جز کے قریب یعنی کتاب کے ۳۲ صفحے لکھے۔ ذرا تعریف کرو میرے دماغ کی کیسا محنتی اور کارگزار ہے پھر نہ کیوں میں اس کو بائسکوپ دکھاؤں۔

رسالہ کے سوار آئے ہیں۔ اور سرکہ کی ایک بوتل نقدی کے ساتھ نذر ہمراہ ہے مجھے اس بے موقع تیز نذر کو دیکھ کر ہنسی آ گئی مگر رکھ لی۔ محبت کا تحفہ ہے۔ محبت کی دی ہوئی ہر چیز بیش قیمت ہوتی ہے۔ مصر میں ایک شخص نے سگرٹ پینے کا پائپ دیا۔ میں نے اسکو بوسہ دے کر قبول کیا۔ ورنہ کجا میں اور کجا سگرٹ

نہیں ہو۔ لیکن اپنا ادھ کچرا شریک درد سمجھ کر لکھ دیا۔ ادھ کچرا اس لیئے کہا۔ کہ سنجیدہ ہمدردی کے بوجہ بات چند درچند نا قابل ہو۔
آج میں نے تمہارے سب پچھلے خطوط جمع کر کے پڑھے ہیں۔ خاصی کتاب بنگئی ہے۔

---

۵۷ | میرٹھ | ادارہ توحید | ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء

استانی صاحبہ۔

سلام علیکم۔ کل مفصل خط بھیج چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے نام بھی خط ہے۔ لیپے مخصوص اور کھلجانوں میں تھا۔ کہ فوری کارروائی نہ کر سکا۔ میں خود جانتا ہوں کہ تمہیں تکلیف ہوئی ہوگی۔ تم کو اپنی بات کا پاس ہے۔ مجھ کو تمہاری آسائش کا پاس تھا اگر تم کو ایسا ہی شوق استانی گری ہے۔ تو بسم اللہ فوراً سدھارو۔ آج کا خط نازک کاغذ پر ہے چاک کرنا چاہو تو آسانی سے پُرزے پُرزے ہو جائیگا۔ جلابی چیلیں کو تکلیف نہ ہوگی بانو مجھ کو بڑا فکر ہوا۔ تمہارے جلاب کو سنکر۔ اس کم بخت املتاس نے تم لوگوں سے آخر ایسا کیا سلوک کیا ہے۔ کہ ہر شخص کے گلے کا ہار ہے۔ اور تم اسکو جدا نہیں ہونے دیتیں خدا خدا کر کے ایک زچہ جم جم گھر سے نکلیں تھیں۔ کہ دوسری صاحبہ نے دائی کو آوازیں دلوانی شروع کیں۔
نہ بابا میں تم لوگوں کو ہشاش بشاش دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ بیماریوں کی ہوں۔ ہاں سنوں۔
روزنامچہ کس کو بھیجوں۔ اسکو جو کمر باندھے تیار بیٹھا ہو۔ خدا کی شان یہاں تو ایڈیٹری کی سفارش کی گئی۔ وہاں خط میں اس کا ذکر تک نہیں۔ معاف کرنا۔ رائے واپس لیتا ہوں۔ اور جلدی فیصلہ کرتا ہوں جیسی تم کو خواہش ہے۔
واللہ باللہ میں تمہارے لاہور جانے سے کبیدہ نہیں ہوں۔ میرا تمہارا تعلق

بیتے ہیں میرا دل معمولی نہیں ہے۔ میں اسکو بہت پیار کرتا ہوں۔ کیوں اسکو ایذا پہنچاؤں لازم ہے کہ اسکی حفاظت کروں۔ دلداری کروں اور کسی کے ہاتھ سے صدمہ نہ اٹھانے دوں۔ اب تو ہر شخص اسکو کچھ کے دینے چاہتا ہے۔

فاطمہ تم باوجود عورت ذات ہونے کے اور پردہ کے جیل میں زندگی بسر کرنے کے حوصلہ مند ہو۔ اپنی اور اپنے بھائیوں کی بہتری چاہتی ہو۔ میں اس قابل نہیں رہا مجھکو بھائیوں، بچوں، قرابت داروں۔ دوستوں سے مقدم اپنی خوشی وراحت ہے تم بھی دیکھ لوگی جب دنیا میں آگے بڑھو گی کہ اصلی راحت و سکوت گمنامی میں ہو۔

آج میں نے دیکھا ایک ضروری کاغذ کا پھٹا ہوا پرزہ جوتیوں میں پڑا ہوا تھا میں نے اسکو ہاتھ میں لے کر ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور کہا۔ کل تک یہ مخفی بکس میں عزت مآب تھا۔ اور اس پر ہزاروں امیدوں کا انحصار تھا۔ آج کام ختم ہوا۔ تو چاک کر ڈالا گیا اب یہ ذلیل اور نہ پر نعلین ہو۔

محدود دنیا کا یہی دستور ہے۔ یہ کام نکالتی ہے جب تک کام نہیں نکلتا عزت کرتی ہو۔ اس کے بعد تم کون اور ہم کون۔

بس عقل مند وہ ہے۔ کہ دوسروں کی بھلائی کے ساتھ اپنی خوشنودی طبع کو بھی ہر وقت پیش نظر رکھے۔ میں نے اپنی زندگی کے ذخیرہ جواہروں کو فن قومیات میں برباد کر دیا۔ میں نے سمجھا کہ قوم کی گاڑی میرے سہارے چلتی ہے۔ لیکن یہ دھوکہ تھا مجھ کو سارا حصہ دوسروں کی بہتری پر صرف نہ کرنا چاہیئے تھا۔ بلکہ اپنی ذات کا خیال بھی لازم تھا آخر یہ ہوا۔ کہ لوگوں نے اپنے مطلب نکال کر نگاہیں پھیر لیں۔ انہوں نے سمجھا کہ اب اس کے بغیر کام چل سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے کہ ان کا کام میرے بغیر چل جائے گا تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔

میں نے یہ باتیں ایسے الفاظ میں لکھی ہیں کہ شاید تم نہ سمجھو۔ کہ واقف حالات

واپس آیا۔ گانا سنا۔ دس بجے سونے لیٹا چکر آنے لگے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ ملتان
قلابازیاں کھانے لگا۔ میں نے کہا وقت آخر ہے۔ کلمہ پڑھا۔ توبہ کی۔ ہمنا کرونیں
لین ریشمی لحاف اوڑھ لیا دل نے کہا یہ ناجائز ہے۔ اس بحث میں خیال بدلا اور نیند آ گئی۔
۲۵ راکتوبر۔ آج لیٹا رہا آنکھ وقت پر کھلی تھی۔ نماز بھی دانستہ قضا کردی۔ نوکر کو
بلایا۔ پاؤں دبوائے۔ سورج نکلنے پر گرم پانی سے وضو کیا۔ نماز پڑھی۔ جی نڈھال ہے
جگر کی خرابی ہو۔ سیب کی چند قاشیں کھائیں۔ ۲۲۔ منٹ چت پر چہلقدمی کی۔ سوا
آٹھ بجے کھانا کھایا۔ ڈاک آ گئی۔ دہلی کے کئی خط تھے۔ مگر لال دروازہ کا کوئی نہ تھا۔
اخبارات پڑھے۔ اب آرام کرسی پر لیٹا ہوں۔ اور یہ لکھ رہا ہوں۔ پانوں کی ڈبیا پاس
ہے اگالدان نہیں ہو اندیشہ لگا ہے کیونکر لاؤں۔ اجمیر شریف سے خط نہیں آیا حسن
نے بھی خیریت نہیں بھیجی۔ کسی کو میری پرواہ نہیں ہو۔ نیند آئی سوتا ہوں۔

---

۱۹۷ میرٹھ مشرق التوحید ۲۷ راکتوبر ۱۹۱۳ء

سلام علیکم۔ آج بعد انتظار بعید، شدید اور دشواری تمام خط آیا۔ آپ کے
شکستہ میں امن ہو۔ جس نے ادھورا خط لکھنے دیا۔

اس خط سے پہلے شاید میں آپ سے مل لونگا کیونکہ آج ایک بجے کی ریل میں
دہلی جاتا ہوں۔ مگر ناف کی شرارت کے سبب ممکن ہو نہ آ سکوں اور اس خط کے بعد
آؤں۔ کیونکہ کل سے بہت تکلیف ہو۔ نہ کچھ کام ہو سکا نہ ناکام رہ سکا۔
ڈاکٹر اقبال کے لہجہ و انداز کی نسبت میں کل ہی تم کو لکھ چکا ہوں بے شک وہ
ذی ہوش آدمی ہیں۔ میرے خط کے بشرے سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ کچھ کبیدہ بھی ہوئے۔
تم مجھ سے خوبصورت خط ان کے نام مانگتی ہو۔ مگر ناف نے خود میری صورت
بگاڑ رکھی ہے۔ کیا لکھوں سمجھ میں نہیں آتا۔ آج تم سے ملکر یا بذریعہ خط بات چیت

تحریری ہے۔ جو لاہور میں بھی رہ سکتا ہے۔ تم کو اطمینان ہو۔ مجھ کو اوسان ہو
تو پیسہ اخبار کی اشاعت سے پہلے کچھ لکھ دوں گا۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

بیٹے

فاطمہ فکر ہے آج پھر خط نہیں آیا کل رجسٹرڈ خط بھیجا ہے۔ مجھ کو تمہاری علالت کی خبریں ہلکان کئے ڈالتی ہیں۔

تم اچھی ہوتیں تو لکھتا۔ کہ میں بھی دو روز سے جگر و معدہ کا بیمار وار ہوں اور خوش ہوتا جب تمہاری عیادت آتی۔

ڈاکٹر اقبال کو خط بھیجدیا ہوگا (یعنی اپنا) دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔

روزنامچہ بھی ہے

۲۴ر اکتوبر۔ سورج سے پہلے کمپنی باغ کی سیر ختم ہوئی۔ ہوا مزیدار تھی۔ انگریزوں کے بچے بھی اسی وقت لائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہے صبح کی ہوا سب غذاؤں سے بڑھ کر ہے۔ ہندوستانی بچے اسوقت سویا کرتے ہیں۔

سات بجے کام کرنے بیٹھا مگر جی نہ لگا۔ ایک خیریت کا خلجان تھا۔ رات سے نوکر غائب ہے۔ آج ڈاک لانے والا بھی کوئی نہیں۔

دروانہ سلیمہ کا کل خط آیا تھا۔ لکھتی ہیں کیا مایوس ہو جائیں۔ ان کو جواب لکھا ایمان اور خوف کے درمیان رہا کرتا ہے۔ تم بھی یہی خیال رکھو۔

دوپہر کو نوکر دہلی سے واپس آیا۔ اتنے عرصہ میں۔ کھانا۔ لکھنا سونا رونا میں نے کئی کام ختم کر لیے تھے۔ دہلی کی خبروں سے جی بشاش ہوا۔ جواب لکھو اور فوراً بھیجو۔

چار بجے دہی سے روٹی کھائی۔ لوگ کہتے تھے سردی ہو نزلہ ہو جائیگا مگر ان کا کہنا ناکام و غلط ہوا۔ مغرب کے بعد شہر کی سیر کو گیا۔ بھتیا احسان ہمراہ تھے۔ آٹھ بجے

حتی الوسع ہم نے ان کو سارے میرٹھ کی سیر کرائی۔ اس لیئے کہ وہ تم محروم سیر بی بی کے بھائی تھے۔

لاہور | دہلی | ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ

محمود فاطمہ صاحبہ۔ سلام علیکم۔

اس وقت تو بہت بہت شکر گزاری اور اظہار ندامت کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ ترکاری۔ کچوریاں۔ مٹھائی، کھلونے، کپڑے۔ چار روپے وصول ہوئے۔ اس کو رسید کہوں یا شرمندگی نامہ۔ تم نے یہ اس قدر کیوں تکلیف کی۔

جو بابو کا کل چلا جانا میرے اختیار سے نہ تھا۔ اسکو عید کے سبب گھر والوں سے ملنا ضروری تھا۔ گھر جا کر خالہ نے روک لیا۔ تاہم میں نہایت سچائی سے افسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اور آپ کے سب گھر والوں کو انتظار کی تکلیف ہوئی۔

لاہور | بمبئی | پریل

۲۹۔ نومبر ۱۹۱۳ء

محمودہ! تم کو اور للاہ کو ہزار رحمت کہ ملاپ ہوا۔ کپڑے دیس سدہاریاں دیے دہلی سے آوازیں آتی ہیں۔ احمد آباد کی ڈاک میں خط آیا۔ غنیمت ہے استانی صاحبہ کو بھی غریب یاد آیا۔

خاطر داریاں مبارک۔ ہاں دعا تو یہی ہے کہ کامیاب ہو۔ بامراد ہو۔ دلشاد ہو۔ مگر دہلی اسٹیشن کی چھٹی کب ملے گی۔ جمعہ کے جمعہ دہلی کا پھیرا کر جایا کرو۔ بات ہی کیا ہے رات بھر کا سفر ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی بیویوں کا حال نہ لکھا۔ اس کے سننے کا مجھ کو بہت شوق ہے الٰہی تیری پناہ یہ تم نے پتہ لکھا ہے۔ یا شیطان کی آنت۔ نہ بُوا مجھ سے یہ طویل و عریض عبارت

کردونگا۔ اور اطلاع دے دونگا۔

خدا تمہارے گھر کی چہل پہل سلامت رکھے۔ عیسیٰ ہوتا تو تم کو عیسائی بنانے کی کوشش کرتا۔ مگر تم تو مس مریم تک سے گھبراتی ہو۔ میری تو وہ والدہ کی جگہ ہوئیں۔ تمہارے خطاب کی بموجب۔

میری آزادی تمہارے ساتھ خط وکتابت تک محدود ہے اردی کا فقرہ محض ظرافت پر مبنی تھا۔ نہ کہ اور کوئی غرض شامل حال تھی۔

اغراض مشتبہ ہمیشہ بدگمان لوگ پیدا کرتے ہیں۔ میری سرشت آج تک بفضل خدا ان امور سے پاک ہے اور خدا نے چاہا تو آیندہ بھی پاک رہیگی۔ ادبی اور لٹریری فی الحقیقت البتہ رکھتا ہوں۔ جس میں یہ زندگی دیکھتا ہوں۔ اس سے گرویدگی ہو جاتی ہے۔ تم کو بجائے پایاکہ ہونہار ہو۔ اور تمہاری عمر کا خیال کروں۔ تو ہونہاری کے لفظ کے بدلے جو کم سنوں پر بولا جاتا ہے۔ کہوں، زندہ دل سمجھدار باتمیز ہو۔ بس دل کو ایک انس و تعلق ہو گیا۔ بیمارئ ناف کا کشتہ

میرٹھ۔ لال کرتی دفتر خانۂ توحید پنجم ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء

پردہ نشین بی بی۔ تجھ پر سلام۔ ہم تندرست ہوں۔ اسی عالم میں تمہارا خط پڑھا جو آج آیا تھا۔ آصفی رات کو دہلی گئے۔ بہت روکا۔ مگر نہ رکے۔ آخر کس بہن کے بھائی ہیں۔ میں نے اس قدر خاموش لڑکا زندگی بھر نہیں دیکھا۔ رات دن میں یہ مشکل دس بارہ لفظ بولے ہوں گے۔

میں نے ان کو آصفی خطاب دیا ہے۔ وہ میرے نفعت مرید ہو گئے ہیں میں نے انکی خصلت اور سنجیدگی و سکوت کو بہت پسند کیا۔ ان کے سبب مجھ کو اور میزبان بھتا احسان کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ البتہ ان کے جلدی جانے سے سب کو رنج ہوا۔

دارالسلطنت پنجاب کی بستیہ اور کجا دہلی کی سلیم شاہی لچکیہ۔

اب شام کو کرسمس کی سیر کرکے آیا۔ اور شریرہ خاتون کا خط پایا۔ گھر والے انتظار طعام میں تھے۔ بھوک نہ تھی ان کو کھانے کی اجازت دی۔ اور میز پر خالی خولی بیٹھ گیا۔ صرف ایک جام شراب اور آدھے توس تک دست درازی ہوئی۔ ہاں ایک کیلا بھی کھایا۔ اس کے بعد پاؤں کا دور ہوا۔

شراب کے نام سے بدگمان نہ ہونا۔ میری شراب سادہ پانی ہے۔

اس کے بعد خط پڑھا۔ باتیں کیں۔ جب سب سو گئے تو لکھنے بیٹھا القاب اور تاریخ لکھنے پایا تھا۔ کہ میزبانہ نے آواز دی "می آئی کم"۔ میں اندر آسکتی ہوں۔ میں اٹھا دروازہ کھولا۔ اندر لایا۔ بولیں تیل لگانا ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ مگر تھوڑا۔ کیونکہ مجھے اسوقت بہت کام کرنا ہے۔ زیادہ تیل سے جی گھبرائیگا۔ غرض انہوں نے تیل لگایا کنگھی کی۔ اور میں نے خط کا مضمون تصنیف کیا۔ وہ گڈ نائٹ کہہ کر باہر گئیں۔ اور میں نے قلم سنبھالا۔

یہ لوگ یہودی ہیں۔ عربی بولتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں۔ اردو بولتے ہیں۔ گجراتی بولتے ہیں۔ مرہٹی بولتے ہیں تیلنگی بولتے ہیں۔ غرض ہفت زبان ہیں نکتہ سنج ہیں۔ مردم شناس اور فقیر دوست ہیں پچیس تیس روپیہ روز خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں۔ زیادہ امداد اپنی قوم یہودیوں کی کرتے ہیں۔ گھر کی بوڑھی سرپرست جن کا نام سارہ اور لقب میڈم صاحب ہے۔ فارسی خوب سمجھتی ہیں۔ ہر وقت غالب کا دیوان ہاتھ میں رہتا ہے اڑتی چڑیا کو پہچانتی ہیں یہ عقل و تجربہ ہے۔ سمہ خاتون ان کی پوتی۔ ازقل حیم پوتا۔ ڈیوڈ بیٹا۔ ریچل بہو۔ عمر بیرا۔ عارف خانساماں حسن نظامی مہمان۔ اتنی مورتیں اس بنگلہ میں ہیں۔ میرے لیئے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص ہے۔ اتنا بڑا۔ کہ بمبئی کے رہنے والے لوگ اپنے دو کنبے رکھ سکتے ہیں غسل خانہ۔ مسہری۔ فرش۔ میز کرسی سب سامان اعلیٰ اور آسایش کا ہے۔

نہ لکھی جائے گی آسان سا مختصر پتہ بتاؤ۔

لیکن میں۔ سو صورت حال یہ ہے کہ کیا نام بمبئی میں جی لگ گیا۔ نیند اچھی آتی ہے۔ کھانا اچھا ملتا ہے۔ بائسکوپ اچھی میسر آتی ہے۔ مرید پاؤں خوب دباتے ہیں۔ موٹر میں سیر خوب ہوتی ہے۔ گانے کا اچھا لطف رہتا ہے۔ بالوں میں کنگھی کرنے پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ آپس میں ضد بحث رہتی ہے ایک وہ ہوتا ہے۔ ایک تیل ڈالتا ہے۔ ایک کنگھی کرتا ہے۔ تم ہی بتاؤ۔ میں دہلی میں جا کر کیا کروں گا۔ سردی کے دن یہیں گنواؤں گا۔ گرمی تک زندہ رہنا منظور ہوا۔ تو چلا جاؤں گا۔ نظام المشائخ کی تحریر کو تو تم نے خواب شیریں سمجھا۔ اور واحدی صاحب کی سشکر گزار ہوئیں۔ مگر اس خط کو خواب خیال نہ جاننا یہاں واحدی صاحب نہیں ہیں۔ یہاں دروانہ بسلیمہ ہیں۔ جو تمہاری شکر گزاری کی ضرور تمند نہیں معلوم ہوتیں۔ تاہم تمہارے خط کو بہت شوق سے پڑھتی ہیں

---

۱۶۵ بمبئی پریل ۲۱۔ دسمبر ۱۹۱۳ء

مسلمہ کذابہ۔

صاحب من۔ السلام علیکم۔ چار کی ماور مہربان موصول ہوئیں جن سے چار پیدا ہوتی ہیں۔ شکریہ! عجیب پرمذاق طبیعت پائی ہے۔ میں اس کا کیا جواب دیتا۔

لو۔ مدت کے بعد دعا کرتا ہوں۔ کہ خدا تم کو کبھی سفر لاہور راس لائے جیتی رہو۔ ہنستی رہو۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔ پنجابی اثر سے نامراد رہو۔ ابھی یہاں ٹھیرونگا۔

---

۱۶۶ بمبئی پریل ۲۵۔ دسمبر ۱۹۱۳ء

میری بھولی اخباروں سے۔ پیاسی نظاروں سے۔ اکیلی غم خواروں سے۔ محمود و فاطمہ بیزاروں سے۔ ناراض نہ ہونا۔ جو تی بیزاروں کا قافیہ مجبوراً آیا۔ ورنہ کجا تم

تار آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں بیکے بعد تم آؤ! آ۔کور۔کور۔کور۔

---

۴۸۷ بمبئی۔ پریل ۳۱۔ دسمبر ۱۳ء؁۱۹

میری ملکہ میری رانی۔ میری شاگرد۔ میری استانی۔ خدا بخشے تم کو گرم پانی
تم وہاں۔ میں یہاں۔ سینکڑوں کوس کی دوری۔ مگر بی ریل کے قربان جایئے
تیسرے دن زمین کی طنابیں کھینچ کر ملاقات کرا دیتی ہے۔

خط آیا۔ پڑھا لیکن کس وقت؟ یہ نہ پوچھو۔ اس وقت جبکہ ایک بوڑھا جان
توڑ رہا تھا۔ اور ایک دولہا کے سر پر سہرا باندھ رہے تھے۔ ایک طرف یہ۔ دوسری
جانب وہ حیران تھا۔ دنیا کے یہ انقلاب۔ تمہارا خط سامنے آ گیا۔ دردانہ سلیمہ
پاس تھیں۔ بولیں جاتی ہوں۔ رات زیادہ آئی۔ میں نے کہا یہ بوڑھا ۱۳ء؁ آخری ہچکی
لے چکے۔ اور نو خیز سترہ سالے ۱۴ء؁ کے سہرا بندھ چکے تو جانا۔ جواب ملا۔ ہم کو عیسائیوں
کے سنہ سے کیا سروکار۔ مرے یا جئے۔ اللہ رے بغاوت شعار لڑکی کیسی دیدہ دلیر
ہے۔ جن عیسائیوں کا دیا ٹکڑا کھاتی ہے۔ ان کو صلواتیں سناتی ہو بگڑ کر بولیں مرشد
میاں یہ بات ہنسی ہی میں نہ ٹال لیجئے۔ ہم خدا کی دی ہوئی روٹی کھاتے ہیں عیسائیوں کے کیا واسطہ
اس جواب نے میرے منہ سے آفرین و تحسین حاصل کی اور کیوں نہ ہو سچے
جوش اور حرارت ایمانی کا جواب تھا۔ میں اس لڑکی میں عجیب ہونہار پاتا ہوں۔
تم جیسا پاکیزہ لکھتی ہو۔ اور جیسے اعلیٰ خیالات ہنسی ہنسی میں ادا کر جاتی ہو۔ ویسے
ہی یہ لڑکی بولتی ہے اور لکھتی ہے۔

اب گیارہ بجے ہیں۔ مسیحی ۱۳ء؁ ایک گھنٹہ کا مہمان ہے۔ دیکھنا ذرا میرے سینہ
پر ہاتھ رکھنا۔ دل دھڑک رہا ہے۔ ایک عظیم الشان کارگزار ہستی کی فنا پھڑک رہا ہے۔
محمودہ تو کیا سنتی ہے۔ میں تجھ کو اس وقت مخاطب کرتا ہوں جبکہ تین سو ساٹھ

دن بھر مرید معتقد جن میں ہندو پارسی مسلمان۔ عیسائی۔ اور زیادہ تر یہودی عورتیں ہوتی ہیں۔ آتی رہتی ہیں۔ اور دعا تعویذ۔ ذکر خدا۔ اور ہنسی مذاق کے چرچے رہتے ہیں سب سے الگ ہوں جن سے جی بھر گیا تھا۔ سب میں شامل ہوں۔ جن سے جی نہیں بھرا۔ آس پاس انگریزوں کے بنگلے ہیں۔ رات بھر چہچہے قہقہے گانے بجانے رہتے ہیں۔ سامنے چمن ہے۔ کھڑکی سے جھانکتا ہوں تو ہرے بھرے درختوں کو پاتا ہوں۔

یہ تو ہوا۔ مکان کا روزنامچہ۔ اب سنو کھانا۔

خلاف عادت صبح ناشتہ کرتا ہوں۔ تین توس۔ دو تلے ہوئے انڈے۔ پھر ایک بجے کھانا کھاتا ہوں۔ دو توس یا دو چپاتیاں۔ مرچیں بالکل نہیں گھی بہت کم۔ گوشت بہت کم۔ شام کو ساڑھے سات بجے کھانا ہوتا ہے۔ دو توس سالن اور کچھ میوہ۔

صبح چار بجے بیدار ہوتا ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں۔ وظیفہ پڑھتا ہوں۔ سات بجے کمرے سے باہر نکلتا ہوں۔ اس وقت میزبان بھی اپنی نمازوں میں مصروف ہوتے ہیں وہ فارغ ہوئے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ کپڑے پہنے۔ بوٹ چڑھایا۔ اور چہل قدمی کو چل دیا۔ دس بجے واپس آیا۔ ڈاک دیکھی۔ باتیں کیں۔ ساڑھے بارہ بجے کھانا کھایا۔ کچھ دیر ٹھہر کر نماز پڑھی۔ اور سو گیا۔ تین بجے بیدار ہو کر اس دن کے خطوط کے جوابات دیئے۔ عصر کے بعد کسی کے ہمراہ ہوا خوری کو چلا گیا۔ مغرب راستہ میں ہوتی۔ یا میزبان کے ساتھ بائسکوپ گیا۔ مگر یہ مغرب کے بعد۔ کھانا واپس آ کر ساڑھے آٹھ بجے کھلیا۔ یا کھانا کھا کر گئے۔ ناٹک دن کو دیکھتے ہیں اتوار کے روز یہ سب ساڑھے نو بجے کو جاتے ہیں۔ اور میں بیٹھ کر کتاب تین پر ایک نامی لکھتا ہوں۔ اور بارہ بجے سوتا ہوں۔

اب میں عنقریب یہاں سے جانے والا ہوں۔ حیدرآباد و مدراس کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ دلی جاؤں گا۔ واحدی صاحب کا خط آتا ہے۔ مگر میں کم لکھتا ہوں۔ احسان پہنچاتے

ہوں۔ کیونکہ اس میں ہر شہر کا اقتباس روزانہ شائع ہوتا ہے۔

اس سے اندازہ کر سکتی ہو۔ کہ مجھ کو کس قدر تمہاری سردی کا خیال ہوگا۔ مگر سردی تم کو کھانا چاہیے۔ تو میں صرف دور سے کھڑے ہوکر اس سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ گرم نوالہ کو جلدی نہ کھانا چبانے میں مزا آئے گا۔

تمہارے خط کا ذکر کسی سے نہیں آتا۔ مگر اس وقت سیمیہ سے سلام کہد یا تھا اور اتنا مضمون بھی۔ کہ باقاعدہ مریدی کا دستور دریافت کیا ہے۔

کہا مجھ کو خلیفہ بنا دیجے۔ میں ان کو لکھونگی۔ میں نے کہا وہ استانی ہیں۔ عمر میں بڑی ہیں۔ تم کو خلیفہ کب مانیں گی۔

---

۱۵۷ بمبئی ہوٹل ۱۵ محرم سنہ ۱۳۴۳

مسافرہ استانی! سلامت باشند۔

سمندر کے کنارے سیر کر کے واپس آیا۔ بھوک کی شدت تھی میزبانت کھانا مانگتا تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر چند خطوط دیدیئے۔ ان میں جناب عالی اور جناب اکبر کا خط دیکھ کر بھوک بھاگ گئی۔ فوراً پڑھنے بیٹھ گیا۔ ادھر اصرار ہے کہ کھانا ٹھنڈا رہے۔ ادھر انکار ہے بار بار پڑھتا ہوں۔ اور مزے لیتا ہوں۔ آخر میزبان صاحب ناراض ہونے لگے۔ کہ اس خط میں کیا ہے جو آپ کھانا نہیں کھاتے۔ میں نے جناب اکبر کا تازہ شعر سنا دیا جو اس خط میں تھا ؎

حسن نظامی ہیں نیک بیشک مگر نہ کہیے کہ نیک ہی ہیں
لطائف قلب کی نظر سے بھی ان ماننیں ایک ہی ہیں

روز خط لکھو۔ فرصت ہو نہ ہو۔ دو۔ یا سنو۔ تندرست ہو یا بیمار ہو ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں۔ ہم ہر روز ایک اچھا خط مانگتا (یہاں کی بول چال زبان پر آ گئی)

دن کی عمر والا شہسوار سکرات میں مبتلا ہے۔ میری چشم باطن تحت الثریٰ سے فلک اعلیٰ تک ایک ہل چل اور جنبش ملکوتی مشاہدہ کر رہی ہے۔ کون ہے جو آج وہ دیکھے جو میں دیکھتا اور سمجھتا۔ اور لرزتا ہوں۔

کل صبح ۱۳۴۱ھ ہوگا۔ اب میں تم کو اور آدھ سب کو ۱۳۴۱ نہیں لکھوں گا۔ سب ایسا ہی کرینگے۔ اسکو بھول جائینگے۔ یہ زمانہ بہت بے وفا ہے زندگی کے ساتھی ہیں بعد کا کوئی نہیں۔ مسٹر محمد علی کا استقبال دہلی کے اخبارات میں نہیں دیکھا۔ لکھ چکا ہوں کا اخبار پڑھنا چھوڑ دیا۔ پھر ضد کرتی ہو خبر سناؤ۔ کیا سناؤں مجھے کچھ خبر نہیں۔

دہلی سے ایک خط آیا تھا۔ کہ استقبال خوب ہوا۔ اس سے زیادہ نہ میں نے دیکھا نہ سنا۔ نہ مجھے ان لغویات کا شوق ہے جب سفر شام و حجاز سے آیا تھا۔ تو واحدی صاحب نے دھوم دھام کے استقبال کا سامان کیا تھا مگر میں چپ چاپ بے اطلاع رات کے ۲ بجے داخل خانہ ہوگیا۔ واحدی صاحب کو جگایا۔ جنہوں نے آنکھیں مل ملکر دیکھا اور بہت خفا ہوئے کہ اس طرح کیوں آئے۔

بانو! یہ ساری دھوم دھام فضول ہے لہذا میں ان رسموں کو پسند نہیں کرتا۔

مضمون آپ نے پسند کیا۔ اور پسند کیوں نہ ہوتا۔ ہم جانتے ہیں کہ تم سخن فہم ہو شرارت کا ثبوت پوچھتی ہو۔ یہی کافی ہے کہ اس مضمون کی داد دیتے وقت بھی چھیڑ سے باز نہ آئیں۔ تمہاری عمر ماشاءاللہ اب ان شوخیوں کی نہیں ہے۔ بہرحال میں دل سے شکر گذار ہوں کہ تم نے اصل داد دی بس یہی کافی ہے۔ اخبار و جلسہ کو دور سے سلام

دہلی جانا خود کے ایک کام کے لیئے ضروری ہے۔ بمبئی والے راضی نہیں ہوتے اس لئے شاید ابھی چند روز اور ٹھہرنا پڑے گا۔

لاہور کی سردی سن کر حیرت ہوتی ہے۔ یہاں گلابی جاڑا ہے۔ دن کو گرمی رات کو دولائی کی سردی۔ روز صبح انگریزی اخبار میں دہلی و لاہور کی سردی کا حال دریافت کر لینا

۱۹۱۴ء دہلی ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ

محمود و فاطمہ صاحبہ!

تم کو سلام تمہاری شاگردوں کو دعا۔ اور پنجاب کی زبان اور لاہور کی تیز داری کو تین کوسنے۔

میری یہ حالت ہے درگاہ میں رہتا ہوں۔ روٹی کھاتا ہوں پانی پیتا ہوں مگر تاش نہیں کھیلتا۔ اخبار نہیں دیکھتا مضمون نہیں لکھتا خط نہیں لکھتا ہنسنا چھوڑ دیا رونا چھوڑ دیا۔ جب سے سردی کا موسم بدلا ہے۔ روز چاہتا ہوں۔ کہ لحاف کو بدل دوں مگر جی نہیں مانتا۔ اب کے ارادہ ہے کہ گرمی بھر اسکو اوڑھوں گا۔ باقی یہاں خیریت نہیں ہے۔ اور تمہاری خیریت مطلوب نہیں ہے۔

۱۹۱۴ء درگاہ شریف ۴ رمضان ۱۳۳۲ھ

جناب عالی! آداب عرض ہے حسب وعدہ دہلی حاضر ہوا تھا مولوی صاحب کی دکان پر معلوم ہوا کہ حضرت بڑے کامریٹ صاحب کے ہاں ہیں۔ سفرنامہ مولوی صاحب کو دے کر چلا آیا۔

تعمیر درویش خانہ کے سبب فرصت کم ہوتی ہے۔ چاہتا ہوں کہ عید کے عرس سے پہلے کام ختم ہو جائے۔

تم مرنے سے اس قدر کیوں ڈرتی ہو۔ ایک نہ ایک دن مرنا ہے بہتر ہے کہ یہ روز روز کی بیماریاں ختم ہوں۔ قبر میں آرام نصیب ہوگا۔ اگر دنیا کی ہوس باقی ہے تو لو دعائیں دیتا ہوں۔

"الٰہی قیامت کے بورئیے سمیٹیے۔ ساری دنیا مرے اور تم اتنا کام کیا کرو"

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ عجیب خط ہے۔ لاہور سے آزردگی اور پسندیدگی دونوں باتیں جھلکتی ہیں۔

والسلام غریب الوطن

---

۲ مئی | بمبئی | ۱۲ محرم ۱۳۳۲ھ

خدا کے لیے محمود اس پیانو کو، جو سامنے کی کھڑکی میں بج رہا ہے، میرے دکھتے دل کو دکھاتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نیچے باغیچہ۔ اس کے درخت۔ کیلے کی شاخیں۔ ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی ہیں۔ آنکھوں کو اشکباری کے لیے اکسا رہی ہیں۔ سنتی ہو۔ رات ہے۔ تنہائی ہے۔ میز ہے۔ کرسی ہے۔ تمہارا خط ہے سوکھا پان ہے۔ اور میں ہوں۔ لکھ رہا ہوں۔

اشارہ کو سمجھتا تو کہتا۔ کہ یہ سوکھا پان چہ معنی دارد۔ بھیجتے وقت تو ہرا تھا۔ رستہ میں خشک ہو گیا۔ میری ہری ٹہنی کا سوکھا پتہ ہے جان کے تلے بچھا رکھا ہے

پنجابی زبان اثرے دارد۔ چار دن میں سکھ جادیا لکھتی ہو "مجھے دو خط مشکل سے آئے ہیں " دیوانی اسی کو پنجابی کہتے ہیں۔ دلی والی لکھتی تو یوں لکھتی میرے پاس یا مجھ کو دو خط ملے۔ پہنچے وغیرہ وغیرہ۔

تسی کیہڑے دیس سدھاریاں وے مینوں ڈراؤندی آندھیاں وے

ایلو وہ شیر بولا۔ میوزیم پاس ہے۔ رات دن شیر دھاڑتے ہیں۔

لاہور میں وہ سردی کہ تم پارسل بن گئیں۔ بمبئی میں یہ گرمی کہ میں برف پیتا ہوں۔ اور کلیجہ کی آگ بجھاتا ہوں۔

دیکھ لو وں ہم کسی کی تعریف سننی نہیں مانگتا کسی صاحب کے مناقب یہ لکھا کرو اپنی کیفیت کافی ہے۔ چاء کی ایک پیالی بھی لفافہ میں بھیج سکو تو جانیں کہ منتظر خاطر ہو۔ رہا قصۂ خواب بیداری۔ سو میں جیتا تم ہاریں۔ دلہن کو بھی ابھی خط لکھا ہے۔ (مسافر)

سے کر آنکھ ۔ ایک خط بھیجتا ہوں ۔ ان کو بھی ڈرتے ڈرتے میری تلون مزاجی سے اندیشہ ہونے لگا ہے ۔

---

۴۸۶ ۲۴ اپریل سنہ ۱۹۱۴ء

جناب عالی۔ آپ کا خط بہت مشکل سے آیا۔ اور بہت مشکل سے پڑھا گیا۔ بعض لوگوں کو لکھنے کی مشق بڑھتی ہے۔ بعض لوگ اس کو اور گھٹاتے جاتے ہیں۔ میں پھر یہی کہوں گا۔ کہ پنجاب کی آب و ہوا کا اثر ہے۔

واحدی صاحب دہلی میں ہیں۔ اور نیم بیمار۔ احسان صاحب میرٹھ میں ہیں اور پہلی مئی سنہ ۱۴ء سے اخبار نکالنے پر تیار۔ جناب اکبر الہ آباد میں ہیں۔ اور پرسوں میرے پاس آنے کے لیے ریل پر سوار۔ محمود فاطمہ لاہور میں ہیں اور دہلی میں آنے سے بیزار یہ ٹھیک ہے کہ دہلی میں عورتوں کی تعلیم کے لیے بڑے بڑے سامان ہو رہے ہیں۔ بیگم بھوپال اور انگریزی گورنمنٹ دل کھول کر خرچ کرنے کو تیار ہے مگر بوا ! میں تو ان خالی خولی ترقیوں کا قائل نہیں۔ جب تک مذہبی تربیت کا پورا انتظام نہ ہو تعلیم مفید نہ ہوگی۔ لڑکوں نے پڑھا تھا تو کرکٹ کے ڈنڈے بجانے آ گئے۔ لڑکیاں پڑھینگی تو ہٹرونگیاں بن جائینگی۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ ماشاء اللہ نیک ہو۔ نمازی ہو۔ تہجد گزار ہو۔ نفلی روزے رکھتی ہو۔ پنجابی لڑکیوں کی استاد ہو۔ اور یہ سب سے بڑی وجہ نیکی کی ہے۔ کیونکہ دہقانی پنجابیوں کو پڑھانا سب سے بڑی نفس کشی ہے۔ خدا کا شکر ہے میں اچھا ہوں آسمان پر بادلوں کو دیکھتا ہوں۔ چمک اور گرج کو دیکھتا ہوں۔ زمین پر سفید سفید اولوں کو دیکھتا ہوں۔ گراموفون سنتا ہوں۔ جانا آنا بند ہے۔ دور کا سفر تو کجا۔ دہلی بھی مدت سے نہیں گیا۔ سلطان فاطمہ کو دعا کہنا۔ اس کا جی لاہور میں لگا یا نہیں۔

۱۵۵   دہلی   ۱۰ شوال ۱۳۳۲ھ

ماہ بانو سلام   یہ تو میں کیونکر کہوں۔ کہ انتظار کی تکلیف بہت تھی اس درد سر کو صندل سے بھی فائدہ نہیں ہوا۔ مگر کہنا ہی پڑتا ہے۔ خدا مغفرت کرے اس بچہ کی جسکے طفیل طفل دل کو مایوس ہونا پڑا۔ آپ جمعہ کو آتی ہیں مگر میں جمعہ کو گوہانہ ضلع رہتک میں مدعو ہوں۔ ہفتہ کو آئیے۔ اور اسکے بعد ہر دن۔

زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں۔ فیضان کے چھ آنے مجرا دیئے جائینگے ہمیشہ ہرجانہ ہی لکھا۔ کوئی نیا لفظ بھی یاد ہے۔ یا یہی کہیں سے سن کر چرالیا ہے۔

---

۱۵۶   درگاہ شریف   ۹۔ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ

ذی الحجہ کی دسویں مبارک۔ میں شاید کل ایک بجے کی ریل میں دہلی آؤں گا اور چار بجے آپ کے ہاں حاضری دوں گا۔ دیباچہ پہنچا درست کرلوں گا۔ خاصا ہے مگر بیمار ہے۔

باقی زبانی۔ بھتیا احسان صاحب سلام کہتے ہیں۔

---

۱۵۷   دہلی   ۹ اپریل ۱۹۱۴ء

منکہ خواجہ حسن نظامی۔ ابن اوقات ہنگامی۔ ساکن کوچہ بے مقامی۔ پیشہ افسردگی و ناکامی کا ہوں۔ یہ کاغذ بطریق طلب خیریت جناب محمود فاطمہ صاحب استانی تحریر کرتا ہوں۔ تاکہ سند ہو اور وقت ضرورت کے کام آئے۔ مگر آنکہ مجھکو مدت سے جناب استانی صاحبہ کی خبر معلوم نہیں ہوئی۔ نہ عالم بالا کے نوشتوں میں کچھ نظر آیا۔ ورنہ معلوم کرلیتا۔ کہ وہ کب بیمار ہونگی۔ اور کس وقت اہل لاہور انکی تیمارداری میں ہمہ تن مصروف و مشغول ہوں گے۔

ـــــــہ

تم کو دوستیوں کی قطع و برید سے انکار ہو اور میرے گزشتہ خط کی دھجیاں اڑاتی ہو۔ لو دیکھو تم کو دو خط بھیجتا ہوں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ میں آجکل کن میدانوں سے گزر رہا ہوں۔ اور کیسی افسردہ اور کش مکش کی حالت میں ہوں اور خبر نہیں کس طرح تم کو اتنے خط لکھ سکتا ہوں۔

یہ دونوں خط بالکل خانگی ہیں دیکھتے ہی واپس کئے جائیں۔ ان میں ایک خط خان بہادر مولوی اکبر حسین صاحب جج الہ آبادی کا ہے۔ دوسرا واحدی صاحب کا ہے۔ واحدی صاحب کے خط میں چند باتیں غیر متعلق تھیں۔ اس لئے آخری حصہ چاک کر کے بھیجتا ہوں۔

اب تو یقین آیا۔ کہ میں توڑتا ہوں۔ مگر جوڑنے کا ابھی کوئی سامان نہیں کیا۔ جناب اکبر صاحب کا چھوڑنا محال ہے۔ نہ ان کو ایسا ترک کیا۔ جیسا دوسروں کو مگر وہ میرے خط کا مطلب نہ سمجھے۔

ـــــــہ

محمودہ سلام! رات کو نیند کم آتی ہے۔ دس بجے تک صحبت تماشہ۔ پھر پلنگ پر بے حس و حرکت بصورت لاش، اور ساری رات یہی تماشہ۔ صبح پانچ بجے ہوا خوری کی تلاش۔ اس کے بعد فکر معاش۔ گیارہ بجے تک قلم گھسا۔ اور کھانے کو ملی دال ماش۔ اے کاش اے کاش ساری دنیا ہو جائے میری طرح مفلس قلاش۔ ایسی حالت میں کس رند کو پاس بلاؤں۔ ہر ایک سے کہتا ہوں دور باش دور باش۔ اس پر تمہاری چھیڑ خوانی کا نمک ہے اور میرے دل کی قاش۔ زیادہ ستاؤگی تو ہو جائے گا سارا راز فاش۔

۱۵۲ درگاہ شریف ۲۷ اپریل ۱۹۱۴ء

بے پردہ خط پہنچا۔ گرمی کے موسم میں برف نہ پینے والے کو سیراب کیا۔
والدہ صاحبہ لاہور گئیں۔ اچھا کیا دل بہلے گا۔

میں درگاہ میں ہوں اور جناب اکبر الہ آبادی ڈیڑھ ہفتہ سے آئے ہوئے ہیں
اسی وجہ سے خط نہ لکھ سکا تھا۔

واحدی صاحب کون بزرگ ہیں۔ میں ان سے واقف نہیں۔

یہ آصفی جلدی کیوں گھبرا گئے۔ کیا وہاں بھی کوئی حسن نظامی ہیں۔

---

۱۵۳ درگاہ شریف ۳ اگست ۱۹۱۴ء

لونڈی گنہگار را آشکار باد۔ خط پہنچا۔ ناراض نہیں تو راضی بھی نہیں ہوں
مکان دیکھو گی تو معلوم ہوگا کیسا بنایا ہے۔ ذرا آؤ تو سہی جنگل لہلہاتے ہیں۔
مور گانے گاتے ہیں۔ اور بندے پان چباتے ہیں۔

رمضان برسات کے بادلوں کے سبب میرے ہاں نہیں آئے۔ تمہارے
ہاں ہوں تو سلام کہہ دینا۔

یہ خط کامریڈ صاحب کی معرفت بھیجتا ہوں۔ حیدر آباد سے معاملات
خرید و فروخت کے ہو رہے ہیں۔ سطے ہوتے ہی تمہارا پلندہ روانہ کر دیا جائیگا۔

---

۱۵۴ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۴ء

سننے والوں سے دیکھنے والوں نے یہ کہا۔ کہ آج تم کو اسے حسن نظامی
مہمانوں اور عرس سے فراغت ملی۔ آٹھ دن سخت کم فرصتی رہی۔

معلوم نہیں جناب کا مزاج کیسا ہے۔ اور کہاں تشریف فرمائی ہے۔

(۴) دماغ کو آرام تو دوں اور درد سے بچاؤں۔ مگر لوگ آرام لینے نہیں دیتے۔ زمانہ آرام نہیں لینے دیتا۔

(۵) بمبئی کے سفر سے بمبئی والوں کا ستارہ تو کیا چمکے گا۔ یوں کہو۔ نحوست آجائے گی۔ پولس والوں کی جب یورش ہوگی۔ تو دیکھنا بی دردانہ کس قدر گھبراتی ہیں۔

(۶) تمہارے دردسر سے افسوس ہوا۔ بادام پیا کرو۔ یعنی اس کا حریرہ مجھے اس ہی سے آرام ہوتا ہے۔

(۷) میرے عمل تسخیر کی تم مسخر ہوگئیں۔ مگر مسخر چیز ڈرتی نہیں۔ کہنا مانتی ہے تم ڈرتی ہو مگر کہنا نہیں مانتی ہو۔

(۸) یہ غلط ہو کہ تم بے وقوف ہو۔ بڑی ہوشیار اور نشیب و فراز زمانہ سے خبردار ہو جو کچھ کیا تم نے کیا۔ قلم بے چاری کا کیا قصور جو اسے توڑا جاتا تھا۔ دل کو سزا دی ہوتی جس نے گستاخی کی۔

(۹) یہ تم نے میرا خط پہلے الٹا پڑھا پھر سیدھا پڑھا۔ اسکو میں نہیں سمجھا۔ موٹی عقل ہے صاف صاف کہو۔

(۱۰) قلم و دل و زبان کا فلسفہ لاجواب لکھا ہے۔

(۱۱) نہ ملیدہ ہے۔ نہ حلوا۔ نہ جو کی روٹی۔ صرف ایک بات اور ایک پان۔ بس زیادہ آپ کی عنایت۔

(۱۲) بہت اچھا جناب بغیر ٹیکس کے تعویذ تیار کیا جائیگا۔ مگر ذرا مہربانی کرکے بتایئے کہ آپ کون کون سے شرعی و قانونی ٹیکس سے بری ہیں میں بھی تو سنوں۔ دانستہ آید بکار آپ شرح نہ بگاڑیئے مگر شرح بگڑ بھی جائے تب بھی خدا ٹیکس نہ لگائیگا مطمئن رہیئے۔

(۱۳) الٰہی تیری پناہ۔ تم اس قدر قوالی کی رسیا ہو۔ چالیس روپئے خرچ کرکے بسائل کا مقابلہ کیا۔ نہ بی بی عبید اللہ پہ قوالی ختم نہیں ہے۔ اس سے لاکھ درجہ بڑھکر لوگ گانے

خواب کی تعبیر کیا دوں۔ لوگوں نے سوتے میں میری جان کی فکر کی۔ خدا ان کو زندہ سلامت رکھے ان کے خوابوں کو سلامت رکھے اور ان کی آنکھوں کو جو یہ خواب دیکھتی ہیں۔ اُس دل کو جو غریبوں کے بچاؤ کے لیے دھڑکتا ہے۔

بچارے واحدی پر لوگوں کو کیوں رشک آتا ہے۔ اب تو وہ مدتوں نظر بھی نہیں آتے۔ آج پورے تیس دن سے انکی صورت نہیں دیکھی۔ وہ شہ بالا ہوں یا وزیر بالا۔ کان بالا ہوں۔ یا ناک بالا ہیں کیا۔ جب بھی تھے۔

تمہارے ہاں عشرہ ذوالحجہ تھا۔ عشرہ محرم نہ تھا۔ کہ غریب سید کو دو نوالے کھانے کو نہ دیتے۔ یہ ابن حسین سب گھروں کو بلکہ اپنی لڑکی کے گھر کو چھوڑ کر تو اس گھر میں گیا۔ مگر وہاں صرف سبز پان کھلا دیا۔ اور طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر رخصت کر دیا۔

یہ داغ تو قیامت تک رہیگا لاکھ اتار چڑھاؤ کی لچھے دار باتیں لکھو۔ ہاتھی کے گلے میں لا کر عطر سے نہلاؤ۔ لیکن جو ہونا تھا ہو چکا۔ مزاج برہم ہونا تھا ہو گیا۔

مگر خیر منا جاتا ہوں۔ تم جی بھاری نہ کرو۔ میں خود ہی شکوہ کو خیر باد کہے دیتا ہوں۔ خواہ مخواہ نہ پچتاؤ۔ یہ تو میں نے ہنسی سے کہا تھا۔ افوہ تم نے بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس کا ذکر ہی کیا۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

---

۸۷ دہلی ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۴ء

۱۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے خط کا لفظی جواب یہ ہے:-

(۱) خواجہ خضر نے ناؤ ڈبوئی نہیں تھی۔ سوراخ کیا تھا۔ اور عیب دار بنایا تھا۔

(۲) خط اور کتابچے یکجا وصول ہونے کا ذکر جس استعارے میں کیا وہ خوب پسندیدہ ہے۔

(۳) بڑی شریر ہو۔ خوف وغیرہ کی کیا بات تھی۔ خواہ مخواہ کا اندیشہ۔ ہاں تم نے سمجھا ہوگا کہ شاید خط میں کوئی بم رکھا ہو۔

اور سخت پتھر پر سر رکھ کر جنگلوں میں خاک دھول میں سو جاتے تھے۔ اب تو نرم تکیہ درکار ہے۔ نرم بستر درکار ہے۔ نوکر پاؤں نہ دبائے تو نیند نہ آئے۔

حد ہے کہ پاخانہ جانے کے وقت پانی بھی نوکر دے۔ امیروں کی صحبت نے عادت بگاڑ دی ہے۔

کبھی موقعہ ہوا۔ تو تم کو فقیری زمانہ کی جھولی والی تصویر دکھاؤں گا۔ خط میں بھیج دیتا مگر مخفی چیز ہے۔ مولویوں نے پہلے ہی فتووں کی بھر مار کر دی تھی۔ اب کسی کو خبر ہو گئی تو زمین آسمان ایک کر دینگے۔

کیا خبر ہے۔ کہ بمبئی کا سفر ٹل جائے درد انہ کو لکھا ہے۔ کہ وہی دسمبر میں یہاں آجائیں۔ اور مل لیں۔ مجھ خضر کو کیوں بلاتی ہیں دیکھیں گی اور ملیں گی تو رہی سہی عقیدت بھی جاتی رہے گی۔ اگرچہ میری پیری مریدی آزاد بے باک ہے اس لیئے جو ایک دفعہ پھنستا ہے پھر نکلنے کا نام نہیں لیتا۔ دہلی میں ایک تعلیم یافتہ مریدنی ہے۔ ان کے خاوند میرے مخالف ہیں۔ ایک دن وہ دونو موجود تھے۔ میں نے کہا۔ اب تو تم نے بہت دن سے ہم کو نذر نہیں دی۔ ہنس کر بولی آپ کو نذر کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا جیب خالی ہے۔ رات کو تھیٹر ہے۔ ایک پیسہ پاس نہیں۔ تم کچھ دو تو دیکھ آؤں یہ صاف بیانی سنکر خاوند بے چارہ میرے قدموں پر گر پڑا۔ اور بولا میں آپ پر ریاکاری کا الزام لگایا کرتا تھا۔ مگر آج اسکی تردید ہو گئی۔ آپ جو کرتے ہیں صاف علانیہ کھلم کھلا کرتے ہیں۔ میں نے کہا بھائی۔ پیروں سے سر اٹھاؤ۔ اور صندوقچہ کھولکر کچھ نکالو۔ میں تو تماشہ پرست آدمی ہوں۔ میرا کام قدمبوسی سے نہیں چلے گا۔

سو فاطمہ۔ حالت یہ ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ تم زیادہ ذال سے لکھتی ہو۔ درست زے سے ہے۔ والسلام۔

والے ہیں۔ موقع ہوا تو سنوائیں گے۔

(۱۴) رسول نمانمبر میں منظر فراق میرا مضمون پسند نہ آیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ دماغ ٹھوس ہے۔ جو مرزا سلطان احمد کے خشک مضامین پسند کرتی ہو۔

(۱۵) خادمہ کے ساتھ صاحبہ لکھنا۔ یا جو چاہنا۔ لکھنا ہمارا اختیاری فعل ہے کسی کو روکنے کی مجال نہیں۔

(۱۶) میں گھر کا پیر کسی طرح نہیں بن سکتا۔ یہ بہت مشکل مسئلہ ہے۔

(۱۷) خاتمہ۔

۲۶-اکتوبر-۱۲ بجے کے بعد | دہلی | ۱۹۱۴ء

بیرنگ کارڈ آیا۔ پتہ کے رخ پیڈ لکھ دینا۔ اس کا باعث تھا۔ دو پیسے تمہارے کھاتے میں لکھوا دیئے۔ اکٹھا دعوے معہ سود کے ہو جائے گا۔

شہزادی صاحبہ بچاری کو کیوں قبر سے اکھیڑ لیا۔ تم کو مردے زندے کرنے بھی آتے ہیں۔ دیکھو زندگی اس کا نام نہیں۔ وہ کچھ اور چیز ہے۔

مجھ کو اس صورت کے دیکھنے سے بڑھاپے کا خیال آ گیا۔ حالانکہ میں ابھی اس کوچہ سے ناآشنا ہوں۔ اور نہ یہ خیال کر سکتا ہوں کہ اس کا بھیجنے والا بوڑھا ہے۔

اپنی صحت کی نسبت کچھ نہ لکھا۔ اس سے تو ایک پان خط میں رکھ کر بھیج دیتیں جس سے جی خوش ہوتا۔ ان تصویروں میں کیا رکھا ہے۔

یکم نومبر ۱۹۱۴ء | دہلی | ۱۹۱۴ء

بمبئی کا سفر مجھ جیسے آرام طلب کے لیے ایک گونہ مشکل ہے۔ وہ وقت گیا جب جھولی کندھے پر ڈنڈا ہاتھ میں ننگے پاؤں ننگے سر ہاتھ میں تونبی لیے پھرتے تھے

پیارے درگاہ شریف دہلی ۱۹۔نومبر ۱۹۱۴ء

جناب عالی!

گذارش فدوی صادق البیان کی خدمت دروغ نسان میں یہ ہے کہ خط آپکا آیا حال معلوم ہوا۔یہاں پر خیریت ہے۔اور خیر و عافیت آپکی خداوند کریم سے نیک مطلوب دیگر صورت حال یہ ہے۔کہ آپنے پوسٹ کارڈ والی بات کو کیوں ٹال دیا اب جب تک اس کا جواب نہ آئے گا۔یہاں سے بھی کسی امر کا جواب نہ دیا جائے گا۔

دیگر پرسان حال کو سلام کہہ دینا۔اور ہاں دیگر یہ ہے کہ یہاں خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ چھوٹے بڑوں کی نیک چاہتے ہیں۔باقی خیریت ہے۔ہماری کا بھاؤ ضرور لکھنا۔یہاں کوئلے مہنگے ہیں۔زیادہ کیا لکھوں۔اور خط ضرور بھیجنا۔یہ خط میں نے بزرگوں کی تقلید میں لکھا ہے۔ راقم حسن نظامی عفی لہ وعفی عنہ

پیارے دہلی لال کنواں ۱۷۔جنوری ۱۹۱۵ء

محمودہ سلام

اس خط نے مجھ کو بہت زیر بار کیا۔میں آپکی محبت و مہربانی کا ہمیشہ معترف ہوں۔اور کٹرہ شیخ چاند کا خیال حصول رمل و انگریزی کے خیال سے ہے چاہتا ہوں کہ چند روز علیحدہ رہ کر تھوڑی سی انگریزی اور تھوڑا سا نجوم و رمل سیکھ لوں۔

بڑھاپا دوڑا چلا آتا ہے۔مرتے وقت یہی چیزیں کام آتی ہیں فرشتوں کی زبان بھی سنا ہے۔انگریزی ہے۔ان سے بات کرنی ہوگی۔اور رمل کے ذریعے معلوم کرونگا کہ موت کب آئے گی۔

پیارے دہلی لال کنواں ۱۷۔جنوری ۱۹۱۵ء

جناب ماہ بانو صاحبہ۔السلام علیکم۔امور خانہ داری صرف کھانے پینے اور

۱۲۶

میں دیکھتا ہوں۔ کہ تم (میری رائے کے موافق) دہلی میں بہترین اردو لکھنے والی عورت ہو۔ تمہاری تحریر میں تدبر اور رکھ رکھاؤ کی سنجیدگی کے باوجود بلا کی شوخی ہوتی ہے۔ تم عورتوں ہی کے حالات پر نہیں مردوں کی نسبت بھی معقول بحث کر سکتی ہو۔ مگر مشکل یہ ہے۔ کہ تم نے قرآن و حدیث کے چرچوں میں تربیت پائی ہے۔ تم رات دن نماز و وظائف میں مصروف رہتی ہو۔ جب نئی روشنی کی عورتوں پر کچھ لکھنے کی اور تم سے پوچھنے کی ضرورت پڑے گی تو تم اس پر کیا لکھ سکوگی۔ کیونکہ تم کو تو اس کی واقفیت ہی نہیں۔

اگرچہ میں فخر کرتا ہوں۔ کہ پرانے ادب آداب اور پابندی مذہب رکھنے والے گروہ میں تم جیسی لائق عورت خدا نے پیدا کی لیکن نئی روشنی کی آزاد عورتوں کی اصلاح اور تربیت کے خیالات سے بھی تم کو واقف ہونا چاہیئے۔

تم اسکی پرواہ نہ کرو۔ کہ آج تک تم نے اخباروں میں نہیں لکھا۔ کچھ ڈر نہیں۔ دو چار مضامین شائع ہوتے ہی تمہاری یہ جھجک نکل جائیگی۔ اور ہندوستان کو تمہاری قابلیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔

---

۱۲۷ درگاہ شریف دہلی ۱۳ر نومبر ۱۹۱۴ء

بخار بانو! سلام

کل کا خط بھیجا نہ تھا۔ کہ آج پوسٹ کارڈ آیا۔ جسپر ایک چڑیل بیچاکی مورت ہے میں اسکو دیکھکر ڈر گیا۔

تمہارے بخار کی خبر سے تشویش ہوئی۔ میری طرح تم بھی ذرا سنبھلیں۔ اور کام کرنے لگیں یہ ٹھیک نہیں کچھ دن آرام کرنا مناسب ہے۔

تنبیہ کی۔ میں سامنے ہوتا تو نانی سے کہہ کر تمہیں بھی پٹواتا۔
میں تو اسکی محبت سے بہت خوش ہوا تھا۔ حور بانو کبھی مجکو نہیں بھولتی اور میں اسکا
آرزومند رہتا ہوں۔ بچوں کو ایسا ہی ملنسار ہونا چاہیئے نہ کہ تم بھائی بہنوں کی طرح اکھل کھرے

---

۷۵۶ — ۱۰۔ فروری ۱۹۱۵ء

بانو! مفلسی کا یہ عالم کہ کل کارڈ لفافے تک نہ تھے۔ آج لہر بہر ہے۔
سردی جوں جوں بڑھتی ہے۔ تمہارا فکر میرے دل میں ترقی کرتا ہے۔ چند دن
کی بات ہے۔ خدا نے چاہا۔ جلدی موسم بدل جائے گا۔

---

۷۵۷ — درگاہ شریف — ۱۴۔ فروری ۱۹۱۵ء

سلام علیکم۔ عرس میں حال دیکھنے آؤ گی۔ تو کہیں حال میں نہ آجانا۔ میرا حال
تو ان ایام میں بے حال ہوتا ہے۔ نہ کھانا۔ نہ سونا۔ نہ ہوش۔ نہ حواس ہر وقت
خلقت کا ہجوم آس پاس۔

---

۷۵۸ — درگاہ شریف — ۱۷۔ فروری ۱۹۱۵ء

چاہ خانم صاحبہ!
پٹھانوں سے خدا بچائے۔ ان کے سب ملک والے چار خورے ہیں۔
بہت اچھا آپ کا مرثیہ زندگانی ہی میں لکھونگا۔ اور یہ تو معنی نہیں کہ میرا
ارادہ خود عورتوں پر ایک کتاب لکھنے کا ہے۔ مگر ایسی کہ سب سے نرالی ہو مجھے مشورہ
تمہارا درکار ہوگا۔ مگر وہ کیونکر ہو۔ محال نظر آتا ہے۔ ذرا ہم کو دلا سا دو۔ پان بہت
یاد آتا ہے۔

شادی غمی ہی کو نہیں کہتے اس میں مستورات کے تمام حقوق شامل ہیں۔ انکی تعلیم وتربیت ان کے بچوں کی نگہداشت میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات کنبہ داروں اور دوست احباب سے میل جول غرض زندگانی کے تمام لوازمات خانہ داری کے لفظ میں شریک ہیں۔

تم کو معلوم ہوگا دہلی سے اخبار خطیب ثانی نکلا ہے۔ جو مذہب وتمدن وسیاست کے معاملات پر بحث کرنی چاہتا ہو اسکے ایک پرچے کی ترتیب کا میں نے وعدہ کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس پرچے کو بطور نمونہ کے مرتب کروں۔ اور کارکنان خطیب کو بتاؤں کہ میں خطیب کو اس روش پر دیکھنا چاہتا ہوں۔

اس پرچے کے حصہ معاشرت کا عنوان میں نے خانہ داری مقرر کیا ہے اسپر لکھنے کو میں کسی عورت سے کم نہیں ہوں۔ مگر پھر بھی گھر والے ہی گھر کے حال کو اچھی طرح جان سکتے ہیں۔ باہر کی زندگی بسر کرنے والے مردوں کو ٹھیک اندازہ مستورات کے جذبات اور ان کے طرز عمل کا نہیں ہو سکتا۔

اس واسطے میں تم کو یہ خط لکھتا ہوں جسکے سامنے خالی جگہ چھوڑدی ہے تاکہ تم اس پر جواب لکھو۔

اس وقت میں تم سے صرف دو سوال کرنے چاہتا ہوں۔ ایک عورتوں کی تعلیم کے بارے میں دوسرا بچوں کی تربیت کے متعلق۔

اس خط کے لکھتے وقت میرے خیالات کے سامنے تمہاری شخصیت مختلف حیثیتوں سے آرہی ہے

---

۸۲ دہلی لال کنواں ۱۷ جنوری ۱۹۱۵ء

صاحب سلامت۔

رات کے خط میں سلطان فاطمہ کی نسبت یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ تم نے اسکو

میری مسواک کرے۔ میرے تولئے سے منہ پوچھے۔ میرے گلاس میں پانی پیئے میرے پاخانے میں جائے۔ غسل خانہ میں نہائے۔ میری قلم دوات سے لکھے۔

غرض میری ہر چیز خاص ہے۔ جو اس کے خلاف کرتا ہے۔ مجھہ کو تکلیف پہنچاتا ہے اور فوراً دوسرے مکان میں منتقل کیا جاتا ہے۔

جب یہ سنا کہ وہ صاحب میری مسہری پر لیٹے۔ تو میں نے نوکروں پر تنبیہ کی وہ صاحب بگڑے اور خفا ہوکر چلے گئے۔

چلے جائیں۔ میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ جب آپ کو دیکھا تھا تو ان کو وہاں جانا مناسب نہ تھا۔ اندھے نہ تھے جو گھسے چلے گئے۔

یہ بہت مشہور آدمی ہیں۔ مگر تمیز خاک نہیں۔

ہاں! وہ کون فقیر تھا۔ جو میرے نام سے رضائی لے گیا۔ میں مانگتا تو شاید تم ایک پیسہ بھی نہ دیتیں۔ اچھا ہوا۔ تمہارا نقصان ہوا۔

---

۴۸۶ درگاہ شریف ۱۸۔ مئی ۱۹۱۵ء

جناب عالی!

گذارش خدمت میں یہ ہے۔ کہ پروانہ گرامی بر شمع قلب صادر شد و سوخت واز سوختگی خود شعلہ منور را قتل کرد۔

محبت بار بار ذکر کراتی ہے۔ حدیث ہے۔ من احب شیئاً اکثر ذکرہ جس سے تعلق ہوتا ہے۔ اسکا ذکر بار بار آتا ہے۔ مگر شاید خط کسی کو نہیں دکھایا۔

صاحب سعید کے ابا کا فوٹو حاضر ہوگا۔ اس دن کی بات یاد ہے اچھا۔ اگر چٹکیوں سے بیزار ہے۔ تو آج سے بند۔ اب خیطیت خالی ہوگا معلوم ہوتا ہے۔ چپکلی سے بہت دوستی ہے۔ ہمایوں کے مقبرہ کی بات سچ ہے۔ برسات میں ایک چھوٹا سا سیلا ہوتا ہے۔ جو عربوں کا

۱۵۶ درگاہ شریف ۱۸۔فروری ۱۹۱۵ء

محمود وہ سلام علیکم۔

خط پہنچا۔ حقہ تو میں نے مدت ہوئی چھوڑ دیا۔ بائسکوپ سرودی نے چھڑا دی
پان رہ گیا تھا۔ جو دل کا ارمان تھا۔ لوگ (یعنی مرید) اپنے ہاتھ سے گلوریاں منہ
میں دیتے تھے اور اسپر فخر کیا جاتا تھا۔ یعنی وہ مرید نہایت مقرب مشہور ہوتا تھا
جو اپنے ہاتھ سے پان کھلا دے۔ افسوس وہ بھی ترک ہوا۔
مگر تم دوا خور کو پان چھوڑنا مناسب نہیں۔ دل کی بیمار ہو۔ خدا تم سے بچائے۔

---

۱۵۷ درگاہ شریف یکم اپریل ۱۹۱۵ء

سلام علیکم۔

بھی نہیں خفگی کی کوئی بات نہیں بے پر کے لفظ سے جی دکھا تھا۔ کیونکہ خلاف واقعہ
تھا۔ جھوٹ سے نفرت ہے۔ اور اسی کا ملزم بنایا جاؤں تو نہایت کوفت ہوتی ہے۔

---

۱۵۸ درگاہ شریف ۲۷ اپریل ۱۹۱۵ء

شکر خدا۔ کہ خط ملا۔ خدا جلدی صحت دے۔ مقبول بندے ہمیشہ مبتلائے آزار رہتے ہیں
نظام الدین آؤ۔ ابھی تو موسم پھر غنیمت ہے۔ جب دوزخ کی آگ برسنے لگیگی
اس وقت آئیں تو جنت حرام ہو جائے گی۔ جس دن ارادہ ہو لکھو۔

---

۱۵۹ درگاہ شریف ۷ مئی ۱۹۱۵ء

ان صاحب نے غلطی کی جو وہاں چلے گئے اس کے علاوہ انکو میری مسہری
میں بیٹھنے کا حق نہ تھا میں اس شخص سے بیزار ہو جاتا ہوں جو میرے پلنگ پر سوئے۔

رات دن دعائیں مانگتا ہوں خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہوں۔ کہ تم اچھی ہو جاؤ۔ اور پھر مجھ کو خط لکھو۔ تم اس خط کو پڑھوا کر سننا۔ ڈاکٹر اقبال کا بھی ایک خط ملفوف ہے۔ مہ بانو بھی تمہارا مزاج پوچھتی ہے۔ اماں کو سلام۔

اجمیر شریف ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء

میری بیمار محمودہ خدا تم کو تندرستی دے۔

خط آیا۔ تم ہراسانہ ہو۔ خدا میں سب قدرت ہے۔ وہ ٹوٹی کو جوڑ دیتا ہے یا پوسول کو نوازدیتا ہے۔ اس کو ہر بات پر قدرت ہے۔ میرے گڑگڑانے اور عاجزی سے دعائیں کرنے سے اسکو ضرور رحم آئیگا۔ اور تم اچھی ہو جاؤگی اور اپنے ہاتھ سے مجھ کو خط لکھوگی۔ میں غالباً ۸ دن بعد دہلی آجاؤں گا۔ مولوی صاحب اور والدہ صاحبہ کو سلام۔ بھائیوں کو دعا۔ سلطان فاطمہ کو پیار۔

محمودہ فاطمہ ماہ بانو کے خطوط کا

(مختصر نمونہ)

۸۔ جولائی ۱۹۱۴ء روز شب برات

ماہ بانو کے مہربان سلامت باشند۔

سلام مسنون۔ مزاج مبارک۔ مہربانی نامہ ملا۔ آنجناب کی خیریت پڑھکر نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ خطاب نامہ پڑھا۔ وفائی سنگ وفادار اور رین بسیرا اور بھتیانے من پڑھ کر بے اختیار ہنسی آئی۔ لیکن اپنے خطاب ماہ بانو کے ساتھ معلمہ لاہور وغیرہ کے الفاظ پڑھکر افسوس ہوا۔ مجھے اس لفظ سے از حد نفرت ہے۔ احسان بھیا کا لقب نہایت ہی بھلا معلوم ہوا۔ مجھ کو اگر ایسا ہی ملتا تو ٹھیک تھا کیونکہ اس عمدہ لقب

میلہ مشہور ہے۔ ہماری بستی کی گنواریاں بھی جایا کرتی ہیں۔ مگر کچھ بہت بڑا نہیں ہوتا
پردہ کا انتظام رہتا ہے اس دن مرد نہیں آ سکتے۔ پھر اسپر اعتراض کیا ہو سکتا ہے۔

[illegible] درگاہ شریف ۱۳ جولائی ۱۹۱۵ء

ماہ باز صاحب۔ سلام۔

دہلی سے واپس ہو کر خط ملا۔ دیکھ کر جی بے قرار ہو گیا۔ بیشک فنا اور خاتمہ کا ایک وقت مقرر ہے۔ مگر تم مایوس نہ ہو۔ خدا نہ کرے کہ دشمن مدعیوں کی ایسی بیسی ہو! تمہارا مرض ایسا نہیں ہے۔ جس سے جانبری نہ ہو سکے۔ چند روز تکلیف سہے جاتی رہے گی۔

خیریت نامہ لکھ نہ سکو تو کسی سے لکھوا کر بھجواؤ۔ جب تک خط نہ آئے گا فکر رہے گی۔ والدہ صاحبہ اور مولانا کو سلام۔

[illegible] درگاہ شریف ۳۱ جولائی ۱۹۱۵ء

باز۔ السلام علیکم۔

تمہارے خط نے از حد مضمحل کر دیا۔ کم بخت کیا مرض ہے۔ جس نے اس قدر سر اٹھایا ہے۔ میں عید سے دو روز پہلے دہلی آؤنگا۔ تو اسوقت زبانی سب حالت سنوں گا۔

[illegible] درگاہ شریف ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء

میری مریضہ؛ خدا تم کو تندرستی دے۔

میں چاہتا ہوں کہ بار بار تمہارے پاس آؤں۔ مگر بیمار خانہ میں جاکر جہاں تم جیسی عزیزہ صاحب فراش ہو۔ میرا جی قابو میں نہیں رہ سکتا۔ اسواسطے نہیں آیا۔

نمبر ۷۵۶   از دفتر اخبار ہمدرد و کامریڈ   ۱۲ راپریل ۱۹۱۵ء

جناب مہربان خواجہ صاحب۔

سلام علیکم۔ لیجئے میں آپ کی خواہش کے موافق اخباری چمن میں آگئی مسٹر محمد علی نے
اپنی صاحبزادیوں کی تعلیم کے لیے آخرکار مجھ منکرہ کو راضی کر ہی لیا۔ کئی دن سے یہاں
ہی ہوں۔ ہر طرح کا آرام ہے کسی طرح کی تکلیف نہیں۔ گھر کے مرد عورت نوکر چاکر وغیرہ
سب بیحد خاطر کرتے ہیں۔ بیوی میاں بہت خلیق اور نیک مزاج ہیں۔ مجھ کو اس طرح رکھتے
ہیں جیسے دلہن کو اللہ آمین کرکے رکھا جاتا ہے۔ ہر بات کو مسٹر محمد علی کی بیوی خود آکر پوچھتی
ہیں۔ لڑکیاں از حمد اللہ آمین سنا رہی ہیں حکم پر چلتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ کہ ان کے پاس سے ہٹنے کو
جی نہیں چاہتا۔ بظاہر تو اس خاطرداری سے جی لگا ہوا ہے۔ مگر باطن میں ویران ہے۔ خدا کی شان ہے۔
رہنے کو ایک بڑا کمرہ عمدہ ضروری چیزوں سے آراستہ دیدیا ہے۔ ایک بڑا کمرہ تعلیم کے لیئے اسکے برابر ہی ہے
سب میں بجلی کی روشنی اور پنکھے ہیں۔ جو رات دن چلتے ہیں۔ الگ خاموش رہنے سے خوش
ہوں یہ سب کہتے ہیں کہ ذرا باہر آؤ۔ ادہر جاؤ۔ دل بہلاؤ۔ مگر مجکو تو گوشہ تنہائی پسند ہے
اس طرح رہتی ہوں جیسے اگلے زمانہ میں مائیوں بیٹھتے تھے۔ تعلیم بھی آسان ہے دو لڑکیوں
کی ہے۔ قرآن شریف پڑھ چکی ہیں اردو لکھنا پڑھنا تھوڑا بہت آتا ہے سات بجے سے نو بجے
تک استاد پڑھاتا ہے۔ اس کے بعد نو بجے سے گیارہ بجے تک میں۔ تیسرے پہر ڈیڑھ گھنٹہ میرا
جس میں سلائی بھی آگئی اور دو گھنٹے استاد کے۔ غرضیکہ زیادہ مغززنی نہیں کرنی پڑتی۔ استاد
نے تو کوئی قاعدہ نہیں رکھا تھا۔ نہ اپنا کچھ رعب میں انگریزی قاعدہ کے موافق تعلیم دیتی ہوں
اس لیئے نہ انکو گراں معلوم ہوتا ہے نہ مجکو دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے۔ آپکے نزدیک یہ سلسلہ
اچھا ہے یا برا۔ میں نے ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی۔

دنیا سب کچھ نہیں کیوں سب کچھ ہے۔ مگر اسی وقت تک کہ ہم اسمیں ہیں جدا ہونے کی امید ہے
مایوس ہوں ہمارے دشمن۔ والسلام۔   راقمہ اخبار ہمدرد کا ایک پردہ محمودہ

ماہ بانو کے لائق تو میں ہوں نہیں۔ خیر جو حضور کی مرضی۔

راقم ماہ بانوئے بے نور و داغدار۔

۱۶؍ جولائی ۱۹۱۴ء

جناب مہربان خواجہ صاحب

تسلیم۔ مزاج مبارک۔ مہربانی نامہ عین انتظار میں ملا۔ کتابیں کیا پڑھوں میرا دماغ اس قابل نہیں رہا جس کا مجھ کو بے حد افسوس ہے اور اس کا بڑا بھاری ارمان میرے ساتھ جائے گا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ چور چوری سے جائیگا۔ تو کیا ہیرا پھیری سے بھی جائے گا۔ گو دماغ اس لائق نہیں رہا لیکن کتب بینی کا سودا تو نکلنے کا نہیں۔ سینے آپکی کتابوں میں سے ایک عیدی پڑھی دوسری مضامین خواجہ مگر یہ پوری نہیں پڑھی جو مضمون پسند آیا پڑھ لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے مزار پر جو التجا کی ہے اسکو خوب ہنس ہنس کر پڑھا۔ اسوقت تو آپ میں زلیخا کی روح آگئی تھی۔ آپ کی کتابیں میں اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ اور پڑھنے کی نیت سے رکھتی ہوں لاہور اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اور اب بھی پاس ہی رکھی ہیں۔ جب میرے پاس رکھی رہتی ہیں تو مجھے صبر رہتا ہے جبوقت دل چاہا۔ دو چار سطریں یا ورق دو ورق پڑھ لیے۔ دیکھنا یہ نشانی کی کتابیں ایک دن بطور نشانی چھوڑ جاؤنگی۔ آپکو سکان کی تعمیر کا فکر ہے لیکن مکانکو بنوا کر کیا کیجئے گا۔ بیفائدہ ہو۔ بس ایک گوشہ کافی ہے۔ مکان کی عورتوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ مردوں کو کیا چاہیے۔ خاصکر آپ کو تو بالکل نہیں کیونکہ تارک دنیا درویش ہو۔

جس مضمون کے چاک کر دینے کا ارشاد ہوا ہے۔ اسکی تعمیل دشوار ہو میں کسی لکھی ہوئے کاغذ کو چاک کرنا نہیں چاہتی کیونکہ وہ دست نقاش کا نشان ہو۔ ہم خاکی پتلوں کی طرح۔

راقمہ ایک پیر اہن بوش ہستی محمودہ فاطمہ

اُوپر کا لفافہ

نامی مسلمانوں کے خطوط کا

یعنے

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا خبر تھی۔ دو پیسہ والے لفافوں اور پیسے والے کارڈوں کو جب وہ لال رنگ کے صندوق میں ڈالے گئے تھے۔ کہ ان کے اندر اردو زبان کا میگزین بھرا ہوا ہے لیٹر بکس کے اندر جا کر انھوں نے لالہ سلارمل کی چٹھیوں کا جمگھٹا دیکھا جن میں گیہوں باجرے اور گھی کا بھاؤ لکھا ہوا تھا۔ یا سیٹھ قاسم بھائی ہارون جی کا ایک لفافہ تھا جسپر یہ پتہ درج تھا

بمبئی ۔ پاؤں دھونی کے سامنے جی جی بائی کی چال میں تیسرے
مالے پر اسمال جوزف کمپنی کے ڈاوین بازو عبد الحسین آدم بھائی کو دینا۔

یہ کارڈ لفافے صندوق الخطوط کی برادری میں مجبوراً چلے تو گئے۔ مگر دل ہی دل میں ڈاک خانہ والوں پر دانت پیستے تھے۔ کہ ان پیسہ پرستوں نے گھوڑے گدھے کو ایک جگہ باندھ رکھا ہے۔

ان کاغذی پتلوں کو اگرچہ اپنی شان معلوم نہ تھی نہ ہو۔ ان کے اندر کی شوخیاں

لاہور ہو الکل یا معین

اتالیق خطوط نویسی

حصہ دوم

یعنی

نامی مسلمانوں کے خطوط

مرتبہ

جناب لیلیٰ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

اسپر انہوں نے بڑی خوشی ظاہر کی۔ اور کہا ہلو ہلو اردو۔ ہم مسرور ہیں کہ تم نے انگریزی تاج کی سرپرستی میں اتنی ترقی کرلی ہے ہم تم دونوں ایک ہیں۔ بیشک تم ہندوستان کے چوٹی کے نامی و شہرۂ آفاق اردو ادیبوں کی نشانیاں ہیں۔ جتنا فخر کرو کم ہے۔

(۲)

چاندنی چوک دہلی میں منشی غلام نظام الدین صاحب کتب فروش اپنی شاندار دوکان میں میلا سا درویشانہ کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ دریبہ کے سارے بازار میں جو کتاب میسر نہ آتی تو لوگ ان کے پاس آتے کہ ان کے ہاں ہر فن کی نایاب کتابوں کا میل رہتا ہے۔

کیوں جناب اردو خطوط نویسی کی کوئی کتاب ہے۔ جس کو دیکھ کر نئے زمانہ کی شائستہ خط و کتابت آجائے۔ اور جن کو اردو آتی ہو وہ اس سے زبان کے چٹخارے لیں۔

منشی صاحب، جی ہاں۔ یوں تو بہتری کتابیں ہیں۔ مگر غالب کے اور آزاد مرحوم کے مکتوبات میں وہی بات ہے۔ جسکو آپ چاہتے ہیں۔

ذرا دکھائیے!

لینی ہو تو دکھاؤں خواہ مخواہ حیران نہ کیجیے؟

اجی حضرت دکھائیے تو سہی۔ آپ تو پہلے ہی سے حجتیں کرتے ہیں۔

حجت سچی ہے دیکھنے والے فضول وقت ضائع کرتے ہیں۔ شوق تو اچھی اردو کا اور جب قیمت سنتے ہیں تو چونک پڑتے ہیں۔ کہ اتنی سی کتاب کے اتنے زیادہ دام۔ انگریزوں کو دیکھو۔ دو پیسہ لاگت والی کتاب دو روپے دیکر لیتے ہیں۔ جبکہ ان کو مصنف اور تصنیف کی خوبی معلوم ہو جائے۔ ہمارے ہندوستانی بھائی زبانی اشتیاق میں تو آندھی۔ ٹکے خرچنے کا وقت آئے۔ تو تیوری چڑھاتے ہیں۔ کہ اتنی قیمت کیوں رکھی۔

میاں مضمون کا مول ہوتا ہے۔ محنت کی قدر دانی ہوتی ہے۔ ہیرے اور بلور کی شکل یکساں ہے۔ قیمت یکساں نہیں ہے۔

خود بخود ان کے جگر میں چٹکیاں لیتی تھیں اور ہستی اوپر کو اُبلی چلی آتی تھی۔

لیٹر بکس کے ایک کونہ میں کچھ۔ انگریزی لکھے ہوئے لفافے بھی پڑے تھے انہوں نے جو اردو کے ان کارڈ لفافوں کو دیکھا۔ کہ بانکے ترچھے تیوروں سے اپنے پڑوسیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ تو غرا کر بولے۔ یہ کیا تمکنت ہے۔ سر نیچا کر کے بیٹھو۔ اس گھر میں سب برابر ہیں۔ باہر نکلو گے۔ مکتوب الیہ کے پاس جاؤ گے تو فخر کر لینا۔

یہ سنکر اردو کے ایک لفافہ نے اپنے ساتھیوں کو غور سے دیکھا۔ کہ کون کون موجود ہیں۔ تو معلوم ہوا۔ کہ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا کارڈ ہے مولانا شبلی کا لفافہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد کا مکتوب ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کا لیٹر ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا صحیفہ ہے حکیم نورالدین خلیفہ مرزا صاحب کا نامہ ہے اور نواب محسن الملک اور مولانا حالی کے خطوط ہیں تو وہ نامور ہمراہیوں کی پشتی کے بھروسہ پر کڑک کر انگریزی ہندی گجراتی زبان کے خطوط سے دو بدو ہونے لگا۔ اور کہا:۔

خاموش میں شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ کا نوشتہ ہوں۔ جو اردو لکھنے کی مشین تھے۔ جنہوں نے بڑی بڑی علمی کتابیں لکھی ہیں۔ جب ہم نے اس مکان میں غلط اردو اور جوار باجرے کے خط دیکھے۔ تو اس ناجنس صحبت سے جی گھبرایا۔ تم کو ہماری طبیعت میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ تم کو تو ہم نے کچھ نہیں کہا۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ تم ہم سے زیادہ عزت والے ہو۔ مگر ہندوستان میں جو عام قبولیت ہم کو ہے وہ تم کو نصیب نہیں ہماری انگریزی سرکار نے بھی اپنے دفتروں میں ہمیں ہی جاری کیا ہوا۔ اس ملک میں کروڑوں آدمیوں کی ہم مادری زبان ہیں۔ کمدوں ہم کو سمجھتے ہیں۔ کروڑوں میں ہمارا راج ہے۔ ذرا آگے بڑھ کر دیکھو تو سہی کس آن بان کی چٹک دار اردو ہمارے اندر درج ہے

یہ سنکر انگریزی خطوط آگے بڑھے اور ان خطوط کو پڑھا تو حیران رہ گئے۔ ظرافت کی شان نرالی۔ متانت کی ادا انوکھی۔ اظہار حال کا طریقہ جداگانہ۔

انگریزوں پر خیال کرو۔ ان کے ہاں سب سے پہلے مصنف کے دوست احباب کتاب خریدتے ہیں اور اسکو دوستی کا حق سمجھتے ہیں۔ اسی واسطے انگریزی زبان مالامال ہے اور اردو مفلس قلاش۔

(۴۳)

خدا کی مار اس نئی روشنی کو ہر چیز کو بدلے دیتی ہے گفتار کو اس نے بدلا۔ رفتار کو اس نے بدلا۔ دستار اس کے ہاتھوں تبدیل ہوئی۔ کردار کی کوئی کل اس نامراد نے سیدھی نہ رکھی۔

خط و کتابت ہی کو دیکھو۔ نہ وہ پہلا سا لمبا کاغذ ہے نہ تیز روشن سیاہی ہے۔ نہ چوبی قلم ہیں۔ نہ القاب نہ آداب۔

جس کو دیکھو نئے زمانہ کی ریس میں مختصر دو سطریں لکھتا ہے۔ خط کیا لکھتا ہے سر سے بلا ٹالتا ہے۔ نہ خیریت کی خبر نہ عافیت کی اطلاع۔ نہ بڑے کی حرمت نہ چھوٹے کا رکھ رکھاؤ۔ جو قلم کے منہ میں آیا۔ بکتے چلے گئے۔

یہ اگرچہ دل دکھانے والی بات ہے مگر انصاف سے دیکھو تو اس میں آرام بھی بہت ہے۔ پہلے زمانہ میں خط و کتابت کی اتنی کثرت کہاں تھی۔ اب تو گیا گزرا شخص بھی دو چار خط روز لکھتا ہے۔ اور دو چار خط اس کے نام آتے ہیں۔ القاب آداب اور عبارت کی اونچ پنچ کو دیکھے یا اپنا مطلب ادا کرے۔ ضرورتیں بڑھ گئیں۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ اب تو ہر کام میں پھرتی اور صفائی ہونی چاہیئے۔ خط بھی وہ اچھا جس سے لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کو آسانی ہو۔ اگلے وقتوں میں خط کا آدھا حصہ القاب و آداب اور رسمی تکلفات میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اور آدھے میں اصلی مطلب آتا تھا وہ بھی پیچیدہ رنگین عبارت کے سبب سمجھ سے ادھورا رہ جاتا تھا۔

خدا بخشے غالب و آزاد کو اور ان کے بعد سید احمد خان۔ حالی۔ نذیر احمد خاں و نواب محسن الملک کو انہوں نے اردو خطوط نویسی میں نئی چال ڈال دی اور مطلب ادا کرنے کے طریقے بتا گئے۔

آپ نے تو ایک لیکچر دے ڈالا۔ ہمیں کتاب دیجیے۔
لیجیے۔ دیکھیے۔
دام تو آپ نے واقعی زیادہ کہے۔ شرر کے ناول بھی اتنے مہنگے نہیں ہیں۔
جائیے! جائیے میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا۔ کہ آپ مغز خالی کرنے آئے ہیں میں ایک بات کے سوا دوسری بات نہیں جانتا۔
اچھا خیر دیدیجیے خفا نہ ہوجیے۔
بھائی یہ بڑے سلجھے ہوئے کتاب فروش ہیں۔ ان کی روکھی باتوں پر نہ جانا معاملے کے کھرے۔ بات کے پکے پرانی وضعداریوں کی زندہ نشانی ہیں۔
ہم کو موقعہ نہ ملا ورنہ ان کی باتیں سنتے۔ بڑی سمجھ کی گفتگو کرتے ہیں۔ الفاظ سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ مطلب بہت گہرا ہوتا ہے۔
انھوں نے سچ کہا۔ ہمپر اپنے اردو علم ادب کی قدر فرض ہے بیہودہ باتوں میں سینکڑوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ تھوڑا سا اپنی زبان کی ترقی سرمایہ میں خرچ کر دیا کریں۔ تو کتابیں شائع کرنے والوں کی ہمت بڑھے اور چند روز میں اردو زبان علمی ذخیرہ سے مالامال ہو جائے اب خط وکتابت کی ضرورتوں کے لیے اچھی کتابیں صرف دو ملیں۔ ملک میں اردو لکھنے والوں کا گھاٹا نہیں ہے۔ قدر ہوتی تو اسی مضمون کی سینکڑوں کتابیں تیار ہو جاتیں۔
حالت تو ہماری یہ ہے کہ ایک شخص کوئی کتاب لکھتا ہے۔ ہزاروں پریشانیوں سے روپیہ فراہم کرکے اس کو چھپواتا ہے لیکن جب بکری کا وقت آتا ہے تو سب سے پہلے اس شخص کے دوستوں کی یورش ہوتی ہے کہ ہم کو بلا قیمت کتاب ملنی چاہیے۔ دی تو ایک آدھ ورق دیکھ کر کسی کونہ میں ڈالدی۔ نہ دی۔ تو بگڑ گئے۔ دوستی قطع ہوگئی جگہ جگہ شکوے ہونے لگے۔ میاں کو دو حرف لکھنے کیا آگئے ہیں۔ طوطہ چشم بن گئے۔ ایک پُلّی کی کتاب میں بھی بخیلی کی اور آنکھ چرا گئے۔

زا بھاکڑا بھی نہ ہو کچھ کام کی باتیں بتاتا ہو۔ آزردی نہ ہو۔ آمد کے جواہر بکھیرتا ہو۔ مل گئی تو جو قیمت ہوگی دوں گا۔ اور اسکو لوں گا۔

(۵)

امریکہ کا راک فیلر سٹی کے تیل کا بادشاہ۔ بمبئی کا ٹاٹا لوہے کا بادشاہ ہم مسلمان جو ہندوستان میں رہتے ہیں۔ حرفوں اور لفظوں کے بادشاہ۔

ذرا دیکھنا ہمارے اخباروں کو۔ کاغذی کالم، لشکری کالم نظر آتے ہیں۔ حرفوں کی یورش ہوتی ہے۔ الفاظ گولہ باری کرتے ہیں۔ اور ہمسایہ قوموں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم بڑے ہی جنگ جو۔ اور لڑاکو ہیں۔ حقیقت پر غور کرو۔ تو صفر۔ سوائے اس کے کہ ہماری شاعری نے باتونی بنا دیا ہے۔ معشوق کو بھی سیدان حرب کا سپہدار تصور کرتے ہیں۔ بیچارے خاک کے پتلے کی آنکھیں تیر۔ بھویں کمان۔ پلکیں برچھی دکھائی دیتی ہیں۔ عالم خیال میں وہ محبوب ہر وقت خنجر سے قتل کرتا رہتا ہے۔

یہ ادبی حرب و ضرب الفاظ تک محدود ہے اور خدا کرے یہیں تک محدود رہے کیونکہ امن بڑی چیز ہے۔

آج کل کے زمانہ میں مسٹر محمد علی۔ مسٹر ظفر علی۔ ابوالکلام صاحب آزاد۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب اور مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی اردو کے بے مثل ادیب ہیں علامہ شبلی رحلت کر گئے وہ بھی اسی زمرہ میں تھے۔

مسٹر محمد علی کو ادیبان اردو میں شریک کرنا کچھ زیادہ درست نہیں ہے کیونکہ وہ انگریزی زبان کے دیسی ادیب ہیں لیکن ذکر گرماگرم اردو کا ہے۔ جس کے الفاظ رزمگاہ کی گولہ باری کی طرح گرجا کرتے ہیں۔ مسٹر محمد علی نے ہمدرد جاری کرکے تھوڑا بہت اس کوچہ کا استحقاق بھی حاصل کر لیا ہے۔

مسٹر ظفر علی پنجابی ہیں۔ مگر اردو شیخ عبدالقادر کے برابر لکھتے ہیں نثر کی بجھ لکھنے

غالب اور آزاد تو اس فن کے قدرتی استاد تھے۔ خط کیا لکھتے تھے۔ بولتی ہوئی زبان لفافہ میں بند کر کے بھیج دیتے تھے۔

اب اردو زبان دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ زبانوں سے میل جول کر رہی ہے نئے نئے خیالات نئی نئی ترکیبیں اسکو سوجھ رہی ہیں اسپر بھی خطوط نویسی میں پرانی لکیر کے فقیر رہے۔ تو سارا زمانہ اس کے منہ پر تھوکے گا۔

(۴)

کیسی بوجھل کتاب تھی ہاتھ تھک گیا۔ تو زانو پر رکھی۔ وہ بھی شل ہو گیا تو لیٹ گیا سینے پر رکھ کر پڑھنے لگا۔ دل گھٹنے لگا۔ سانس رک رک کر آنے لگا تو غصہ میں آکر میں نے اسکو فرش پر دے مارا۔ کتاب ہے یا کوہ ہمالیہ یا نئے زمانہ کی قلعہ شکن توپ کا گولہ۔ میں باز آیا ایسے علمی شوق سے مجھکو تو ہلکی کتاب چاہیئے جس کا وزن بھی ہلکا ہو اور مضمون بھی ہلکا۔ بعض لوگ اپنی کتابوں میں وہ موٹے موٹے الفاظ لکھتے ہیں۔ کہ مجھ جیسی موٹی سمجھ والا بھی مطلب نکالنے سے ہانپ جاتا ہے۔

اردو زبان سیکھنے کا شوق ہے۔ اسی کی خاطر یہ قومی ہیکل کتابیں لایا ہوں ایک صاحب کہتے تھے سادہ سیکھنی ہو۔ تو نامی انشا پردازوں کی کتابیں پڑھو۔ ناول تو دیکھ لیئے۔ اب تاریخ کا شوق ہوا تھا۔ مگر اس کتاب کا تو پنڈا بھی موٹا اور بات بھی موٹی۔

چاہتا ہوں خط و کتابت کی کوئی کتاب پڑھوں۔ ایسی کتاب ہو جس میں فرضی خط نہ ہوں یعنی کسی مصنف نے لوگوں کی تعلیم کے لیئے ان کو تصنیف نہ کیا ہو۔ بلکہ اس میں اصلی تحریریں ہوں۔ اس میں یہ فائدہ ہو کہ لکھنے والے کی مختلف حالتوں کی تصویر ہوتی ہے اور پڑھنے والے کی مختلف حالتوں میں علیحدہ علیحدہ اثر کرتی ہے اور اسکو فائدہ پہنچاتی ہے۔

خدا کرے کوئی ایسی کتاب مل جائے جس کا لکھنے والا بھی مشہور ہو۔ زبان بھی مستند اور صاف لکھتا ہو۔ آسان لکھتا ہو۔ خشک ملا نہ ہو۔ کچھ چٹخارے بھی لینے جانتا ہو۔

میں صرف اکبر کو اس نعمت کے لئے منتخب کیا ہے۔

(۶)

مدت سے میری خواہش تھی کہ نامورانِ ہند کے اردو خطوط کا مجموعہ یکجا شائع ہو تاکہ باہمی تحریروں کے ملا کر دیکھنے سے ایک دوسرے کی روش تحریر کا فرق معلوم ہو اور جو تجربہ جس طبیعت کو پسند آئے اسی کی تقلید کرنے لگے یا ان سے الگ اپنے واسطے لکھنے کا راستہ پیدا کیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اردو قیامت تک آگے نہ بڑھے گی۔

اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہتا تھا۔ کہ رہنمایانِ ادب اردو کے وہ جذبات جو خانگی خط و کتابت میں مخفی ہیں۔ انکی سطح عام پر نمائش ہو جس سے ان کے مقلدین خط و کتابت کے طریقوں میں بھی ان کا نشان تقلید حاصل کر سکیں۔

میرے پاس ان مشہور و معروف حضرات کے خانگی خطوط عرصہ دراز سے رکھے تھے کئی بار چاہا کہ ان کو شائع کر دوں۔ مگر یہ خیال مانع رہا کہ چونکہ ان خطوط کا خطاب میری ذات سے ہے ایسا نہ ہو کہ اسکو خودنمائی پر محمول کیا [illegible] کئی دفعہ اس قصد کو ملتوی کر دیا

آخر اب میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اس ذخیرہ ادب کو چھانٹ کر ضرور شائع کر دیا جائے ایسی کتاب کی خلقت کو بہت ضرورت ہے کیونکہ اب نئے نئے تعلیم یافتہ نوجوان بھی انگریزی میں خط و کتابت کو فخر نہیں سمجھتے۔ اور اردو نامہ نویسی پر متوجہ ہو گئے ہیں۔ اور ان کی سمجھ میں آگیا ہے کہ اپنی زبان میں خطوط کا لکھنا پڑھنا قومی حیات کے لازمات میں ہے۔

میں نے انبار خطوط کو بہت مختصر کر دیا ہے جن میں کوئی ادبی خوبی نظر آئی۔ ان ہی کو لیا۔ باقی کو قلمزد کر دیا۔

اسپر بھی بعض خطوط میں ایسے الفاظ رہ گئے ہیں جن میں میری تعریف ہو گئی جگہ تو میں نے ان فقروں کو کاٹ دیا ہے لیکن بعض مقامات پر اس قطع و برید سے مطلب خبط ہو جانے کا ڈر تھا۔ اسواسطے اسکو اسی طرح چھوڑ دیا ہے۔

ہیں وہ مرزا حیرت دہلوی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ مرزا حیرت صاف اور عامیانہ زبان لکھتے ہیں۔ ظفر علی عربی چادر منہ پر ڈال کر حریف سے پنجہ کرتے ہیں کبھی کو یہ پسند ہے کسی کو وہ۔

ڈاکٹر اقبال سلیس اردو پر قادر نہیں ہیں۔ مگر جذبات کو متحرک مضطرب کر دینے کی ان کو بڑی قدرت ہو حیات انسانی کی مختلف شاخوں پر جس خوبی سے وہ لکھتے ہیں اور جو سوز کی تاثیر پیدا کر سکتے ہیں اور کسی میں یہ بات کم پائی جائے گی۔

مولانا ابو الکلام آزاد کا درجہ انشا پردازی سوائے اکبر الہ آبادی کے اپنے عہد کے سب ادیبوں سے بڑھا ہوا ہے۔ تقریر تحریر کے یکساں قادر الکلام ہیں مشکل نویسی اور اردو لغات جدیدہ کی ایجاد ان کا موضوع زندگی ہو اور انسان کی جبلت اور وقت کے احساس کو جتنا وہ سمجھ سکتے ہیں۔ غالباً بہت کم لوگوں کو یہ نعمت نصیب ہوگی۔

علامہ شبلی مورخ تھے۔ مبالغہ کی نگینی سے ان کا قلم محفوظ تھا تاہم سادہ نگاری میں بھی ایسی دبی ہوئی شوخیاں لکھہ جاتے تھے کہ انسان گھنٹوں مزے لیا کرے۔

حضرت اکبر الہ آبادی ادبیان دور حاضرہ کے سرتاج ہیں۔ انکی ہر ادا خود ایجاد ہو ہر بندش بولتی ہوئی تصویر معانی و بہزاد ہو انکی تحریر مختصر ہوتی ہو مگر اپنے اندر جذبات کے سمندر اور واقعات کے آسمان زمین رکھتی ہو اسپر جدت۔ انوکھا پن۔ ذہن افگنی۔ عام فہمی کے جوہروں سے لبالب۔

ان کی شاعری ایسی اثردار ہے جس کا قبضہ ہندو مسلمانوں کے دلوں پر یکساں پایا جاتا ہے۔ بچہ بچہ کی زبان پر ان کے اشعار ہیں لطف یہ ہو کہ جنکی مذمت میں شعر ہوتا ہو وہی اسکو جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ اسکی وجہ صاف ہو۔ کہ جناب اکبر اخلاص سے لکھتے ہیں اور بغض و عناد سے تو اپنے کلام کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ یہ بات ہر شخص کو میسر نہیں ہو۔ خدا کی دین ہے۔ جسکو چاہے دے۔ اور خدا نے اس زمانہ کے اردو ادیبوں

لیکن وضاحت و تشریح کے قابل جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور
حکیم نورالدین صاحب اور شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ صاحب کے خطوط ہیں۔ ان کو علیحدہ
اس واسطے رکھا گیا ہے کہ یہ سب ایک مخصوص مضمون کے ہیں۔

مولانا ذکاء اللہ صاحب سے میں نے دریافت کیا تھا کہ آپ نے حضرت محبوب الٰہیؒ
کی کوئی کرامات دیکھی ہے یا نہیں۔ یہ خط اس سوال کا جواب ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی، مرزا صاحب
قادیانی، حکیم نورالدین، اور ابوالکلام صاحب کے خطوط کو تصور کرنا چاہیے کہ یہ سب
ایک مخصوص سوال کے جواب میں ہیں۔ ان کو درج کرنے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ
ناظرین ان مشہور و معروف حضرات کا نمونہ تحریر دیکھ سکیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے
خیالات صوفیائے کرام کے متعلق عیاں ہو جائیں۔

اس تمہید کے بعد ناظرین خطوط کو پڑھیں [illegible] تقدیم و تاخیر ادب کے
لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ میرے عقیدے میں اول درجہ جناب اکبر کے خطوط کا ہے اس لیے
وہ سب سے اول ہیں اسکے بعد ابوالکلام صاحب پھر علامہ شبلی، اور اسکے بعد ڈاکٹر اقبال،

خدا نے توفیق اور حضرت اکبر نے اجازت دی تو "خطوط اکبر" کا مجموعہ جب شائع کرنے
کا ذکر اوپر آیا ہے۔ اس مجموعہ سے [illegible] اسکو جلد چھپوا دوں گا۔

قدیمی لحاظ و غیرت کا رواج یہ ظاہر کرنے سے مجھ کو نہیں روک سکتا کہ یہ مجموعہ
میری اہلیہ "لیلیٰ بنت العرب" اور میری لڑکی "حور بانو" کی محنت اور
کوشش سے مرتب ہوا ہے جنہوں نے پرانے خطوط کے انبارستان سے انکو چھانٹا اور
شائع کرانے کا اصرار کیا۔ لہذا میں انکی محنت کی قدر دانی کے طور پر یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں

والسلام۔ حسن نظامی "دین بسیرا" دہلی

ناظرین کو چاہیے کہ وہ حسن نظامی کی ذات نہیں۔ بلکہ کاتب کے ایک فرضی مخاطب کا خیال کر کے یہ عبارتیں پڑھیں۔ اور ان سے لٹریری مقصد کے علاوہ کوئی غرض نہ لیں

ڈاکٹر اقبال مولانا ابوالکلام۔ علامہ شبلی کے خطوط زیادہ تھے۔ میں نے ان میں سے نصف سے بھی کم لیے ہیں۔ کیونکہ بعض مکتوب بالکل پرائیویٹ تھے۔ اور بعض میں کوئی ایسی ادبی بات نہ تھی جس سے پبلک کو تعلق ہوتا۔

حتی الوسع زیر اشاعت خطوط کے وہ فقرے کاٹ دیے ہیں جن کا شائع ہونا مرسلین خطوط کے خلاف سمجھا گیا۔ اور اپنی دانست میں وہی حصے شائع کیے ہیں جن میں کچھ مضائقہ کی بات نہ پائی۔ اس واسطے ان حضرات کی اجازت کے بغیر ان کو شائع کرنے میں حرج نہیں دیکھتا۔

حضرت اکبر الہ آبادی کے چند خطوط محض نمونہ ادب کے خیال سے اس مجموعہ میں شائع کر دیے گئے ہیں۔ ورنہ ان کا مجموعہ علیحدہ اور مستقل کتاب کی حیثیت میں شائع ہوگا کیونکہ جناب ممدوح کے تقریباً ایک ہزار خطوط میرے پاس جمع ہیں جنمیں ہر خط کلیات اکبر کی ایک نظم کا ہم پلہ ہے اور جن سے حضرت اکبر کی افتاد زندگی کے جداگانہ حصوں کی حالت نمایاں ہوتی ہے میں نے ایک کوشش اور کی ہے کہ ہر شخص کا ایک مکتوب خاص لکھنے والے کے قلم کا درج کرایا ہے یعنی اصل رقم تحریر کا عکس دیا ہے تاکہ دستخط اور روش تحریر کتاب پڑھنے والا اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔

یہ بات ہمارے ملک میں تو کچھ دلچسپی کی نہیں سمجھی جائے گی۔ یورپ میں خلقت اسپر جان دیتی ہے اور مصنفوں کی دستخطی تحریریں لاکھوں روپیہ میں فروخت ہوتی ہیں۔

(۷)

کتاب کے آخر میں نواب محسن الملک کے دو خط بھی درج کر دیے ہیں جن سے انکی انشاپردازی کا نمونہ معلوم ہو سکتا ہے اور مولانا حالی کے ایک خط کا چربہ بھی ہے۔

تو ہذیان سے پریشانی دو دن سے سارے بدن میں درد کی سخت شکایت ہے اور ایک انگلی کو بھی جنبش دینے کی طاقت نہیں ہے کروٹ بدلنا ہفت خواں رستم طے کرنا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں زیادہ چت نہ لیٹیں صرف گردن پھرتی ہے اور جرعہ جرعہ چمچے سے دوا) لیتے ہیں آج دو چار چمچے دودھ کے پیئے ہیں جس میں پانی ملا تھا۔ ڈاکٹر نیا نسخہ لکھ گئے ہیں حکیم صاحب نبض دیکھ کر اور ہوش کی باتیں سنکر کہتے ہیں۔ کہ جسمانی ضعف ہے لیکن روحانی یا اندرونی قوت میں کچھ کمی نہیں ہے آپ کی ہمدردی اگرچہ نیچرل ہے۔ پھر بھی شکر گذار ہوں۔ دعا کیے جایئے۔ ہاشم نے کل قریباً یہ الفاظ کہے جس کا مصرعہ بن گیا۔

میرے مالک مرے مولا مجھے اچھا کر دو

جی گئے تو اس مصرعے کی تصنیف کے دعویدار ہیں۔ اکبر حسین

---

۴۸۹ الہ آباد۔ ۳ار جون ۱۹۱۳ء

مکرمی۔ کارڈ پہنچا۔ بیشک نازک وقت ہے۔ اور آپ میرے پاس ہوتے تو اچھا ہوتا۔ آپ شریک غم ہیں۔ اور اہل دل۔ میرے تمام خیالات اور فلسفے پر ہنوز شدت الم غالب ہے سینہ میں الجھن دماغ میں گرمی محسوس ہوتی ہے۔ بہت کم روتا ہوں لیکن دل ہر وقت بھرا ہوا اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہیں۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہاشم کے بدلے ہاشم آفرین کا تصور کر کے اس سے فریاد کروں۔ مدد چاہوں لیکن وہ بھولی صورت اور پیاری آواز چشم و گوش پر ہنوز محیط ہے پھر اس بچے کے ارمان اسکی بے بسی اس کا اللہ اللہ کرتا رہنا نازکو چھوڑ کر اس چودھویں سال کی عمر میں بے کسانہ اور عاجزانہ فریاد پر آجانا معاذ اللہ ان باتوں کی یادوں پر بجلیاں گراتی ہیں۔ میں تو اس کا مذہبی فلسفہ تلاش کرتا ہوں۔ یا قرآن و حدیث سے کوئی توضیح تاکہ دل کو فی الجملہ تسکین ہو۔ وہ لڑکا میری طبیعت کے سانچے میں ڈھل سا رہا تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اسکے معانی پر پیشتر سے غور کر کے ان حوادثات کے لیئے تیار نہ رہتا۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ کون تیار رہتا ہے انا للہ کا مطلب

عکس دستخط خان بہادر مولانا سید اکبر حسین صاحب جج الہ آبادی

۱۱-۱-۱۷

مربی پرور سلامت - ارادت دلی - کوی عنایت نامہ آپ کا نہیں پہونچا
خوشی ہوی کہ آپ اچھے ہیں خدا اچھا رکھے " اب کوی صورت آنے کی
نظر نہیں آتی " اس سے بہت مایوسی ہوی ہاشم کے بہت سے مضمون
آ نہو سا ہر گیر ا سکتا ہوں بہت گھبراتا ہوں کہ کیا کروں کی تعطیل میں
جو رہا تو دعا

اکبر خاکسار

الہ آباد

۸ر نومبر ۱۹۱۲ء

کرمی دل یہی کہتا ہے کہ خاموش ہو رہو۔ مجھکو کوئی دلچسپی دنیا سے نہیں رہی
تو برسوں سے نہ تھی۔ شاید چالیس برس سے، البتہ ضرورت اسکی تھی تاکہ فراغ خاطر
حاصل رہے۔ اب اسباب فراغ خاطر اس قدر کم ہو گئے ہیں۔ کہ دنیا کچھ موافقت کرے بھی تو
کیا لیکن وہ موافقت کیوں کرنے لگی۔ اور اب تو وہ اس حالت میں ہے کہ صاحب بصیرت کو
دوسرا کل ہونا بالکل نا ممکن ہے آپ کا خط پڑھکر اور حضور کی علالت کا حال سنکر دل چاہا کہ
فوراً اٹھوں اور دلی چلا آؤں لیکن ہاشم کو کیا کروں پہلے ہاشم نے کہا میں بھی چلونگا پھر
کہا میں تو پیچھے چکا ہوں۔ آپ جائیگا تو میں تین دن پر پانواں چلا جاؤنگا جہاں انکی
بھانج ہیں۔ دیکھئے کیا ہو سکتا ہے۔ خط لکھونگا۔

اکبر حسین

الہ آباد ۳۰ر مئی ۱۹۱۳ء

کل طبیعت پھر بگڑ گئی۔ ایک جمعہ دودھ بھی نہیں پیا۔ ہوش کی باتیں امید افزا نہیں

۱۸۶ الہ آباد ۳-اگست ۱۹۱۴ء

پیارے خواجہ صاحب اللہ تعالیٰ خوش اور تندرست رکھے۔ رات کو ایک خط لکھ چکا ہوں یہ کیا معلوم کہ جو لکھنا تھا سب لکھ دیا۔ قلم کے ساتھ نہیں تو اوائے مطلب ہو اکثر یہی ہوتا ہے کہ قلم کہیں اور ہم کہیں بار بار حواس کو مجتمع کرنا ہوتا ہے پھر کیا سلسلہ قائم ہو کیا بیان مدعا کی تکمیل ہو۔ اکثر یہ ہوا ہے۔ جوش ولے کہا۔ یا اللہ ایک سکنڈ میں دل ہی کے جواب سنا۔ کہو کیا کہنا ہے۔ اب بالکل بھول گئے۔ کیوں پکارا تھا۔ کیا گذارش کریں سبحان اللہ سجدہ کہہ کہہ گئے۔ انتشار طبع کی باتیں ہیں لیکن دفع غم کے لئے ہی یہ حالت کسی قدر نافع ہے ؂

دل ہی کو غم نہیں کہ ہوا مبتلائے غم
غم بھی بلا نہیں ہے کہ ہوا مبتلائے دل

اس وقت مزاج پرسی کا کارڈ پہنچا۔ روحانی قوت کا باعث ہوا غش تو نہیں آیا لیکن خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ تبخیر نے دماغ کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔ خیر اب تو ترک صوم ہے اگرچہ اس کا افسوس ہے یعنی کیوں دماغ ایسا کمزور ہو گیا کہ تبخیر کا تحمل نہیں کر سکتا۔ جان کیونکر اتنی قوی ہے کہ غم دل شکنی کا تحمل کر رہی ہے۔ زندگی ہے۔ تو ستمبر اکتوبر میں امید ملاقات ہے حضرت احسان الحق صاحب اسوۂ حسنہ کے لئے مضمون مانگتے ہیں۔ کچھ لکھ دوں گا۔ خاکسار اکبر

---

۱۸۷ الہ آباد ۱۲ ۱۹۱۵ء

الطاف فرمانے من! یہاں بارش نہیں ہوئی۔ شدت گرمی سے بے حواس ہوں آج سال کا سب سے زیادہ بڑا گرم دن ہے۔ ہم تک بارش پہنچ گئی تو قیاس ہو سکے گا کہ کیسی تھی۔ لیکن کیا طرح سنئے! ۱۵ - ۲۰ دن سے دانتوں کے درد میں مبتلا ہوں۔ یہ موسم اور برف کیسی سادہ پانی ایذا دیتا ہے۔ سخن سازی سے قطع نظر سخن بازی کر رہا ہوں۔ اللہ جلد آرام عطا فرما کھانے پینے کا افسوس نہیں ہے۔ نماز و قرآن میں انتشار سے انتشار ہوتا ہے۔ اللہ اس عقیدے کو خوش رکھے کہ تکلیف سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ میری جمع پونجی تو یہی ہے۔ خط کا جواب

یہ ہے۔ کہ میں بھی خدا کے لیئے لڑکا بھی خدا کے لیے میں سمجھتا تھا لڑکا میرے لیئے۔
بہر کیف دعا فرمایئے۔ کہ طبیعت کو جلد سکون ہو جائے اور بعد ازاں بشرطِ زندگی توجہ
الی اللہ کی لذت ملے۔ خاکسار اکبر حسین

[illegible] ۱۳ مئی ۱۹۱۴ء

مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ گرمی جمعیت حواس کی روادار نہیں اور خط لکھنے کے لیئے
میں اسی کا منتظر تھا۔ بہت کچھ کہنا کیا دیکھا کیا سنا کیسی گذری لیکن طبیعت بجا نہیں
ادہر آپ کو انتظار ہوگا۔ لہذا اسوقت صرف مہمان نوازی کا شکر ادا کرتا ہوں۔ تولیا جو ہدیہ
مرحمت فرمایا۔ اسکو بزرگانِ اولیاء پاک و ولی پاکی کے حق میں نیک شگون لیتا ہوں خدا تم کو
میری یاد دلاتے رہیئے۔ عزیزان کو دعا۔ محمد صادق صاحب کو تسلیم۔ بی چاندکا شکریہ خوش مزاجی
و خلوص خدمت۔ خاکسار اکبر

[illegible] الہ آباد ۲۶ مئی ۱۹۱۴ء

قدر افزائی اکبر سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی خیریت نہیں سنی۔ آپ کیسے ہیں گرمی کی کچھ حد نہیں۔ ہوا نہ ہو تو پنکھیاں
کیا کریں۔ اور بھی احتباس ہو جاتا ہے۔ ولایتی پنکھا اسوجہ سے نہیں لگاتا کہ طبیعت اور
بھی حساس ہو جائیگی لیکن آج بمجبوری کہہ دیا کہ بندوبست کیا جائے۔ دوپہر سے پانچ
چھ بجے تک کباب ہو جاتا ہوں۔ نیچر کو مزا آتا ہوگا۔ جو خدا کی مرضی۔
کچھ اشعار آپ کو بھیجنا چاہتا ہوں لیکن حواس درست ہوں تو لکھوں۔ مختصر کارڈ
بھی باہمی چٹھی کی میں نے شاید زیادہ شکایت کی بیجز گنجی کے کوئی عیب نہیں امید ہے کہ
دریا سے جون کے آپکو مطول خط لکھ سکوں۔ آپ تو اجمیر شریف کی تیاریوں میں ہونگے
کب جایئے گا کب واپس تشریف لایئے گا۔ احتمال ہے کہ شاید پیچھے آپ یہاں نہ ہوں۔

(اکبر حسین)

کو لئے ہوئے سامنے آ گئے۔ افسوس کہ تم ڈاکٹری علاج سے متنفر ہو۔ بہر کیف جلد اچھے ہو اور خدا کرے کہ کانفرنس میں آ کر ملو۔ سفر بنگالہ کا اس سے بہتر پھر موقع ہاتھ نہ آئیگا۔
وسط جنوری سے ایک مستقل اخبار میری ایڈیٹری میں کلکتہ سے نکلیگا "دار السلطنت"
میری دلی خواہش ہے کہ اسکے پہلے نمبر میں تمہارا ایک دلآویز مضمون ہو۔ خدا نہ کرے کہ تمہاری علالت امید پاری میں حارج ہو۔

میں نے دہلی میں تمہارا شام تک انتظار کیا۔ اور پھر مایوس ہو کر روانہ ہو گیا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

لودیہ — بنگلہ حافظ حلیم صاحب کانپور — ۲۷ راکتوبر ۱۹۰۹ء

بھائی نظامی! عرصہ کے بعد تم ملے۔ اور پچھلی پر از خلوص و بے تکلفانہ صحبتیں یاد آ گئیں مگر جھوٹ کا عادی نہیں۔ سچ یہ ہے کہ باوجود میرے مکرر سہ کرر اصرار کے تمہارا ایکدن کے لیے بھی نہ ٹھہرنا مجھے سخت گراں گذرا، یہ انکار اس لئے تو نہیں تھا۔ کہ ایک عقیدت کیش کی صحبت تھی، اور میری بے تکلفیاں خوف دلاتی تھیں۔ کہ کہیں کوئی مضر اثر نہ پڑے؟ اگر ایسا خیال ہو تو بے جا بھی نہیں۔ کلکتے اور بمبئی میں خود مجھ کو اپنے احباب بے تکلف سے کبھی کبھی ایسا خوف ہو جاتا ہے مگر چند گھنٹوں کی صحبت میں اتنا تو تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ان اندیشوں کی وجہ وگی میں میرا اسلوک کیسا ہوتا ہے؟ ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے کسی قدر متضاد و مختلف ہوں۔ خود میں گلیم و زہد اور قبائے رندی کو ایک ہی وقت میں اوڑھنے پہننے کا مجرم ہوں پس اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے، کہ ہم اپنے ایک دوست سے جو سلوک میخانہ کی چھت پر کریں۔ اسی کا مستحق اسے سجادہ خانقاہ پر بھی سمجھیں۔

اسکی طرف سے تو مطمئن رہو، اور مجھے تم اپنا سچا خیر خواہ اعزاز طلب اور دوست سمجھو

کل یا پرسوں لکھوں گا۔ اسوقت جمعیت حواس دشوار ہے آپ نے خوب کیا سفر دکن ملتوی رکھا شب برات کا لحاظ ضرور تھا۔ غیر زندوں کی آپ نہ سنئے مردوں کی مروت ضرور تھی، لڑکوں کو دعائیں، بڈھوں کو تسلیم۔ سب سے التماس دعا۔ اکبر

۷۸ـ الہ آباد ۳۰۔ اگست ۱۹۱۵ء

ڈیر خواجہ صاحب

میں کیا کہوں بدن پر کیا گزر رہی ہے۔ دل پر کیا گزر رہی ہے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ مگر شدت غیرت نے سب کو خاموش کر دیا ہے ذہن کو نہیں، بلکہ زبان قلم کو، وہ زبان قلم نہیں جو خیالات کو نوٹ کر لیتی ہے۔ بلکہ وہ زبان قلم جو چل کر اڈیٹران تک پہنچتی ہے رات جب تجہیز کی شدت تھی۔ جیسا قریباً ہر شب کو ہوا کرتا ہے۔ ذہن جو غافل نہ تھا یہ شعر کہا

ہو سخن کا جب اثر ظاہر تو روک اپنی زبان
شعلہ زن ہو جائے جب آتش تو پھر کیوں پھونکئے (اکبر)

نوٹ حضرت اکبر کے مکتوبات کے ان خطوط کا اقتباس کیا گیا ہے جنمیں انکے مرحوم صاحبزادے ہاشم میاں کی علالت و وفات کا ذکر ہے۔ اور جن سے جذبات غم و الم کا اظہار ہوتا ہے لہذا ان خطوط میں حضرت اکبر کے لٹریچر کی مخصوص ظرافت و لطافت تلاش نہ کرنی چاہیئے۔ اسکی وہ موج وتمام اس مجموعہ کبیر میں ہوگی۔ جو عنقریب علیحدہ شائع ہوگا۔ (حسن نظامی)

مولانا ابوالکلام صاحب کے مکتوب

۷۹ـ ۱۱۔ کولوٹولہ سٹریٹ کلکتہ۔ ۸۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء

بھائی نظامی۔ کیا حال ہے؟ وکیل نے عدالت کی خبر سنائی۔ اور تم اپنے ضعیف جثہ

جتنے صفحے قلم سے نکلے انہیں کو غنیمت سمجھ کر بھیجدینا مناسب نظر آیا۔ تین دن کے بعد پھر کچھ مہلت ملی۔ تو باقی مضمون مرتب کیا، اور وہ بھی خواجہ صاحب کے نام کلکتہ بھیجدیا۔ حیرت ہو کہ ابتک صرف پہلی قسط کیوں بھیجی گئی۔ بہرکیف اگر ضائع ہو گیا ہے، تو اب نہ اتنی مہلت ہی کہ پھر لکھوں۔ اور نہ اس میں اتنی اہمیت ہو کہ دوبارہ وقت صرف کیا جائے۔ یہ بھی خواجہ صاحب کا اصرار تھا۔ کہ سرمد کے حالات لکھے ورنہ تاریخ کے سینکڑوں ارباب اجتہاد و تجدید شکوہ سنج بے التفاتی ہیں۔ انہیں چھوڑ کر سرمد وغیرہ پر کون وقت ضائع کرے۔ یاد فرمائی کا شکریہ،

ابوالکلام آزاد دہلوی

کلنگا بازار اسٹریٹ کلکتہ - ۱۰ - جون ۱۹۱۰ء

لیجے

یہ متصل خاموشی کیوں ہ؟ کہئے تو سرمد کا بقیہ مضمون لکھ بھیجوں، بمبئی سے آتے ہوئے سرمد یاد آگئے تھے۔ انکی رباعیات کا دیوان ساتھ لے لیا تھا۔ جب نظر پڑ جاتی ہے تو خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو قلمبند کر کے بھیجدوں۔

علامہ علم الدین لاہجی ثم الفنجابی دہلی میں آپ سے ملے نہیں معلوم کیسی گزری۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

---

۸۹ کلنگا بازار سٹریٹ کلکتہ۔ ۱۵۔ جون ۱۹۱۰ء

لیجے

بھئی، اصل بات یہ ہو کہ میں عدیم الفرصت بہت ہوں، اپنے ذاتی اشغال کے علاوہ چند کام ایسے سر پڑ گئے ہیں، کہ ایک گھنٹہ بھی فرصت کا نصیب نہیں ہوتا۔

چند تفصیلی مضامین بعض اہم معاملات کے متعلق ہیں کہ بہت جلد شائع ہو جانے چاہئیں انکی بھی فکر ہ۔ ان سب پر طرہ اخبار جو ۱۵ رجب سے شائع ہو جائیگا پھر اپنی بعض تالیفات جنکو مکمل کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ جو ندگی عنقریب شروع ہونے والی ہ۔ وہ اسکو مہلت

جیساکہ برسوں سے باہم سمجھا گئے ہیں۔ مگر خدا کے لیے یہ بتلاؤ کہ اس اعراض و اغماض کا کیا مطلب تہا؟

آج کل جو کام تم نے شروع کیا ہے گو میرا راستہ اس سے الگ ہے مگر میں تو ہزار میں تیزگام ہوں، اگر ضرورت سمجھو۔ تو یہاں مجھ سے کافی اعانت مل سکتی ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

---

۹۳ میکلاؤڈ سٹریٹ کلکتہ

پیارے

برادرم! پتہ بدل گیا ہے۔ آیندہ سے مندرجہ صدر نشان پر خط لکھا کیجیے۔ پرچہ پچھلا کھولا تو آپ کا مضمون نظر پڑا۔ دمدار تارے کے اثر نحوست کا اقرار صالح اور نیز اس کے علاج سے اتفاق کلی لیکن ۹۳ کی قید پر اصرار کیجیے گا۔ تو مجھے مجبوراً الگ ہو جانا پڑے گا۔ یہ لیسر پسندی کے خلاف ہے۔ پھر صورت بھی تعجب کی تو "عم یتساءلون" کے عوام غیر کو نظر انداز کر دیا حالانکہ ایسے کاموں کے لیے تو سورۂ انا اعطینا۔ اور قل ہو اللہ سے بڑھ کر اور کوئی مفید نہیں بہتر یہی ہوگا کہ ۹۳ کے جزو دوم کو حذف کر دینے پر ہم آپ باہم سمجھوتہ کر لیں، اختلاف کو طول دینا مضر ہے۔ انصاف کیجیے۔ کہ اگر میں پانی دم کر کے گھر سے نکلوں کہ کلکتے کے تمام کونوں پر چھڑک دیا جائے۔ تو دو ماہ سے پہلے واپسی ممکن نہیں۔

خیر یہ تو لطیفہ تہا۔ جی چاہتا تہا کہ آپ سے کچھ ہنس بول لوں۔ اب یہ کہیے کہ جواب کیوں نہیں دیتے۔ دو خط لکھ چکا ہوں۔ اجمیر کا ارادہ قطعی کیجیے تو شاید میں بھی نکلوں، اگرچہ وقت نکلنا مشکل ہے، کیونکہ چاہتا ہوں۔ کہ پہلی۔ جب سے اخبار نکالدوں۔ مشورۃً بہت کچھ کہنا ہے۔ بشرطیکہ پچھلے مرسلات کا جواب مل جائے۔ کلکتہ کا مکرر عزم کیجیے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

۱۴۔ فورٹ اسٹریٹ بمبئی۔

پیارے

واحدی صاحب تسلیم! مضمون قصداً ناتمام بھیجا تھا۔ کہ بیماری اور سفر کی حالت میں

۴۹۶ ۲۳ میکلاوڈ سٹریٹ کلکتہ ۳ نومبر ۱۹۱۲ء

زادنا اللہ سبحانہ وایاکم حمیۃ الاسلام۔

خط پہنچا، یہ سچ ہے۔ مگر اس میں مصر و شام کی کیا خصوصیت ہے۔ سیاحت قلبی کے جغرافیہ کی کوئی حد نہیں۔

یہ تمام سوانح جو آپ نے لکھے ہیں پیشتر ہی سے پیش نظر تھے..... کو میں نے انکی افسردہ جوابی پر ۹ صفحے کا خط لکھا، جو اگر حس و غیرت مر نہیں گئی تو نشتر بن کر مدت العمر چبھتا رہیگا، تمام سر برآوردہ مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ ان خوش پوش غلاموں سے کوئی امید نہیں علی گڈھ کی تحریک نے مسلمانوں کو عضو شل بنا دیا ہے لیکن بہرحال فرصت قلیل اور وقت نازک ہے۔ فتحپوری میں جو مجلس ہوئی کافی نہیں۔ اسکی روئداد بھی متضاد خبروں کا مجموعہ، ایک صاحب حکیم جی کو صدر بتاتے ہیں۔ دوسرے صاحب سرے سے شرکت محض ہی سے سالت (?) ہیں۔ چندے کا طالب نہیں۔ لیکن صرف ایک اجتماع عام ہونا چاہیئے، باہم دعائے نصرت و فتح، اصلی مقصود اتحاد بین المسلمین اسلام کو بنیاد حقیقی...... واصل رشتہ ارتقاد و صلاح اسلام ہے اور اس کے لیئے اس موقعہ سے بہتر اور پھر کوئی وقت نہ ملے گا۔ آج کوئی وطنی یا مقامی تحریک مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ خواہ وہ یونیورسٹی کا افسانہ ہی کیوں نہ ہو۔ جب تک تمام دنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی و عالمگیر اتحادی تحریک نہیں ہوگی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چالیس کروڑ مسلمانوں کا کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟ بہرحال یہ داستان طویل ہے مقصود صرف یہ ہے کہ سر دست ایک جلسہ کا انتظام ہو سکے جو عام اور زیادہ تر عام آبادی پر مشتمل ہو، کچھ ضرور نہیں کہ دہلی کا کوئی سر برآوردہ یا خطاب یافتہ بھی اس میں شریک ہو۔ آپ بھی اس پر غور کیجئے اور جلد جواب دیجئے۔ آتے اتوار کو دوسرا جلسہ عام ہے اسکے بعد قطعی ارادہ سفر والاتمام من اللہ۔

دانا الفقیر المسکین ابو الکلام الدہلوی

بہت کم کر دے گی۔

سرمد کا ذکر تو یوں آگیا۔ کہ آپ خاموش بھی اور چاہتا تھا۔ کہ کوئی ذکر چھیڑ دوں کہ بات کا پہلو نکل آئے۔ قطعی وعدہ نہیں کرتا۔ پہلی رجب دیر ہی کتنی ہے ممکن ہے کہ ایکدن ہاتھ آجائے اور لکھ کر بھیجدوں۔ بمبئی پہنچا۔ تو کتب خانہ پر نظر ڈالی۔ حالات بھی زیادہ معلوم ہوئے ہیں کیا اب کے اجمیر کا ارادہ ہے؟ ضعیف سا ارادہ میرا بھی ہے۔ اگر آپ کا آنا قطعی طور پر معلوم ہو جائے۔ تو ممکن ہے ضعیف اپنی جگہ ارادہ مصمم کے حوالہ کرے، صاف صاف لکھو واحدی صاحب کو خدا جلد شفا دے، یہ دوسری بات ہے، مگر مجھ سے پوچھیے۔ تو آدمی کو ہمیشہ بیمار رہنا چاہیئے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

۱۹۵۱ء

ہمدردانہ کہتا ہوں۔ کہ یہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ کہ لوگوں کو مخالف بننے دیا مصلحت اندیشی اور حزم و احتیاط کا راستہ دوسرا ہے۔ کام خاکساری اور فروتنی سے کرنا چاہیئے کہ دشمنوں کو خاکسار بنانے کی گنجائش نظر نہ آئے اب آپکی مخالفت زور شور سے کی جائیگی کلکتہ اس دنیا سے الگ ہے مگر یہاں بھی مخالفانہ خیالات سخت درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ایک بہت بڑا مضمون لکھا جا رہا ہے۔ مجھ سے کہا گیا میں نے کہا کہ مجھے ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس آگ کو دبا دیا جائے اگر آپ پسند کریں تو میں تفصیلی مشورہ دے سکتا ہوں۔ (ابوالکلام آزاد دہلوی)

عکس دستخط جناب مولانا ابوالکلام صاحب دہلوی

۱۳ میکلوڈ اسٹریٹ کلکتہ

محبی

خیر اندیشا نہ! علالت و عدیم الفرصتی نے بہت دنوں تک خود حاضر ہو کے [illegible] نامہ بر کے [illegible]

کل رات کو پونے گیارہ بجے کے ڈاک [illegible] سے روانہ ہوگا [illegible]

۱۹۲

مکرمی! کل ہی لکھنؤ آیا۔ اور آج والا نامہ پہنچا، تعمیل ارشاد بسر و چشم لیکن حضرات صوفیہ کے متعلق میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ یہ لوگ چشم باطن سے نظر آتے ہیں اور یہ آنکھیں یہاں کہاں، عرس میں میں بھی ارادہ شرکت کر رہا ہوں۔ انگریزی کس تاریخ کو ہے، لیکن آؤں گا، تو صرف دن کی حاضری ہوگی، شب کو دلی میں رہوں گا۔ کیونکہ ہجوم میں مجھ کو نیند نہیں آ سکتی۔

ہاں حضرت اس کے کیا معنی کہ البشیر کے لیے آپ حلقہ صوفیہ سے خریدار بہم پہنچائیں اور ایک مذہبی اور علمی پرچہ الندوہ اس توجہ سے محروم۔

شبلی ۲۳ مئی سنہ ۱۹۰۶ء

۱۹۳

قسمت تو دیکھنا۔ کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند

ایک ہفتہ سے بیمار ہوں، بظاہر عرس شریف کے موقعہ پر حاضری کی امید نہیں۔

شبلی ۵ جون سنہ ۱۹۰۶ء

---

۱۹۴ ندوہ۔ لکھنؤ

آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ علی گڈھ میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپ صرف دو تین دن دہلی رہ سکتے ہیں پھر میسور چلے جائیں گے میں نے بخار کی حالت میں اتنی مدت کے لئے تکلیف اٹھانا بیکار سمجھا۔ خیر اب بہلی والوں کی سیر تک الیس آپنے لگایا نہیں۔

شبلی

۲۲۔ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء

۱۹۰۶ء ازمیرٹھ دفتر اخبار توحید ۱۶۔ مئی ۱۹۱۳ء

مولنا۔ السّلام علیکم،

(۱) آپ کرامات اولیاء اللہ کے قائل ہیں؟

(۲) کیا آپ نے کوئی کرامت حضرت خواجہ اجمیری رضؓ کی دیکھی ہے۔

(۳) کیا آپ اجمیری خواجہ رضؓ صاحب کی درگاہ اور عرس کو کسی حیثیت سے آج کل مفید سمجھتے ہیں۔ جواب دوسطری اور جلدی ہونا چاہیئے۔

حسن نظامی

وعلیکم السلام۔

(۱) قائل ہوں (۲) اس کا اتفاق نہیں ہوا۔

(۳) ایک اتنا بڑا مذہبی اجتماع کیوں نہ مفید ہو۔ البتہ ضرور ہے کہ اصلاح کی جائے۔ نیز ضرور ہے کہ تبدیلیاں ہوں۔

فقیر ابو الکلام

علامہ شبلی کے خطوط

۱۹۰۶ء آپ ہم کو عجیب ، برزخ کبریٰ ہاتھ آئے ہیں۔ جسکے ذریعہ سے مقدس آستانوں تک رسائی ہوتی ہے۔ وہ مبارک تحریریں بڑی خشوع سے جلسہ میں پیش کی گئیں شکریہ ان بزرگوں کی خدمت میں الگ الگ مرسل ہوگا۔

جلسہ خیر و خوبی سے ختم ہوا۔ آپ بہت یاد آئے۔ سرمایہ مستقل کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ اور دس بارہ ہزار کا چندہ ہوا۔ ہزار روپیہ آپ کے حقیر خادم نے بھی نذر کیا۔

والسلام

شبلی

۱۷۔ اپریل ۱۹۰۶ء

۸۷ — اعظم گڈھ

تسلیم، خدا کا شکر ہے کہ پیشکش قبول ہوئی۔ مدت کے بعد گھر آیا ہوں بندہ زادہ اتفاق سے یہیں پیشکاری پر ہے۔ بہو کو بھی بلوایا ہے۔ چند روز بال بچوں میں رہنے کو جی چاہتا ہے۔

افسوس کہ شرکت عرس کی امید نہیں ابھی گرمی میں سفر کا تحمل نہیں، برسات کے آغاز میں بمبئی اور حیدرآباد کا ارادہ ہے۔ شاہ سلیمان صاحب اور شاید آزاد بھی ہوں آپ بھی کیوں اس پرلطف صحبت میں شریک نہ ہوں۔ آزاد دارالسلطنت میں پھنس کر نکل گئے، اب وکیل نے ڈورے ڈالے ہیں، غریب نازک گردن کس کس سے بچ سکتی ہے حضرت امیر خسرو پر کچھ لکھا تھا۔ وہ بھیجئے تو الندوہ میں دیدوں کبھی ہمارے کام بھی آئیے یا ہمیشہ رقیبوں ہی کی قسمت میں رہیئے گا۔

شبلی۔ ۱۵ رمئی ۱۹۰۷ء

---

۸۸ — تسلیم، دلی کیونکر آتا۔ حکیم صاحب نے اطلاع تک نہ دی۔ حمایت الاسلام کا قصد تھا۔ طاعون کی خبر سے رک گیا۔

جی چاہتا ہے کہ چند روز امن و سکونت سے بسر کروں اگر خدا چاہے۔

شبلی ۲۷۔ مارچ ۱۹۰۷ء

---

۸۹ — ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ — دفتر ندوہ — لکھنؤ

بخدمت مکرمی جناب مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب زاد مجدکم

گرامی نامہ آیا۔ حالات معلوم ہوئے۔ مولوی عبدالحی صاحب اس زمانہ میں مبتلائے آلام و مصائب ہیں۔ ان کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ وہ خود علیل ہیں اسلئے وہ

۸۹ مخدومی

علالت کی خبر سے افسوس ہوا لیکن آپکے بخار کی طرح افسوس بھی عارضی ہے۔ آپ جلد اچھے ہوں گے اور ہم لوگوں کی دعائیں بیکار نہ جائیں گی۔

آپ کا مسودہ مانگنا میرے فخر کا باعث ہے۔ لیکن میں دو مہینے سے باہر ہوں یاد نہیں کہاں رکھا ہے۔ کل لکھنؤ جاتا ہوں، ڈھونڈ کر ارسال کروں گا۔ ہاں یاد آیا مسودہ غالباً مطبع میں ہوگا۔

اسے لیجئے پھر بھولا مطبع میں ہیضہ گیا ہے۔ غرض بعد تلاش ارسال کروں گا۔ میں دلی دو گھنٹہ کے لئے اسٹیشن پر ٹھیرا تھا۔ آپ کی بیماری کا حال معلوم ہوتا تو دیکھتا آتا۔ جلدی یہ تھی کہ میری بھتیجی کا عقد تھا۔

شبلی ۱۳ر ستمبر ۱۹۰۶ء

۹۰

السلام علیکم، کارڈ پہنچا۔ خدا آپ کو صحت عاجل دے۔

مسودہ کے حاضر کرنے میں ذرا بھی میری طرف سے بے اعتنائی ہو۔ تو میں کافر کیا کروں تین چار برس کی تصنیف، حیدرآباد کا زیادہ قیام معلوم نہیں کن کاغذات میں رل مل گئے۔ مطلق پتہ نہیں لگتا ورنہ یہ تو میرے لئے فخر تھا۔ آپکی استدعا کی بات نہ تھی۔

کسی کو لکھیے یا نہ لکھیے لیکن مجھے تو دو کلمہ خیریت ضرور لکھ دیا کیجے۔ امید ہے کہ خود حاضر ہو کر آستان بوسی کروں گا، والتسلیم

شبلی

۱۷ر نومبر ۱۹۰۶ء لکھنؤ

سائل صاحب آپکے نہیں بلکہ میرے ہیں میں نے دانستہ ان کو تکلیف نہیں دی بہرحال ان کو آج ہی لکھتا ہوں۔

آزاد دو ہفتہ سے چپ ہیں۔

شبلی

نظام المشائخ کا ذکر آپنے کارڈ میں کیا لیکن ایک کاپی بھی میری اکبر نجت آئی ۔ اب تک انتظار ہے۔
ان کی اب وہ کیسی ہیں کیا وہاں آوں۔ کیا آپ کچھ فیض دینگے یا دلائینگے۔
شبلی ۱۱ اگست ۱۹۰۹ء

عکس دستخط شمس العلما مولانا شبلی نعمانی مرحوم

مخدومی

کل یا پرسوں روانہ ہونگا۔ بشرطیکہ آزاد جو کلکتہ سے یہاں پہنچیں گے بمبئی گھسیٹ نہ لے جائیں۔ امید تو ہے کہ آپ کی کشش غالب رہے۔
شبلی ۱۶ ستمبر ۱۹۰۹ء

مخدومی ۲۵ اکتوبر ۱۹۰۹ء

برہان پور ٹھہرتا ہوا بمبئی پہنچا۔ لیکن بمبئی بے آپکے بے لطف تھی۔
حلقہ کے مقاصد ضروری بلکہ ضروری تر ہیں۔ کہاں تک کامیابی ہوگی۔ یہ آپکی محنت و نکتہ سنجی اور زمانہ شناسی پر منحصر ہے۔ شبلی۔ پالن جی ہوٹل۔ بھائی کھلا بمبئی

جواب خط دینے سے معذور رہے۔ اب وہ لکھنؤ سے آ گئے ہیں مگر ابھی ضعف باقی ہے۔

وفد کی کارروائی ابھی کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی گئی ہے۔ اس وقت سب سے مقدم جلسہ سنگ بنیاد کی کارروائی ہے آپکی شرکت تو ضروری اور یقینی ہے۔ لیکن آپ کی ذات سے صرف اسی قدر توقع نہیں۔ بلکہ یہ بھی امید ہے آپکے اثر سے آپکے بہت سے احباب شریک ہوسکیں گے اور اور بھی جلسہ کے متعلق آپکی وجہ سے کامیابیاں ہونگی۔ ابوالکلام آزاد بھی آئینگے مولانا حالی مع نظم تشریف لائینگے نواب وقار الملک بہادر اور علی گڑھ اور اودھ کے تمام تعلقدار اور رؤسا شریک ہونگے۔ بہرحال جلسہ کے ابتدائی آثار اچھے نظر آتے ہیں۔ آئندہ کامیابی خدا کے ہاتھ ہے۔ والسلام

شبلی ۲۵ر اکتوبر ۱۹۰۸ء

۱۹۰۸ء مکرمی۔ آپ کی کوششوں کا کیا کہنا۔ آئیے۔ انشاءاللہ ہر طرح کا انتظام ہوگا۔ قیام خوراک، خاطرداری وغیرہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

اکثر معزز حضرات آرہے ہیں قیام اگر چاہئے گا تو دارالعلوم میں۔ ورنہ مقام تعمیر میں خیمہ اور چھولداریوں کا انتظام کیا گیا ہے جو پسند ہو۔

لفٹننٹ گورنر بہادر نے الہ آباد میں سالانہ جلسہ یونیورسٹی میں جو اسپیچ دی اس میں ندوہ کا خاص تذکرہ کیا۔

شبلی ۱۷ر نومبر ۱۹۰۸ء

۱۹۰۸ء ۲۰ر نومبر ۱۹۰۸ء

مکرمی۔ کیا عرض کروں جن لوگوں کے ہاتھ میں انتظامی کام ہے ایسے خود پرست اور اناڑی ہیں۔ ابتک کچھ نہ کر سکے۔ مشائخین کو ہمیں دارالعلوم میں شاید ٹھیرانا بہتر ہوگا۔ خیر اس وقت تک فیصلہ ہو جائے گا۔

سے بھی مناسب سمجھا گیا۔ بعد صحت اس کے متعلق تفصیل سے لکھونگا۔ شبلی

۱۳۳ء ؎ ۔۔۔ ۳۰۔اکتوبر ۱۹۱۳ء

تسلیم۔ اگر آپ جیسے قدردانوں اور نکتہ سنجوں کا دل میری نظموں سے بھر گیا تو عام لوگوں کے لیئے بھی تو اجیرن ہو گیا ہو گا۔ اس لیے بہتر ہو گا۔ کہ میں یہ سلسلہ بند کر دوں۔ ع ازاں پیش بیں کن کہ گویند بس

میں بمبئی سے تبدیل ذائقہ کے لیے حیدرآباد چلا آیا، کچھ دنوں غالباً رہنا ہو، آپ حیدرآباد کیوں نہ آئیں۔ آپ کے لئے تو ہر جگہ آنکھیں بچھی ہیں۔ یہاں سیرت کے متعلق بھی کچھ کچھ نیا مواد مل گیا ہے ع

دانہ مے چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

شبلی

۱۳۴ء ؎ ۔۔۔ ۱۶۔ نومبر ۱۹۱۳ء

تسلیم میں نے گو دریافت نہیں کیا (اب کرونگا) لیکن قیاساً کہتا ہوں کہ آپ شجرہ ممنوعہ میں نہ ہوں گے۔ یہاں سے عنقریب روانہ ہوتا ہوں۔ سردست لکھنؤ۔ الہ آباد۔ پھر وہی بمبئی۔ اب تو ارادہ ہے بمبئی میں مستقل مکان لے لوں۔ اور ملے تو مکین بھی۔

عشق در ایام پیری چوں بسرا آتش است

آپ کیا فتوے دیتے ہیں۔ اس شریعت کے امام تو آپ ہی لوگ ہیں۔

شبلی۔ حیدرآباد

۱۳-مارچ سنہ ۱۹۱۰ء

مکرمی، میں اب تک چشم براہ رہا۔ میں نے لکھ دیا تھا۔ کہ کل سے پہنا دو ہو جائے گا۔ اس لیئے مبارک بود فال فرخ زدن۔ آج ہی ہونا چاہیئے میں حاضر ہوں جب چاہیے آئیے۔ آزاد ۸ بجے کی گاڑی میں آئینگے۔ (شبلی)

۱۹-مارچ سنہ ۱۹۱۰ء

محبوب المجبوب عربک سکول میں جا کر راجہ تصدق حسین سے معلوم ہوا۔ (وصاحب البیت ادری بما فیہ) کہ ۱۱ بجے کوئی ٹرین نہیں جاتی اسلیئے واپس آیا۔ ۵ بجے شام کو جاؤنگا۔ اگر قصد ہو تو ۵ بجے آجائیے، یہ کیا بات ہو کہ میں ایرانی المذاق نہیں۔ اور ہوتا بھی تو آپ میں کوئی ایرانی جوہر نہیں، تاہم آپ سے سیری نہیں ہوتی۔ دل میں آپ وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔
شبلی

۲۹-مارچ سنہ ۱۹۱۳ء

اب کے آپ جلسہ (ندوہ) میں تشریف نہ لائے۔ تو عمر بھر کے لیے یاری کٹ، ایسے موقعے قسمت سے ہاتھ آتے ہیں ضرور تشریف لائیے۔ شبلی لکھنؤ

۱۸-اپریل سنہ ۱۹۱۳ء

جناب مکرم السلام علیکم

۱۴ روز سے بعارضہ بیچش صاحب فراش ہوں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مسلم گزٹ کے مضامین کے متعلق کچھ لکھنا میرے استفسار پر محول رکھا۔ یہ واقعہ میرے ذاتی اختیار سے نہیں ہوا، بلکہ تمام معتمدین اور کثرت ارکان کے مشورہ

از کیمبرج ٹرینٹی کالج ۱۸- اکتوبر ۱۹۰۵ء

اسرار قدیم سید حسن نظامی

ایک خط اس سے پہلے ارسال کر چکا ہوں۔ امید کہ پہنچ کر ملاحظہ عالی سے گذرا ہوگا۔

اس خط کے جواب کا انتظار ہے اور بڑی شدت کے ساتھ۔ اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں اور وجہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں ان کا پتہ دیجئے سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھئے اس بارہ میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔

قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت میں میرا یہی خط بھیج دیجئے اور بعد التماس دعا عرض کیجئے کہ میرے لئے یہ زحمت گوارا کریں۔ اور مہربانی کر کے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیویں۔

اگر قاری صاحب موصوف کو یہ بات ثابت کرنا ہو۔ کہ مسئلہ وحدۃ الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے۔ تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں۔ اور انکی کیا تفسیر کرتے ہیں؟

کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے کیا حضرت علی مرتضیٰ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرضکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس امر کے متعلق موجود ہے۔ مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں۔ مگر جواب جلد آئے۔ باقی خیریت ہے

اقبال

ڈاکٹر اقبال صاحب کے خطوط

مکرمی سید صاحب زاد عمرہ

دو دفعہ پیسہ اخبار میں۔ میں نے وہ خبر پڑھی جسے پڑھ کر لاہور کے تمام دوستوں کو بے انتہا تشویش تھی۔ مگر قدرت خدا کی مجھے مطلق رنج نہ محسوس ہوا۔ اور اسی بنا پر جس دوست نے مجھ سے پوچھا میں نے بے تکلف کہہ دیا کہ خبر غلط ہے۔ الحمد للہ کہ ایسا ہی ثابت ہوا۔ اور میں لاہور کے احباب میں مفت کا صوفی مشہور ہو گیا۔ ایسی خبریں درازیٔ عمر کی علامت ہیں۔ میری نسبت ہی لاہور میں اس قسم کی خبریں مشہور ہو گئی تھیں والسلام

اس خبر سے کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا۔ کہ ملک کو آپ کی کس قدر ضرورت ہے۔ انشاء اللہ میں بھی تعطیلوں میں اگر ممکن ہوا۔ تو آپ سے نہ ملی ملوں گا۔

میں کچھ دنوں کے لئے لاہور سے باہر تھا۔ اس واسطے آپ کے کارڈ کا جواب نہ لکھ سکا۔

راقم آپ کا مفتوں

اقبال ازلاہور۔ ۲۲۔ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء

عکس دستخط جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر پی ایچ۔ ڈی لاہور

[illegible]

لندن ۱۰- فروری ۱۹۰۸ء

پیارے نظامی آپ کا خط اور "رام ورکرشن" دونوں چیزیں پہنچیں، خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ مجھے کبھی کبھی یاد فرمالیا کرتے ہیں۔ افسوس کہ جرمنی کے پتہ پر جو خط آپ نے لکھا وہ نہ پہنچا۔ بمبئی سے آپ کا ایک خط آیا تھا۔ اس کا جواب اسی پتہ پر لکھا تھا معلوم نہیں پہنچا یا نہیں پہنچا "رام ورکرشن" نہایت عمدہ ہے۔ جو طریق اشاعت مذہب حقہ کا آپ نے اختیار کیا ہے۔ مجھے اس سے پوری ہمدردی ہے مسٹر آرنلڈ صاحب بہادر سے آج اس کا ذکر آیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور آپ کی کتاب مجھ سے لی۔ کہتے تھے۔ کہ میں نے ہندوستان میں بہت کوشش کی کہ سلسلہ نظامیہ نے جو کوشش اشاعت اسلام میں کی ہو۔ اسکی تاریخی شہادت ملے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اگر آپکے خاندان میں اس مضمون پر کوئی کتاب محفوظ چلی آتی ہو۔ تو آگاہ کیجئے۔ اس کے علاوہ انکی یہ خواہش ہے۔ کہ ایک کاپی اس کتاب کی ملے جو آپکے کسی دوست نے "کلکی پران" کے متعلق لکھی ہو۔ اور جس کا ذکر آپ نے اس چھوٹی سی کتاب میں کیا ہے مسٹر آرنلڈ کا یہ خیال ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے کے لیے کبھی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی، اور اب وقت ہے، کہ ایسا کیا جائے۔ اس میں ہندوستان کیا ساری دنیا کا بھلا ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ راستی پر ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ دیکھنے کو دو، حقیقت میں ایک، انگلستان میں میں نے اسلامی مذہب اور تہذیب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے۔ دوسرا "اسلامی التصوف" پر فروری کے تیسرے ہفتہ میں ہوگا۔ باقی لیکچروں کے معانی یہ ہونگے "مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر" "اسلامی جمہوریت" "اسلام اور عقل انسانی" وغیرہ وغیرہ

مخدومی

پر اسرار نظامی، کارڈ ابھی ملا۔ اس سے پہلے آپ کا نوازش نامہ نہیں ملا ورنہ یہ ممکن نہ تھا۔ کہ آپ کا خط آئے۔ اور میں جواب نہ دوں۔

الاحسان کے دو نمبر بھی کل موصول ہوئے، خوب اور بہت خوب، کس قدر تغیر ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ اس مضمون پر بات کرنا خلاف اصول طریقت تھا اب یہ زمانہ ہے کہ ماہوار رسالے شائع ہوتے ہیں۔ اسکی ضرورت ہے اور سخت ضرورت ہے لیکن کیوں صاحب آپ مجھے رسوا کر کے اب مشہور کرنے لگے۔ ؎

اب مری شہرت کی سوجھی ہے انہیں دیکھو کوئی
مٹ گئے ہیں جس دم عبار کوٹے رسوائی ہوں

اقبال از لاہور

۲۵۔ اپریل ۱۹۰۶ء

سر مست سیاح کو سلام، متھرا، ہردوار۔ جگن ناتھ۔ امر ناتھ جی سب کی سیر کی، مبارک ہو۔ مگر بنارس میں جاکر لیلام ہو گئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ بلکہ ہمارے میر صاحب نیرنگ اور اکرام کو بھی ساتھ لے ڈوبے۔

میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بت خانہ ہے کہ ہر بت اس صنمکدے کا رشک صنعت آذری ہے اس پرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے خدا کی قسم بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ، میں تو ہر قدم پر آپ کو یاد آتا تھا کیوں نہ یاد آؤں۔ آپ بھی ہم کو یہاں عموماً یاد آیا کرتے ہیں والسلام۔

آپ کا
محمد اقبال

آپ اپنی ہر تحریک میں بغیر پوچھے مجھے شریک تصور کیجئے۔ مگر جس درد نے کئی مہینوں سے مجھے بیتاب کر رکھا ہے۔ جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ جو مجھے تنہائی میں رلاتا ہے۔ اسکی وجہ مجھ سے پہلے سن لیجئے پھر جو چاہے کیجئے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اور آپ میرے ساتھ،

کئی دنوں سے بیمار ہوں۔ دعا کیجئے کہ بالکل اچھا ہو جاؤں،

آپ کا صادق

محمد اقبال

لاہور ۲۵ر نومبر ۱۹۰۸ء

مخدومی خواجہ صاحب،

آپ کے حلقے کا ذکر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی مجھے بھی اس حلقہ میں شامل تصور کیجئے! اور اہل حلقہ سے استدعا کیجئے کہ میرے حق میں دعا کریں۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری امر میں مشورہ کرنا ہے اور اس میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے، افسوس ہے کہ تاحال فارغ البالی سے بیٹھنے کا موقعہ نہ ہوا۔ ورنہ عرض کرتا۔ بہرحال آپ ایک نئی بات سننے کے لیے تیار رہیں۔ میرے خیال میں اور احباب بھی ہیں جن سے ابھی تک ذکر اس امر کا نہیں آیا۔ تاہم وہ اس امر میں یقین ہے ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اگر ممکن ہوتا تو میں ابھی آپ کو دہلی سے لاہور تشریف لانے کی تکلیف دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ناوانستہ اسی طرف کو جا رہے ہیں۔ جس طرف میں آپ کو لانا چاہتا ہوں اس بات نے مجھے جرأت دلائی ہے۔ کہ میں آپ سے رہنے سہنے کا دکھ ظاہر کروں۔ بہت کم لوگ ہیں جو ہمدردی کے ساتھ اس قضیئے کو سن سکتے ہیں۔ مگر آپ سے مجھے پوری ہمدردی کی توقع ہے۔ ابھی تک کسی دوست سے اس بات کا ذکر نہیں آیا۔ آپ سے ذکر ہو چکنے کے

دوستوں کی خدمت میں آداب کہئے۔ اور میرے لئے درگاہ شریف پر دعا کیجئے۔

آپ کا اقبال

پیارے نظامی! آپ کا کارڈ پہنچا۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ کئی دنوں کی بیماری کے بعد کل بستر بیماری سے اٹھا ہوں مفصل خط پھر لکھوں گا۔ بلکہ کچھ عرصے کے بعد آپ کو لاہور آنے کی تکلیف دونگا۔ آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں بعض لوگ آپ پر اخباروں میں حملے کرتے ہیں۔ افسوس ہے مسلمانوں میں معمولی اخلاق بھی نہیں رہے۔ میں خود علی گڑھ کالج کی پروفیسری نامنظور کرنے سے ہدف ملامت ہو رہا ہوں۔ مگر

شادم ز طعن خلق کہ مرغان باغ عشق
شاخے کہ سنگ می رسدش آشیاں کنند

اقبال

سیالکوٹ۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء

پیارے نظامی۔ آپ کا خط پہنچا۔ پوسٹ کارڈوں کے لیے شکر گذار ہوں میں نے وی پی کے لئے لکھا تھا۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ یہ نیاز جو آپ کو پہنچی ہے والدہ مکرمہ کی نیاز تھی۔ قبول فرمائیے۔ بھائی صاحب کا ارادہ خود حاضر ہونے کا تھا مگر شاید انھیں فرصت نہ تھی۔

آپ لوگوں کو میرا اشتیاق بتاتے ہیں مجھے کچھ اعتراض نہیں مگر اندیشہ ہے کہ مجھ سے مل کر انہیں مایوسی نہ ہو۔ میں نے سید صاحب موصوف کے نام ایک عریضہ ابھی لکھا ہے۔ ان کا خط اس خط میں ملفوف کرتا ہوں۔

لاہور ۲۴۔ جون ۱۹۱۲ء

مکرمی۔ ۱۲۔ روپیہ جس طرح آپکے خیال میں آئے خرچ کر دیجیے۔ حلوا پکوا دیجئے۔ یا خانقاہ کے متعلقین میں تقسیم کر دیجیے،

آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہو مگر کیا کروں علائق نہیں چھوڑتے روٹی کا دھندا لاہور سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ کیا کروں عجب طرح کا قفس ہو! والسلام

آپکا مخلص اقبال

مکرمی، السلام علیکم،

خدا آپ کا بھلا کرے کہ آپنے ہندوستان کے پرانے بتکدے میں توحید کی مشعل روشن کی۔ مجھے یقین ہو کہ دل اس کی حدت سے گرمائینگے اور آنکھیں اس کے نور سے منور ہونگی۔ میں بھی اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ حاضر کرونگا،

مسلمانان ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب جو آپنے اس ہفتہ کے توحید میں ارقام فرمائے ہیں۔ بالکل بجا ہیں لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال جس نے اسلامی قومیت حقیقت کا راز اسوقت منکشف کیا۔ جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے۔ اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار کامریڈ، بلقان، طرابلس اور نواب فارالملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہو۔ کس کا خوشہ چین ہے؟ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ ان کا کلام برا بھلا جو کچھ بھی ہو غیر محسوس ہوتا ہے۔ اور ظاہر بیں آنکھیں مرئیات کی طرف قدرتاً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔

اس خط کا مقصد شکایت نہیں اور نہ یہ کہ اقبال کے کلام کا اشتہار ہو۔ حسن نظامی کو خوب معلوم ہے کہ اس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر دنیا میں نہیں آیا۔ مگر یہ مقصد اس خط کا ضرور ہے کہ ایک واقف حال دوست کی غلط فہمی دور ہو

بعد اگر مناسب ہوا۔ تو بعض خاص دوستوں سے اس کا تذکرہ کرونگا۔ زیادہ کیا عرض کروں
تاحال خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ امید ہے آپ بھی بخیریت ہونگے،

محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا لاہور

مخدومی و مکرم جناب خواجہ صاحب، السلام علیکم۔

حلقہ نظام المشائخ کے متعلق آج مسٹر محمد شفیع بیرسٹر ایٹ لا سے سن کر بڑی خوشی ہوئی خدا کرے آپ کے کام میں ترقی ہو۔ مجھ کو بھی اپنے حلقہ مشائخ کے ادنے ملازمین میں تصور کیجئے،

مجھے ذرا کاروبار کی طرف سے اطمینان ہو لے تو پھر عملی طور سے اسمیں دلچسپی لینے کو حاضر ہوں۔ آپ نے اچھا کیا۔ کہ محمد شفیع صاحب کے نام خط لکھا، میری طرف سے مزار شریف پر بھی حاضر ہو کر عرض کیجئے۔ والسلام

محمد اقبال ۱۴۔ جنوری ۱۹۰۹ء

لاہور، ۲۔ اگست ۱۹۰۹ء

مخدومی۔ رسالہ پہنچ گیا تھا۔ آپ کی دست بستہ دعا نے بڑا لطف دیا۔ میں فراموش کار نہیں۔ البتہ اگر آپ کو یہ لقب دیا جائے تو موزوں تر ہے۔

کچھ دنوں سے بہت عدیم الفرصت ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ قانونی پیشہ میں اس قدر مصروفیت رہے گی،

پنجاب میں نظامی مشہور ہوں۔ اور آپ میری خبر نہیں لیتے۔

سیہ کار

محمد اقبال

ادا کرتا ہوں۔ لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے اب قریباً تیار ہے۔ اور پریس جانے کو ہے۔ اس کے لئے بھی کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمائیے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام۔ اسرار حیات، پیام سروش، پیام نو، آئین نو، تجویز کئے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے۔ اور نتائج سے مجھے مطلع کیجئے۔ تاکہ میں انتخاب کر سکوں۔

آپ کا خادم دیرینہ اقبال لاہور

۷ر فروری ۱۹۱۵ء

نواب محسن الملک کے خطوط

جناب مخدوم و مکرم بندہ خواجہ حسن نظامی صاحب۔

عنایت نامہ پہنچا آپ کی تشریف آوری کے ارادہ نے مجھے نہایت خوش اور مطمئن کیا جن مشائخ اور پیرزادوں کے نام آپ نے لکھے ان کے نام خطوط روانہ کر دیئے۔ مگر آپ بھی ان کو اپنی طرف سے آنے کے لئے لکھیں۔

جو حضرات تشریف لائیں گے، ان کے کھانے کا انتظام کالج کی طرف سے ہوگا اور فیس کچھ نہ لی جائے گی۔ کرایہ ریل کے خرچ کا کالج متحمل نہ ہوگا۔ الا چار پانچ آدمی ایسے ہونگے جنکو آپ خرچ دینا ضروری خیال کرینگے۔ ان کو میں اپنے پاس سے کرایہ ریل بھی دے دونگا۔

جو حضرات تشریف لائیں ان کے ناموں سے جس قدر جلد ممکن ہو اطلاع دیجئے۔ مشائخوں کے آنے سے کالج کو بڑی عزت ہوگی اور آپ کا بہت بڑا احسان کالج پر ہوگا۔ کہ آپ ان کو یہاں لائے۔

سجاد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملکہ سمجھتے ہو ۔ ۔ نک اگر کرایہ میں خرچ ہونگے تو میں دوں گا کیونکہ

تاکہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو۔ کہ اس
نے مسلمانان ہند کی بیداری میں حصہ نہیں لیا۔

بکلام بیدل اگر رسی مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو صلۂ دگر مگر آفریں

خاکسار اقبال

لاہور ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۳ء

خواجہ صاحب مکرم، اجمیر سے کوئی خط نہیں لکھا اس بارے میں شاید آپ کی
ہدایت پر عمل نہ ہو۔ زلف خواجہ کا اسیر، دام اقبال میں کیونکر آسکتا ہے۔ شیخ احسان الحق
سے درخواست کیجئے کہ وہ اقبال کا اشتہار نہ دیں۔ میں ان کا اور آپ کا ممنون ہونگا
اگر آپ مجھے اس زحمت سے بچائیں گے۔ آخر شاعری کی وجہ سے میں مشاہیر میں
شامل ہونگا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے، کہ میں اپنے آپکو شاعر تصور نہیں کرتا۔ اور نہ کبھی
بحیثیت فن کے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ پھر میرا کیا حق ہے کہ صف شعراء میں
میں بیٹھوں۔ اور کوئی وجہ شہرت نہیں ہے۔

دردانہ بیچاری موتیوں کا ہار دے سکتی ہے۔ مگر گردن دینے کی وہ بساط
نہیں رکھتی۔

بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ "دردانہ" دے سکتی ہے۔ اگر یہ صورت ہے۔ تو
گردن کہاں باقی رہ جائے گی۔ وہ تو دردانہ کی ایک جزو ہے۔ والسلام

محمد اقبال لاہور

ڈیر خواجہ صاحب، آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے اسکا شکریہ

مرزا غلام احمد قادیانی کا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ خاتم النبیین وصحبہ وآلہ وجمیع عباد اللہ الصالحین اما بعد۔ شعبان المبارک ۱۳۲۳ میں مجھے جب دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے ان صلحاء اور اولیاء الرحمن کے مزاروں کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ جو خاک دہلی میں سوئے ہوئے ہیں کیونکہ جب مجھے دہلی والوں سے محبت اور انس محسوس ہوئی تو میرے دل نے اس بات کے لئے جوش مارا کہ وہ اہل صدق و صفا اور عاشقان حضرت مولیٰ جو میری طرح اس زمین کے باشندوں سے بہت سا جور و جفا دیکھ کر اپنے محبوب حقیقی کو جا ملے۔ ان کے متبرک مزاروں کی زیارت سے اپنے دل کو خوش کر لوں۔ پس میں اسی نسبت سے حضرت خواجہ شیخ نظام الدین ولی اللہ رضی اللہ عنہ کے مزار متبرک پر گیا۔ اور ایسا ہی دوسرے چند مشائخ کے متبرک مزاروں پر بھی خدا ہم سب کو اپنی رحمت سے معمور کرے۔ آمین

الفقیر المسیح الموعود عبد اللہ الصمد [illegible]

نقل دستخط جناب مرزا غلام احمد قادیانی

حکیم نور الدین قادیانی کا مکتوب

جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی درگاہ شریف میں حاضر ہوئے۔ تو میرے حجرے میں بھی تشریف لائے تھے۔ یہ خط اسی کی یادگار میں میں نے لکھوایا تھا تاکہ ان کے مرید بھی کی حاضری مزار دہلی پر یاد رکھیں۔ اور حکیم نور الدین صاحب کے

درحقیقت بعض حضرات اپنے پاس سے کرایہ خرچ کر کے آنے میں تامل کرینگے بمشہور
اور نامور مشائخوں اور پیرزادوں کو کرایہ دینا ضرور ہے۔ مگر ایک سو روپیہ سے زیادہ
دینا مشکل ہے۔ سو روپیہ تک کرایہ آنے جانے کا میں دیدوں گا ،

(محسن الملک)

۱۹۰۷ء علی گڑھ ۱۶ر جنوری

جناب مخدوم مکرم بندہ حسن نظامی صاحب۔

اخباروں میں یہ خبر دیکھ کر کہ اب آپ کی طبیعت روبہ صحت ہے۔ نہایت خوشی ہوئی
آپ کا دم غنیمت ہے۔ اور آپ ایک ایسے روشن خیال مشائخ ہیں جنکی قوم کو
ضرورت ہے۔ خدا آپ کو صحت بخشے۔ اور امت مرحومہ پر رحم کرے۔ امیر صاحب کی
تشریف آوری کے موقعہ پر آپ کا تشریف لانا نہایت مفید ہوگا۔ اور آپ اطلاع دیجئے
کہ اور کن کن عالموں اور مشائخوں کو اس موقعہ پر دعوت دی جائے۔ آپ براہ مہربانی
ان کے نام لکھ کر بھیجدیتجیے۔ اور نیز آپ اُن کو یہاں آنے پر آمادہ کیجئے جتنے مقدس
اور بزرگ لوگ اس موقعہ پر آئیں گے اس سے قوم کو اور کالج کو بڑا فائدہ ہوگا۔
پرنس آف ویلز کی تشریف آوری کے وقت جو دعا نامہ آپ نے بھیجا تھا۔ اس کا
بہت اثر ہوا تھا۔ یہ موقعہ ایسا ہے کہ آپ کو خاص اس پر توجہ کرنا لازم ہے ،

عکس دستخط نواب محسن الملک بہادر

اگر این مشت خاک۔ ان ابرار و اخیار کے ساتھ ہم آواز نہ ہو۔ تو حسب الارشاد و
من تبتع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا
مجھ سے زیادہ کون بدقسمت ہو سکتا ہو۔ میرا دلی یقین یہ ہے کہ وہ محبوب الٰہی جسنے کیہ
شہدا اللہ واقعی محبوب الٰہی تھے یہ ہی میرا دلی اعتقاد ہو۔ عام لوگوں کی اجنبیت انشاء اللہ
میرے نزدیک بجوئے نمی آرزو کا رنگ رکھتی ہو۔

کاش آنان کہ عیب من گفـــــتند
روئے اے دلستاں بدیدندے

اب دوسرے ارشاد اور اسکی اہمیت پر گذارش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم
میں فرماتا ہے۔ انا لننصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیوٰۃ الدنیا۔ اور فرماتا ہے۔
وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنفقین ہو۔

مولنا اگر ہم فی الواقع جناب الٰہی کی نظر میں مومن ہیں۔ تو ہم یقیناً یقیناً معزز منصور
ہیں۔ ہمیں کفار کے یہ جلسہ قطعاً ہیش سنج وہ نہیں۔ اور نہ ہم ان کے نظاروں کو [illegible]
کر سکتے ہیں۔ جناب کو معلوم ہوگا۔ حضرت فرید الحق والدین جب حضرت قطب الدین رحمۃ اللہ
کے جانشین ہوئے تو ہفتہ کے اندر اندر قرب دہلی سے دوری اختیار فرمائی تو کیا آپ
لیے اجودھن کا جنگل منظر ہوا۔ لا واللہ۔

از جناب شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب

جناب سید حسن نظامی صاحب نے اپنے جد امجد سلطان نظام الدین علیہ الرحمۃ
کے کشف و کرامات و خرق عادات و محاسن اخلاق میں کسی بات کو فروگذاشت نکیا ہوگا۔
کہ جسکی تحریر کا فخر میں حاصل کروں۔ مگر ہاں میں حضرت کی سب سے بڑی کرامت یہ بیان
کرتا ہوں کہ ان کو اپنے ساتھ انسانوں کے گرویدہ کر لینے کا ایسا ملکہ خداداد تھا۔ کہ اپنی

یہ خط بزمانہ اپنی خلافت قادیان سے لکھا۔ حسن نظامی

عکس دستخط جناب مولوی نورالدین صاحب خلیفہ اول میرزا صاحب قادیانی

نورالدین قادیان ضلع گورداسپور پنجاب

مکرم معظم جناب مولنا — السلام علیکم ۔۔۔۔ مارچ ۱۹۰۹

مکرمت نامہ پہنچا۔ اس پر عرض ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح بخاری کو میں اور ہماری جماعت اصح الکتب یقین کرتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ ایک بار سرور عالم فخر بنی آدم خاتم الرسل النبیین۔ سید الاولین والآخرین کے حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) حضرات صحابہ کرام شرف اندوز تھے۔ اور ایک جنازہ گزرا۔ اور اس مطہر رمزی جماعت نے اسکی تعریف کی۔ عربی عبارت میں ہے اثنوا علیہ خیراً فقال وجبت۔ پھر ایک اور جنازہ گزرا تو اسکی مذمت ہوئی۔ پھر ارشاد ہوا۔ وجبت۔ وجبت کے معنی ہیں کہ اسکے لیے واجب ہو چکی۔ حضرات صحابہ کرام نے عرض کیا۔ ما وجبت یا رسول اللہ کیا واجب ہوا۔ فرمایا اما الذی اثنیتم علیہ خیراً فوجبت لہ الجنة واما الذی اثنیتم علیہ شراً فوجبت لہ النار، انتم شھداء اللہ فی الارض اور جسکی تم نے تعریف کی ہے اسکے لیے جنت واجب ہوئی۔ اور جسکی تم نے مذمت کی اسکے لیے دوزخ واجب ہوئی۔

اب جو میں قرآن کریم کو پڑھتا ہوں۔ تو اسمیں ارشاد ہے ولذالک جعلناکم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس تو اس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ وہ حقیقت ہر زمانہ کے اخیار میں طاری و ساری ہے۔ اور ہمیشہ اسکے مطابق ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی معیار پر میں نے حضرت نظام الحق والدین سلطان الدنیا والعقبیٰ کو دیکھا۔ تو سات سو برس کے قریب ہوتا ہے کہ ہزاروں ہزار اخیار آپ کے مدائح میں رطب اللسان ہیں

شاید اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے لئے یہ خدمت تجویز فرمائی ہے۔ زمانہ و مخزن نے ریویو لکھے۔ مگر پولٹیکل خیال سے۔ اگرچہ میں کیا۔ اور میرے شعر کیا لیکن آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ اور آپ خود قابلیت اور سخن گوئی اور سخن فہمی میں ممتاز ہیں۔ لہٰذا کچھ تعجب نہیں۔ کہ آپ میرے اشعار کی قدر افزائی فرمائیں۔

ان روزوں میں سخت پریشان رہتا ہوں۔ دنیا سے بالکل دل برداشتہ ہو گیا ہے۔ دل آپ نے لکھا ہے کہ "جواب آئے تو شاید سکون" جواب تو حاضر ہے لیکن میں نہیں جانتا۔ کہ آپ کے دل کو سکون ہو۔ دل مضطرب ہی اچھا۔ آپ میرے ساتھ اس حالت میں ہمدردی کر سکیں گے۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا۔

دعا ہے کہ اللہ آپ کو اطمینان نصیب کرے اور آپ خوش رہیں بیشک اسوقت حالت بہت نازک ہو رہی ہو۔ اپنا حال لکھتے رہیے۔ میرا حال اس مطلع سے ظاہر ہے شاید آپ سن چکے ہیں۔ نو تصنیف ہے۔

جب یہ دیکھا۔ کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

پرسوں شب کو چند اشعار ذہن میں آئے لکھ تو لیے لیکن ہنوز نہ کہیں بھیجے نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

خیال آیا کہ آپ کو لکھ بھیجوں پرائیویٹ اطلاع کے لئے یہ بھی نہیں جانتا کہ کیسے شعر ہیں۔ کیونکہ منتشر الحواس ہوں"

ہاں تو ہے اور کا دستِ ہوپالی کا	لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہو کوفت لیکن امیر مسرور ہو رہے ہیں	ہر سو خیال رہے ہیں اور چند ہو رہے ہیں
اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو	اس باغ میں خزاں کی اک بہار دیکھو
لکھتا ہے کلک حسرت مسلم کی سب ٹری ہیں	اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں (اکبر)

حیات میں بے حساب آدمیوں کو اپنا مرید و معتقد بنایا۔ اور بعد وفات جبکہ چھ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ وہی کرامت ان کے مزار میں موجود ہے کہ وہ مسلمانوں ہی کے دلوں کو گرویدہ نہیں بناتا۔ بلکہ غیر مسلمانوں کے دلوں کو اپنا شیفتہ و والہ کرتا ہے۔ چنانچہ مسٹر کلارک صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی جب مزار شریف پر تشریف لائے تو ان کے دل پر مزار شریف کا یہ اثر ہوا۔ کہ اس کی چھت کو شکستہ و فرسودہ کہنہ دیکھ کر انہوں نے اپنی گرہ سے تین ہزار روپیہ خرچ کر کے ایسا ہی بنوا دیا جیسا کہ پہلے بنا ہوا تھا۔ اور خادموں کو منع کر دیا۔ کہ وہ ہمارا نام نہ لیں کہ ہم نے اسکو بنوا دیا ہے۔

جب سے انگریزی عملداری ہندوستان میں آئی۔ کوئی مثال ایسی نہیں کہ کسی حاکم انگریز نے کسی ولی اللہ کے مزار کی مرمت اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے کرائی ہو۔ یہ حضرت سلطان جی ہی کی کرامت یادگار روزگار رہے گی۔ کہ انہوں نے عیسائی حاکم سے اپنے مزار مقدس کی مرمت کرائی ہو۔

منشی ذکاء اللہ خان بہادر صاحب مرحوم

چند اور خطوط

یہ مجموعہ لکھا جا چکا تھا۔ کہ جناب مولوی نیاز محمد خان صاحب نیاز ساکن فتحپور ہسوہ نے ازراہ مہربانی چند خطوط عنایت فرمائے۔ جنکو دلی ممنونیت کیساتھ آخر میں شریک کیا جاتا ہے۔

(حسن نظامی)

الہ آباد۔ ۲۶۔ نومبر ۱۹۱۳ء

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالی اکثر صاحبوں نے ارادے ظاہر کئے۔

اور آپ کی شکایتوں سے رفع کسل سفر نہں مدد لی۔ کل کلکتہ روانہ ہونگا۔ اور ان شاء اللہ وہاں سے تفصیلی خط لکھوں گا۔ احتیاطاً آپ کی کتاب کی نسبت آج ہی دفتر لکھدیا ہے۔ ابوالکلام

کلکتہ۔ ۱۲۔ جولائی

صدیقی العزیز

والا نامہ پہنچا۔ میں نے ایک اطلاعی خط لکھنؤ آیا تھا۔ اور خود خطر رکھ لیا تھا۔ کہ جواب لکھوں گا۔ مجھے جو کچھ اس بارے میں کرنا تھا۔ کر دیا ہے۔ اور منتظر جواب ہوں۔

یہ فتح پور میں ندوہ کے متعلق جلسہ کن لوگوں نے کیا تھا؟

خط کے جواب وغیرہ میں۔ مجھ سے جو قصور ہو جایا کرتا ہے۔ اسکی بناء پر میرے دل کی نسبت کوئی رائے قائم نہ کیجئے۔ میں ہر حال میں ہر طرح کی خدمت کے لئے مستعد ہوں۔ اور علی الخصوص آپ کی تو اپنے دل میں جگہ رکھتا ہوں۔ ابوالکلام

کلکتہ

صدیقی الاعزہ خط پہنچا ..... صاحب کا تو یہ حال ہے۔

کل نیز گہے باسن وگہ باوگری ودا شت

لیکن اس سے مطمئن رہیے کہ طے شدہ امور میں بے ثباتی و تزلزل ممکن نہیں

آپ روزانہ اثبات وجود کرتے ہیں۔

..... صاحب ذاتی اور شخصی تعلقات میں اس درجہ محکم و استوار ہیں۔ کہ موجودہ عہد میں شاید بمشکل اسکی نظیر ملے۔ میں مطمئن ہوں۔ اور آپ بھی مطمئن رہیں۔

غالباً میں نومبر کی ۱۵ تک دہلی آؤں۔ اگر اس وقت تک نقل و حرکت کے لئے آزاد ہوا

ابوالکلام

الہ آباد ۵ مئی ۱۹۱۴ء

عزیزی و محبی سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کہاں ہیں۔ کیسے ہیں۔ کیا شغل ہے۔ آپ کی خیریت اڈیٹر صاحب سادات سے میں نے دریافت کی تھی۔ انہوں نے پتا بتایا۔ میں اپنا حال کیا لکھوں

ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر
قید ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

(خاکسار اکبر)

۲۴۔ جون ۱۹۱۶ء

صدیقی الاعزّ۔ سخت نادم ہوں کہ اتنے عرصہ کے بعد جواب لکھتا ہوں۔ آپ کا خط پڑھ کر معلّق رکھدیا تھا۔ کہ ضروری خطوں کے ساتھ جواب لکھونگا۔ ہفتہ میں ایک بات ہی کام ہوتا ہے۔ لیکن غلطی سے وہ وہیں رہ گیا۔ اور میں سمجھا کہ جواب لکھ چکا ہوں آج کاغذات دیکھے تو بجنسہ موجود تھا سخت شرمندگی ہوئی۔ خواستگار معافی ہوں۔

نظم انشراح الہلال ہوگی۔

ایک دوسرے امر کے لئے آپ نے لکھا ہے مجھے بہمہ وجوہ اور بہر حال میں مستعد خدمت یقین کیجئے۔ اگر کوئی سعی مفید مقصد نکلے۔ تو اسے بہترین عبادت سمجھوں لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ بہ تفصیل لکھیں۔

میری طرف سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی۔ تاخیر کے لئے سخت نادم ہوں۔

فقیر ابوالکلام

۱۸۔ اگست سنہ

اسکی لاج مسوری

صدیقی العزیز۔ آپ کے متواتر خطوط پہنچتے رہے ہیں اس تمام عرصہ میں بہت زیادہ گرفتار تفکر و تردد رہا۔ اخبارات سے معلوم ہوا ہوگا۔ کہ میں لکھنؤ میں تھا آج صبح واپس آیا۔

تیسری اشاعت

الحمد للہ۔ اتالیق خطوط نویسی کی دوسری اشاعت ختم ہوئی اور تیسری مرتبہ طبع ہونے کا موقع آیا۔

اب بی حور بانو وہ بچہ نہیں رہیں جیسی اس کتاب کی پہلی اور دوسری اشاعت کے وقت تھیں۔ خدا رکھے شادی ہوگئی گھربار کی ہوئیں مگر انکی یہ یادگار بچپن کو یاد دلاتی رہیگی۔

اتالیق خطوط نویسی حصہ سوئم کا اعلان ہوا تھا مگر ابتک تیسرا حصہ مرتب کرنیکی فرصت نہ مل سکی۔ حالانکہ خطوط تیسرے اور چوتھے حصہ کیلئے مدت سے جمع رکھے ہیں اور کچھ تازہ جمع ہوگئے ہیں۔

اسکے زنانہ خطوط کا ایک معقول ذخیرہ فراہم ہوا ہے جو عنقریب شائع ہوگا۔ نیز ہندو اور انگریز عورتوں کے خطوط بھی درج کئے جائیں گے تاکہ انکا طرز انشاء معلوم ہو۔

خدا کرے مجھ کو توفیق و فرصت ملے اور تیسرا چوتھا حصہ چھاپنے کا وقت جلدی آئے۔

۱۷ مئی ۱۹۲۰ء

حسن نظامی